لکھنؤ کی شاعری

تصنیف

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمسؔ

ناشر

نور ہدایت فاؤنڈیشن
حسینیۂ حضرت غفران مآبؒ، مولانا کلب حسین روڈ، چوک،
لکھنؤ-۲۲۶۰۰۳ (یو۔پی)۔انڈیا

Noor-e-Hidayat Foundation

Imambara Ghufranmaab, Maulana Kalbe Husain Road,

Chowk, Lucknow-3 INDIA

Website: www.noorehidayatfoundation.org

www.naqeeblucknow.com

E-mail: noorehidayat@gmail.com, noorehidayat@yahoo.com

Ph:0522-2252230Mob :08736009814,09335996808

لکھنؤ کی شاعری

اُس کا اسلوب اُس کے اصناف اور منتخب کلام

محمد باقر شمس

مقدمہ

ڈاکٹر احسن فاروقی

سلسلہ دار التصنیف رجسٹرڈ کی گیارھویں کتاب

لکھنؤ کی شاعری

اس کا اسلوب، اس کے اصناف اور منتخب کلام

محمد باقر شمس

مقدمہ

ڈاکٹر احسن فاروقی

مطبوعہ

باب الاسلام پریس

ملنے کا پتہ

دار التصنیف: ۳۰-سی رضویہ کالونی کراچی نمبر ۱۸

ہمارے مطبوعات

ہمارا ادارہ صرف مولانا محمد باقر شمس کی تصنیفیں شائع کرتا ہے اور اس وقت تک جتنی کتابیں شائع ہوئیں سب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئیں۔

ناظرین ہماری کتابوں کی فہرست طلب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر کتاب میں دوسری کتابوں کی فہرست ہونا چاہیے مگر یہاں اسٹاک میں کتابیں ہی نہیں ہوتیں تو فہرست سے فائدہ کیا اس وقت ہمارے پاس صرف دو کتابیں موجود ہیں۔

(۱) شعور و شاعری

اس میں مشہور شعراء کے کلام کی فنی غلطیاں بتا کے ان کی اصلاح کی گئی ہے۔ قیمت چھ روپے

(۲) لکھنؤ کی تہذیب

اس میں لکھنؤ کی تہذیب کی ایک ایک چیز کو تفصیل سے بیان کیا ہے جو لکھنؤ کی تہذیب کا دلکش مرقع ہے اس پر تبصرہ میں جناب رئیس امروہوی نے لکھا ہے کہ میں نے اب تک ایسی کتاب نہیں دیکھی: قیمت بارہ روپے۔

ملنے کا پتہ

دار التصنیف ۳۰-سی رضویہ سوسائٹی کراچی نمبر ۱۸

انتساب

ذوق سلیم کا مظہر شرافت انسانی کا جوہر تہذیب شائستگی کا پیکر

ادب نواز۔ ادیب ساز۔ انشا پرداز

پروفیسر مسعود حسن ادیب

کے نام

ذرہ ناچیز

شمس

مقدمہ

لکھنؤ کا مدرسہ شاعری

ڈاکٹر احسن فاروقی

ڈین آف فیکلٹی آف آرٹ بلوچستان یونیورسٹی

جناب شمس کی زیر نظر کتاب اس وقت کا ایک اہم تقاضا پورا کر رہی ہے لکھنؤ کے مدرسہ شاعری کو حالی اور شبلی نے یورپ کی رومانی تحریک کے مبہم اثر سے کافی حد تک گرایا بلکہ بات یہاں تک پہنچی کہ دہلی کی شاعری کو صحیح شاعری مانا جانے لگا اور لکھنؤ کی شاعری کو غیر شاعری یا بناوٹی کہا جانے لگا یہ میتھیو آرنلڈ کی تنقید کا اثر تھا جو انیسویں صدی کے آخر تک اہم رہی مگر پہلی عالمی جنگ کے بعد سے ٹی ایس ایلیٹ کی شاعری اور تنقید کو عروج ہوا اور اس کا خاص نتیجہ یہ نکلا کہ رومانی شاعری کے ذوق کو غیر پختہ ذوق کہا جانے لگا اور خاصی اہمیت کلاسیکی شاعری کو دی گئی جیسے رومانیوں نے انگلستان میں ورڈسورتھ کی شاعری کو اہمیت دی تھی اور پوپ کی شاعری کی بابت یہ رائے دی تھی کہ یہ شاعری ہی نہیں ہے۔ یہ رائے دی دیسی ہی ہمارے یہاں دہلی کے مدرسہ شاعری کو اصل شاعری مانا گیا اور لکھنؤ کی شاعری کو اصول شاعری سے الگ ہٹا ہوا کہا گیا۔ ٹی ایس۔ ایلیٹ نے پانسا پلٹ دیا اور پوپ کو سب سے زیادہ نمائندہ شاعر مانا اور تمام رومانی شاعروں کو بالکل رد کر دیا۔ معاملہ اب بھی زیر بحث ہے مگر اس کلیہ سے یہ ضرور سامنے آتا ہے کہ کلاسیکی شاعری کو بھی رومانی شاعری کے برابر اہمیت دینا چاہیئے ہمارے یہاں دہلی

اور لکھنؤ کے مدارس سے بالکل الگ نہیں ہوئے کیونکہ دہلی کے مدرسہ کی خصوصیات لکھنؤ کے اہم شاعر آتش میں اور لکھنؤ کے مدرسہ کی خصوصیات دہلی کے اہم شاعر ذوق میں نظر آتی ہیں مگر رومانی شاعری کی طرفداری میں یہ حد ہو گئی کہ شبلی کا موازنۂ انیس و دبیر وجود میں آیا جس سے میر انیس کے ایسے دہلوی اسکول والے شاعروں کو شاعر اور مرزا دبیر ایسے لکھنؤ کی اسکول والے شاعروں کو غیر شاعر کہنے کی رسم پڑ گئی جناب شمس کی کتاب اسی غلط رسم کے خلاف ایک جید اور عالمانہ قدم ہے۔

رومانی اور کلاسیکی شاعری کا اہم فرق یہ بتایا جاتا ہے کہ اول الذکر داخلی ہوتی ہے اور آخر الذکر خارجی رنگ کو اہمیت دیتی ہے اس معنی میں لکھنؤ کی شاعری کلاسیکل ہے اور اس کے سب سے اہم نمائندہ شیخ ناسخ ہیں۔ کلاسیکی شاعری کی تمام خصوصیات ان کے یہاں بدرجہ اتم نظر آتی ہیں پھر ان کے اثر سے لکھنؤ میں ایک گروہ شاعروں کا پیدا ہوا اور ہوتا رہا انکی بابت شمس صاحب نے مفصل طور پر لکھا ہے اور ضرورت بھر اہم مثالیں دی ہیں۔ خارجیت کے ساتھ ان شاعروں میں طرز اور ترنم کی وہ خوبیاں بھی ہیں جن کو انفرادی طرز کے خلاف سماجی طرز کا لازمی حصہ قرار دیا جاتا ہے اور جن کی وجہ سے شاعری محض ذاتی چیز نہیں رہ جاتی بلکہ ایک معاشرہ کی جذباتی زندگی کی آئینہ دار ہو جاتی ہے۔ زبان اور بیان کے وہ اسالیب سامنے آتے ہیں جو فرد کی زندگی کے بجائے ایک پورے معاشرہ کی زندگی کے لئے اہم ہیں۔ یہ شاعری بھی جذباتی اور مبہم نہیں رہ جاتی بلکہ واضح بیانی اور عروضی اصولوں کی صاف صاف پابندی نظر آتی ہے۔ ٹی ایس۔ ایلیٹ اپنی تنقیدوں میں ٹکنیک کا لفظ خاص طور پر استعمال کرتا ہے اور

لکھنؤ کی شاعری خاص طور پر اہم ٹکنیکی جدتوں سے معمور ہے اور ان کی کمال کے ساتھ وضاحت شمس صاحب نے زیر نظر کتاب میں کر دی ہے۔

ایک نئی بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ لکھنؤ رومانی طرز کا بھی اسکول ہے جس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بھی اہم ٹکنیکی جدتوں سے معمور ہے لہذا یہ کہنا کہ لکھنؤ کی شاعری رومانی نہیں غلط ہے اس کو انہوں نے دلیلوں اور مثالوں سے ثابت کیا ہے۔

یورپ کے ہر ملک میں جدیدیت کی تحریک کا اہم رجحان یہ ہے کہ وہ رومانی طرز کو چھوڑ کر کلاسیکی طرز کی طرف آتی ہے۔ ہمارے یہاں جدیدیت کی تحریک تو شروع ہو گئی ہے مگر ہمارے شاعروں کو یہ نہیں معلوم ہے کہ اس سلسلہ میں اپنی روایت سے تعلق کس طرح پیدا کریں اور اس لئے جدید شاعری بے بنیاد ہی رہی جا رہی ہے شمس صاحب کی زیر نظر کتاب کی جدید دور میں سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ اس اہم راہ کے نشانات واضح طور پر بتاتی ہے جن پر چل کر جدید شعراء اپنا مقصد مستحکم طریقہ پر حاصل کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ کتاب عام صاحبان ذوق کے لئے بصیرت افروز ہے اور ذوق ادب کے اسی توازن کو برقرار رکھنے کے سلسلہ میں اہم قدم ہے جو حالی اور شبلی نے اپنی کم علمی کی وجہ سے اور جدت کے غلط جوش میں بگاڑ دیا تھا۔ اس طرح یہ کتاب دو اہم باتوں میں تمام تنقیدوں سے زیادہ کارآمد ثابت ہو گی اول یہ کہ اس کے ذریعہ ہماری اردو روایت میں جدید ترین راہوں کا پتہ لگے گا اور شاعروں کو صحیح راہ پر چلنے کی توفیق ہو گی دوسرے یہ کہ تمام قاری کے سامنے سے طرفداری کا دھواں چھٹ کر وہ صاف

تضاد دکھائی دیگی جو جدید ترین شاعری کی اہم بنیاد ہو سکتی ہے اور جو متوازن ذوق ادب کی ضمانت ہے۔

اس میں بہت سی نئی باتیں بھی ہیں جو ابتک کسی کے علم میں نہ تھیں مثلاً اہلِ لکھنؤ کی مادری زبان لکھنؤ کی ادبی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان اور ٹکسالی زبان کے معنی وغیرہ۔

مولانا کی یہ بڑی خصوصیت کہ ان کے مطالب اور تخیل، ترتیب دلنشیں تحریر شگفتہ زبان مستند اور معیاری ہوتی ہے وہ ایک منفرد مفکر اور صاحب طرز انشاپرداز ہیں علمی و ادبی حیثیت سے ان سے استفادہ کرنے والوں میں اپنا شمار کرکے فخر محسوس کرتا ہوں۔

احسن فاروقی

۳ رجنوری ۱۹۷۸ء

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	لکھنؤ کی شاعری کا عام تصور	۱۷	۱۹	ذوالفقار خاں	۴۱
۲	غزل زندہ صنفِ سخن ہے	۱۷	۲۰	فرخ سیر	۴۱
۳	غزل کی مقبولیت کے اسباب	۱۸	۲۱	رفیع الدرجات	۴۲
۴	غزل کا اصلی موضوع	۱۹	۲۲	شاہجہاں ثانی	۴۲
۵	غزل کی تشبیہیں اور استعارے	۲۰	۲۳	محمد شاہ	۴۳
۶	غزل پر اعتراض کا جواب	۲۲	۲۴	سلطنت اودھ کا قیام	۴۳
۷	دہلی اور لکھنؤ کی شاعری پر تبصرہ	۲۳	۲۵	دہلی پر پہلا حملہ	۴۳
۸	غزل اور تصوف	۲۷	۲۶	اہلِ دہلی کا زنانہ پن	۴۴
۹	لکھنؤ کی شاعری میں سادگی	۳۰	۲۷	اہلِ دہلی کی امرد پرستی	۴۴
۱۰	لکھنؤ کی شاعری میں تصنع	۳۳	۲۸	امرد پرستی کی تاریخ	۴۶
۱۱	تصنع کی اہمیت	۳۳	۲۹	صوفیت و امرد پرستی	۴۷
۱۲	محاسنِ شعریہ	۳۴	۳۰	ترکی ذوق	۴۸
۱۳	تمدن کی تعریف	۳۸	۳۱	دہلی کے مشہور امرد پرست	۴۹
۱۴	دہلی کا تمدن	۴۰	۳۲	دہلی کے مشہور امرد	۵۰
۱۵	اردو شاعری کی ابتدا	۴۰	۳۳	ملاد و پیازہ کی فرہنگ	۵۵
۱۶	اورنگ زیب	۴۰	۳۴	دہلی پر دوسرا حملہ	۵۷
۱۷	بہادر شاہ اول	۴۰	۳۵	دہلی پر تیسرا حملہ	۵۷
۱۸	جہاندار شاہ	۴۰	۳۶	محمد شاہ کا انتقال	۵۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۷	احمد شاہ کی تخت نشینی	۵۷	۵۷	گل زمین ایران	۷۳
۳۸	صفدر جنگ کی وزارت	۵۷	۵۸	اہل ایران کی نفاست پسندی	۷۳
۳۹	غازی الدین خاں	۵۸	۵۹	ایران کے تمدن میں گل کی اہمیت	۷۴
۴۰	عالمگیر ثانی	۵۸	۶۰	گل کے لاحقے	۷۵
۴۱	دہلی پر چوتھا حملہ	۵۸	۶۱		
۴۲	دہلی پر پانچواں حملہ	۵۹	۶۲	گل کے سابقے	۷۶
۴۳	شاہ عالم	۵۹	۶۳	گل کے اورے	۷۶
۴۴	بکسر کی جنگ	۵۹	۶۴	رنگ اور ایران	۷۶
۴۵	نجف خان	۶۰	۶۵	اہل ایران کی ایجادیں	۷۷
۴۶	دہلی پر چھٹا حملہ	۶۱	۶۶	ایران کے تمدن میں انقلاب	۷۸
۴۷	دہلی پر ساتواں حملہ	۶۱	۶۷	ہندوستان کا قدیم تمدن	۷۸
۴۸	سندھیا	۶۳	۶۸	بابر اور ہمایوں کا مذہب	۷۸
۴۹	دہلی پر آٹھواں حملہ	۶۴	۶۹	لکھنؤ کا تمدن	۷۹
۵۰	دہلی پر نواں حملہ	۶۶	۷۰	برہان الملک	۷۹
۵۱	دہلی کی تباہی کی داستان	۶۶	۷۱	اہل ایران کی لکھنؤ کی آمد	۷۹
۵۲	غدر کے بعد کی دہلی	۶۷	۷۲	لکھنؤ میں شیعیت کی ابتدا	۷۹
۵۳	دہلی کی اخلاقی تباہی	۶۷	۷۳	صفدر جنگ	۸۰
۵۴	لکھنؤ کے تمدن کا پس منظر	۷۲	۷۴	صفدر جنگ کی شجاعت	۸۰
۵۵	ایران کا تمدن	۷۲	۷۵	صفدر جنگ کی شان و شوکت	۸۰
۵۶	ہمارا سفر ایران	۷۳	۷۶	نادر شاہ کے سپاہی صفدر جنگ کی فوج میں	۸۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۷۷	شام اودھ	۸۱	۹۷	سعادت علیخاں کا انتقال	۸۹
۷۸	صفدر جنگ کا انتقال	۸۱	۹۸	غازی الدین حیدر کی مسند نشینی	۸۹
۷۹	صفدر جنگ کی قوت برداشت	۸۱	۹۹	غازی الدین حیدر کی شاہی	۸۹
۸۰	شجاع الدولہ کی مسند نشینی	۸۱	۱۰۰	ٹائپ کے حرفوں کا چھاپہ خانہ	۸۹
۸۱	فیض آباد کی عزاداری		۱۰۱	غازی الدین حیدر کی ایجادیں	۸۹
۸۲	شیعوں کی سپہری زیدی	۸۳	۱۰۲	آداب نشست و برخاست	۹۰
۸۳	شجاع الدولہ کا علم	۸۳	۱۰۳	فن سپہ گری کی ترقی	۹۰
۸۴	آصف الدولہ	۸۴	۱۰۴	غازی الدین حیدر کا انتقال	۹۰
۸۵	آصف الدولہ کی عزاداری	۸۴	۱۰۵	نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی	۹۰
۸۶	پہلے شیعہ مجتہد	۸۴	۱۰۶	نصیر الدین کی عورتوں سے دلچسپی	۹۱
۸۷	صوفیت کے خلاف غفرانمآب کی کوشش	۸۵	۱۰۷	نصیر الدین حیدر کا مفاد عام	۹۱
۸۸	آصف الدولہ کا انتقال	۸۵	۱۰۸	نصیر الدین کا خوشبو سے شوق	۹۱
۸۹	سعادت علی خاں کی مسند نشینی	۸۵	۱۰۹	نصیر الدین حیدر اور علم نجوم	۹۱
۹۰	سعادت علی خاں کی نفاست	۸۶	۱۱۰	رسد خانہ سلطانی	۹۱
۹۱	سعادت علی خاں کی پاکیزگی ذوق	۸۶	۱۱۱	لیتھو کا چھاپہ خانہ	۹۱
۹۲	سعادت علیخاں کی انشا پردازی	۸۷	۱۱۲	چھینکتے ناک کٹنے کا محاورہ	۹۱
۹۳	سعادت علیخاں کے زمانہ میں ضائع	۸۸	۱۱۳	سپہ گری کی ترقی	۹۲
۹۴	سعادت علی خاں نے چہلم قائم کیا	۸۸	۱۱۴	عام لوگوں کا ہتھیار بند ہونا	۹۲
۹۵	میر سید علی کی سوز خوانی	۸۸	۱۱۵	پہلی محرم سے نویں ربیع الاول تک تعزیہ داری	۹۲
۹۶	لکھنؤ میں نئے طرز کا شہر	۸۸	۱۱۶	میر ضمیر کی تحت اللفظ مرثیہ خوانی	۹۲

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۱۷	لکھنؤ میں لباس کا شوق	۹۲	۱۳۷	اشاریت	۱۰۶
۱۱۸	لکھنؤ میں عطر کا شوق	۹۲	۱۳۸	ایہام	۱۰۶
۱۱۹	لکھنؤ میں ادب و تعظیم کا لحاظ	۹۲	۱۳۹	حیات و کائنات کے مسائل	۱۰۷
۱۲۰	اہل لکھنؤ کے خصوصیات	۹۲	۱۴۰	سادگی	۱۰۷
۱۲۱	ناسخ کی شاعرانہ حیثیت	۹۳	۱۴۱	تمثیل	۱۰۷
				فلسفہ تصوف۔ تغزل	۱۰۸
۱۲۲	مصحفی نے ناسخ کی تقلید کی	۹۳	۱۴۲	ناسخ کی پیروی میں غالب کے	۱۰۹
۱۲۳	غالب نے ناسخ کی تقلید کی	۹۳	۱۴۳	متن کے اشعار پرانی ناہموار روش	۱۱۰
۱۲۴	غالب کا خط ناسخ کے نام	۹۴	۱۴۴	اردو شاعری کا ابتدائی دور	۱۱۱
۱۲۵	تمام ادباء کو ناسخ کے کمال کا اعتراف	۹۵	۱۴۵	اردو شاعری کا عہد زریں	۱۱۲
۱۲۶	دہلی و لکھنؤ کا فن شاعری	۹۷	۱۴۶	میر و سودا کے مہمل لغو ردیف	۱۱۶
۱۲۷	زبان میں ناسخ کی انقلابی حیثیت	۹۸	۱۴۷	تذکیر و تانیث کا ستھرا پن نہ تھا	۱۱۷
۱۲۸	لکھنؤ کی مادری زبان	۹۸	۱۴۸	روزمرہ کے صرف کا سلیقہ نہ تھا	۱۱۷
۱۲۹	لکھنؤ کی دو ہمسائیوں کی گفتگو	۹۸	۱۴۹	سودا اور ضاحک کی ہجو	۱۱۸
۱۳۰	لکھنؤ کی ادبی زبان	۱۰۱	۱۵۰	مصحفی و انشا کا دور	۱۱۹
۱۳۱	لکھنؤ کی ٹکسالی زبان	۱۰۱	۱۵۱	مصحفی و انشا کے ردیف و قافیے	۱۱۹
۱۳۲	ٹکسالی زبان کے معنی	۱۰۱	۱۵۲	مصحفی و انشا کے بیہودہ اشعار	۱۱۹
۱۳۳	شاعری میں ناسخ کی انقلابی حیثیت	۱۰۲	۱۵۳	کلام ناسخ	۱۲۲
۱۳۴	ناسخ کے کلام کی شاعرانہ خوبیاں	۱۰۲	۱۵۴	لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا اسلوب	۱۲۵
۱۳۵	صنعتوں کا حسن استعمال	۱۰۵	۱۵۵	ذہنی شاعری	۱۲۶
۱۳۶	محذوفات سے ندرت	۱۰۶	۱۵۶	قلبی شاعری	۱۲۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۵۷	لکھنؤ کی اصلی شاعری	۱۲۶	۱۷۷	تعشق	۱۷۹
۱۵۸	ناسخ کی تحریک	۱۲۶	۱۷۸	جلال	۱۸۳
۱۵۹	لکھنؤ کی شاعری کے ادوار	۱۲۷	۱۷۹	کامل	۱۸۸
۱۶۰	لکھنؤ شاعری کا پہلا دور		۱۸۰	منیر	۱۹۳
۱۶۱	ناسخ کا کلام		۱۸۱	لکھنؤ کی شاعری کا تیسرا رنگ	۱۹۷
۱۶۲	خواجہ وزیر	۱۳۱	۱۸۲	مہدی حسین ماہر	۲۰۳
۱۶۳	محمد رضا برق	۱۳۵	۱۸۳	منشی امیر احمد مینائی	۲۰۹
۱۶۴	میر علی اوسط رشک	۱۳۹	۱۸۴	لکھنؤ کی شاعری کا تیسرا دور	۲۱۱
۱۶۵	امداد علی بحر	۱۴۳	۱۸۵	مولانا علی حیدر نظم طباطبائی	۲۱۱
۱۶۶	امانت علی سحر	۱۴۷	۱۸۶	مرزا محمد ہادی رسوا	۲۱۳
۱۶۷	آتش اور ان کے تلامذہ	۱۴۹	۱۸۷	پیارے صاحب رشید	۲۱۷
۱۶۸	آتش	۱۴۹	۱۸۸	بندہ کاظم جاوید	۲۲۰
۱۶۹	نواب سید محمد خاں رند	۱۵۳	۱۸۹	ریاض خیرآبادی	۲۲۹
۱۷۰	میر وزیر علی صبا	۱۵۷	۱۹۰	نوبت رائے نظر	۲۳۲
۱۷۱	میر دوست علی خلیل	۱۶۲	۱۹۱	جلیل حسن جلیل	۲۳۵
۱۷۲	آغا حجو شرف	۱۶۶	۱۹۲	لکھنؤ کی شاعری کا چوتھا دور	۲۳۸
۱۷۳	دیا شنکر نسیم	۱۶۷	۱۹۳	علی نقی صفی	۲۳۸
۱۷۴	آغا حسن امانت	۱۷۱	۱۹۴	مرزا محمد ہادی عزیز	۲۴۲
۱۷۵	مظفر علی اسیر	۱۷۴	۱۹۵	مرزا ذاکر حسین ثاقب	۲۴۲
۱۷۶	لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا دور	۱۷۸	۱۹۶	حسرت موہانی	۲۵۰

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۹۷	انور حسین آرزو	۲۵۴	۲۱۰	محمد ہادی عزیز	۲۸۲
۱۹۸	آرزو صاحب کی خالص اردو	۲۵۵	۲۱۱	نظم	۲۸۳
۱۹۹	برج نرائن چکبست	۲۵۷	۲۱۲	طلسم ہوشربا	۲۸۴
۲۰۰	لکھنؤ کی شاعری کا آخری دور	۲۵۹	۲۱۳	مزار دوست	۲۸۹
۲۰۱	مرزا جعفر علی خاں اثر	۲۵۹	۲۱۴	سیر دہرہ دون	۲۹۱
۲۰۲	کلب احمد مانی	۲۶۲	۲۱۵	صبح بنارس	۲۹۳
۲۰۳	لکھنؤ کی غزل کا ایک اور طرز (سلام)	۲۶۵	۲۱۶	لکھنؤ کی ایک برسات	۲۹۵
۲۰۴	رباعی	۲۷۰	۲۱۷	اسلامی ترانا	۲۹۵
۲۰۵	قصیدہ	۲۷۱	۲۱۸	برسات کی شام	۲۹۶
۲۰۶	قصیدہ منیر	۲۷۲	۲۱۹	فوارہ	۲۹۹
۲۰۷	نظم طباطبائی	۲۷۳	۲۲۰	ہجو	۳۰۱
۲۰۸	مولانا تصفی	۲۷۵	۲۲۱	البعیر	۳۰۲
۲۰۹	کاظم حسین محشر	۲۷۸			

معذرت

یہ کتاب جن حالات میں چھپی ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ اس میں جگہ جگہ کمی اور نقائص رہ جائیں۔

مولانا علی حیدر نظم طباطبائی اور نوبت رائے نظر کے اشعار بہت کم ہیں۔ ہمارے کئی دوستوں نے مہیا کرنے کا وعدہ کیا مگر وفا نہ ہوا اس کے علاوہ اغلاط کی تصحیح بھی صحیح معنوں میں نہ ہو سکی بہت باتیں کہنے کے قابل رہ گئیں اور یہ سب مجبوری سے ہوا انشاء اللہ آئندہ اڈیشن میں یہ تمام خامیاں دور ہو جائیں گی۔ فقط

والسلام

محمد باقر شمس

دیباچہ

یہ کتاب مدت سے ناتمام پڑی تھی اور میرے خیال میں چھپنے کے قابل نہ تھی کیونکہ ہر باب ناقص تھا۔ ایک دن مکرمی جناب ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب سے ذکر آیا انھوں نے کتاب دیکھنے کے لیے لے لی دوسرے دن فرمایا کہ لکھنؤ کی شاعری پر بحث مکمل ہے باقی فروعات ہیں جن کے بغیر کتاب ناقص نہیں کہی جا سکتی اس کو چھپ جانا چاہیے اس میں بہت سی نئی باتیں ہیں جو اب تک نہیں کہی گئیں، ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا اور اس کی اشاعت پر اصرار کیا میں نے کتاب پریس میں بھیجدی جن شعراء کا کلام نہ مل سکا اس کی کمی مجھے شدت سے محسوس ہو رہی ہے مثلاً سید مرزا انیس شاگرد ناسخ، میر علی محمد عارف مرزا کاظم حسین محشر فرزند حسین ذاخر مجاور حسین تمنا اولاد حسین شاعر مہدی حسین ناصری حکیم اشفتہ سراج منظر حکیم ناطق انند نرائن ملا ان سب کا کلام نہ مل سکا اور یہ بہت بڑی کمی ہے۔

ایک ناہمواری اس کتاب میں اور نظر آئے گی کہ شعراء میں کسی کے حالات سرے سے ہیں ہی نہیں کسی کا ذکر دو تین سطروں میں ہے اور کسی کا صفحوں میں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارا موضوع لکھنؤ کی شاعری ہے شعرائے لکھنؤ نہیں دوسرے معروف شعراء جن کا ذکر تذکروں میں تفصیل سے موجود ہے ان کا تعارف مختصر لفظوں میں ہے۔ جن کا حال تذکروں میں مختصر ہے یا بالکل نہیں ہے ان کے حالات جس حد تک معلوم ہوئے سب لکھ دیئے۔ ناسخ و آتش کے بارے میں بہت کچھ کہنا ہے جس کی اس میں گنجائش نہیں اس کو مستقل طور سے لکھنے کے لیے چھوڑ دیا۔

مرثیہ پر گفتگو بہت طولانی ہو گئی ہر عہد کے مرثیہ گویوں کا ذکر اور ان کے کلام سے مثالیں مستقل کتاب چاہتی ہے اس لیے اس کو آئندہ کے لیے اٹھا رکھا ہے اسی طرح مثنوی اور دلی سے ہجرت کا ذکر بھی رہ گیا۔ فقط

والسلام

ذرہ ناچیز

محمد باقر شمس

۲۸ جنوری سنہ ۱۹۷۸ء

مقدمہ

غزل اور اس کا موضوع

ہر صنف سخن کی کچھ لفظی و معنوی خصوصیتیں ہیں لکھنؤ کی شاعری میں بھی ہر صنف کی خصوصیتیں الگ الگ ہیں۔

لکھنؤ کی شاعری کی عام خصوصیت لیکن ایک عام بات جو تمام اصناف سخن میں مشترک ہے وہ زبان کی شستگی روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی کہیں صنائع و بدائع کہیں سادگی کہیں دونوں کا حسین امتزاج طرز ادا میں کہیں جدت مگر ہر صورت میں دل میں اتر جانے والی معنوی وضاحت ؎

جو سمجھ ہی میں نہ آئے وہ کہا جاتا نہیں — جاوید

اب تک جن لوگوں نے لکھنؤ کی شاعری پر لکھا ہے ان میں اکثر نے صرف غزل کو سامنے رکھا ہے۔ شاعری تمام اصناف پر حاوی ہے میں سب پر گفتگو کروں گا مگر غزل کو میں نے مقدم رکھا ہے۔

غزل زندہ صنف سخن ہے کیونکہ وہ زندہ ہے اور بہت دنوں تک زندہ رہے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت مختصر اور مختصرات کا مجموعہ ہے اس میں الفاظ کا استعمال اس سلیقہ سے ہوتا ہے کہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مضمون ادا ہو جاتا ہے اور ہر شعر ایک مکمل داستان بن جاتا ہے کبھی لمبے لمبے فقرے اس طرح حذف ہوتے ہیں کہ وہ سمجھے جاتے ہیں کبھی تاریخی واقعات سیاسی حالات فلسفیانہ مضامین ہمارے تجربے اور مشاہدے کے تحت الشعور میں دبے ہوئے نقوش، تمثیل و کنایہ کے پردہ پر ابھر آتے ہیں اور زمانہ کی گردش دوستوں کی بے وفائی، دنیا کی ناپائیداری

توکل، قناعت اور حیات و کائنات کے بہت سے مسائل نہایت موثر طریقہ سے ادا ہو جاتے ہیں جو ہمارے حالات کا آئینہ ہمارے نفسیات کی محاکات اور ہمارے تجربوں کا نچوڑ ہوتے ہیں۔

غزل کی مقبولیت کے اسباب مولانا حالی کے بقول :- ”محفل عشرت کی گرمی اور بزم معرفت کا ہنگامہ بھی اسی پر منحصر ہے۔“

بہت سے شعر حکیمانہ قول اور کہاوت کی طرح زبان کا جز بن گئے ہیں جو اٹھتے بیٹھتے بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں ؎

زندگی زندہ دلی کا نام ہے — مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں — ناسخ
تمام عمر یونہیں ہو گئی بسر اپنی — شب فراق گئی روز انتظار آیا — ”
صحرا کو بھی نہ خالی رشک چمن سے پایا — کیا کیا جلا ہے سا کھو ہولا جو ڈھاک میں — ”
خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی — گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے — آتش
سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا — ”
فضل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال — ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا — ”
بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا — ”
کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے — سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے — ”
تکلف سے بری ہے حسن ذاتی — قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے — ”
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے — ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے — ”
آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل — رند
نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے — گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے — مونس
قسمت کی نارسائی سے ٹوٹی کہاں کمند — وہ چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گئے — شاد لکھنوی

کبھی ایک ہی مصرع یہ کام دے جاتا ہے ؎

اجل سر پہ کھڑی ہے خواب غفلت میں زمانہ ہے ناسخ
خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے ۔ "
اسے سوا کسی کے کوئی روبرو نہیں "
شیر قالین اور ہے شیر نیستاں اور ہے "
ہے اگر وہم تو علاج نہیں "
کہیئے کیسا مزاج عالی ہے "
خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے "
نہ جانے خدا کیا کیا چاہتا ہے "
یہ بزم خیر ہے لا خیر کا مقام نہیں آتش
بس ہو چکی نماز مصلیٰ اٹھائیے "
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے "
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر
جس سے ہوتی ہے امید اس سے گلہ ہوتا ہے برق
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں صبا

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے نسیم
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر وزیر
لیکے نہ ہلتا ہے جبتک لگ نکو باقی اختر
معلوم ہو گا حشر میں پیمانہ آپ کا "
اور چراغ کا دیا جلا دینے جا جاتے رند
بات تھی کھولی انتہا کر کے "
مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی عشق و غالب
پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر محبوب
جب یہ رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا قلق
خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بے بلائے ہوئے امیر
ملک الموت نے گھر دیکھ لیا جاوید
تلوار کاٹتی ہے سپاہی کا نام ہے ماہر
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی جلال
دو ہی پر زخمی کئے صیاد نے اک تیر سے رشید
بعد اپنے حسن و عشق کا قصہ تمام ہے ماہر

غزل کا اصلی موضوع

غزل کی دلکشی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس کا اصل موضوع صنف نازک سے مرد کا جنسی میلان ہے اس کی صورت، حسن، چال ڈھال، زیور بناؤ سنگار پر مرد کی فریفتگی اس سے ملنے کی آرزو اس سے وصل کی تمنا اس کی لذتیں۔ ہجر کی اذیتیں۔ یہ عورت سے کسی اور طرح کی محبت سے انکار کرتی ہیں۔

مرد عورت پر اسی وجہ سے فریفتہ ہے کہ وہ اس سے جنسی خواہش پوری کرنے کا مشتاق ہے حسن محض عشق کا سبب نہیں ایک حسینہ کسی کی بیٹی اور بہن بھی ہے مگر اس کا حسن و جمال اس کے باپ اور بھائی کے لئے غزل کا موضوع نہیں اس کا سبب یہی ہے کہ ان کے درمیان جنسی خواہش کا دخل نہیں مگر وہی حسینہ اپنے محبوب کے لئے قیامت ہے اور غزل میں اس کی ہر چیز اور ہر ادا کے بلائے جان ہونے کی عجیب عجیب تشبیہیں اور استعارے ہیں۔ دنیا کی جتنی چیزیں انسان کو کسی نہ کسی طرح متاثر کر سکتی ہیں وہ عورت کے کسی وصف ذاتی یا اضافی کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔

غزل کی تشبیہیں اور استعارے

زلفیں، کمند، افشاں کہکشاں، پیشانی چاند، ابرو کمان، نگاہ تیر، مژگاں نشتر، آنکھیں جادو گر، رخسار پھول، ہونٹ پنکھڑی، دہن غنچہ، دانت موتی، ٹھوڑی سیب، چہرہ چاند، پستان انار، انگلیاں شمع کافوری، پنڈلیاں بلوری، جسم چاندی کا، قد سرو کا، چال چکور کی۔

لباس میں :۔ دوپٹہ، محرم، نقاب، انگیا، کرتی، چولی ان سب کا رنگ جسم، اینچی انگڑائی میں ان کا مسکنا اور عاشق کی طبیعت کا کھسکنا۔

سامان آرائش میں :۔ کنگھی افشاں۔ سرمہ مسی۔ غازہ۔ مہندی۔ آرسی۔ آئینہ سب اس کے دل کو تہ و بالا کرنے کے سامان ہیں۔

زیور میں :۔ بجلیاں۔ بالیاں۔ بندے۔ طوق۔ گلوبند۔ بازوبند۔ تعویذ۔ چوڑیاں۔ پازیب خلخال اور اس کی جھنکار اس کے دل کو تڑپا دیتی ہے۔

اداؤں میں تبسم بجلی گراتا ہے انگڑائی دل کی رگیں توڑ دیتی ہے

شرم وحیا قہر ڈھاتی ہے اس کے علاوہ ؎

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اور ہر شیوہ جان لیوا

وہ پردہ نشین ہے باحیا ہے باعزت ہے چلمن کی آڑ سے کہیں نگاہ پڑ گئی بس دل ہاتھ سے جاتا رہا راز عشق چھپانا اس کو رسوائی سے بچانا اس کا نام زبان پہ نہ آنا محبت کا تقاضا ہے۔ نہت بے جیبی میں اشاروں کنایوں اور رمز کہ ضمیروں میں کچھ دل کی حالت زبان پہ آجاتی ہے اس پہ دل ودین نثار، اس کے دید کی تمنا، اس سے وصل کی آرزو اس کے ہجر میں آہ وزاری، اس کے انتظار میں بیقراری اس کے نہ آنے پہ یہ خیال کہ وہ وعدہ فراموش ہے، ظالم ہے، سنگدل ہے، آہ وزاری کا اس پہ اثر نہیں ہوتا یہاں اختر شماری ہے وہاں مانگ میں افشاں بھری جارہی ہے تڑپانے میں اس کو مزہ اور دل جلانے میں لطف آتا ہے، اس کی گلی کا چکر ہے، اس کے ہجر میں وحشت ہے صحرا نوردی ہے گریبان چاک ہے اس کے فراق میں مر مر کے جینا اور راتوں کو اٹھ اٹھ کے رونا ہے بہتا ہوا دریا بھی کبھی تھم جاتا ہے مگر دل ہے کہ کسی وقت نہیں تھمتا باغ ہے اس کے ویرانہ اور بہار خزاں ہے محبت زندگی اور اس میں مبتلا رہنا حاصل زندگی ہے، واعظ وناصح کا سمجھانا گراں ہے چارہ گر کی تدبیریں ناگوار ہیں ان پہ پھبتی کستا ہے اور ان کا مذاق اڑاتا ہے ہر شخص رقیب ہے مگر سب بوالہوس خود سچا عاشق ہے اس کو نامہ شوق لکھتا ہے پیام محبت بھیجتا ہے آدمی، کبوتر، باد صبا اس کے قاصد ہیں بے خودی طاری کرنے کیلئے شراب ساقی ہے۔

ادھر معشوق شانہ کشی و زلف آرائی میں مشغول نہیں بلکہ حیا مانع ہے، شرم دامن پکڑے ہے گھر والوں کا خیال ہے خاندان کی عزت کا پاس ہے راز عشق کھل جانے میں رسوائی کا ڈر ہے چپکے چپکے آنسو بہانا اور دل مسوس کے رہ جانا اس کی زندگی ہے وہ بھی اس احتیاط سے کہ گھر والے حالت میں کوئی تغیر محسوس نہ کریں۔

یہ مضامین غزل کی جان اور ایشیائی تمدن کے تقدس کا نشان ہیں ان بندشوں سے آزاد ملکوں میں تمدن کی یہ شرافت کہاں۔ گل وبلبل شیریں فرہاد لیلیٰ مجنوں کی محبت کس شاعری کو نصیب ہے۔

ان سب کی ایک زبان ہے ایک لہجہ ہے جو تمام اصناف سخن سے مختلف ہے خاص طور پہ حسن وعشق کے نازک جذبات عاشق کی نیاز مندی عاجزی معشوق کی بے نیازی غرور حسن ناز وادا کے لئے لہجہ بہت نرم اور لوچ دار ہوتا ہے جب شاعر ان مضامین کو مناسب زبان اور لہجہ میں ادا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو شعر حسن وعشق کی بولتی ہوئی تصویر بن جاتا ہے ؎

یوں کوئی زلف بناتا ہے سنورنے والے — جو نہ ہوتا ہو پریشاں وہ پریشاں ہو جائے
ہائے وہ زلف کو بکھرائے کسی کا کہنا — جس کو ہونا ہو پریشاں وہ پریشاں ہو جائے

غزل پر اعتراض

بعض لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ غزل گو کے اعصاب پہ عورت سوار ہے گل وبلبل، چاند سورج تارے شراب وکباب ساقی ومیخانہ کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں وہ نیا مضمون پیدا اور حیات وکائنات کے مسائل بیان کرنے سے قاصر ہے۔

یہ اعتراض اب سے پچاس برس پہلے نہیں کئے گئے۔ مغربی شاعری سے نیم آشنا اور مشرقی شاعری سے ناآشنا یہ باتیں کہتے ہیں۔

عورت ہمیشہ سے مرد کی محبت کا محور رہی ہے دنیا میں اس سے زیادہ دلکش مرد کے لئے کوئی چیز نہیں حیات و کائنات میں، اس کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں جب تک دنیا اور یہ نظام فطرت قائم ہے اس وقت تک عورت مرد کی محبت کا مرکز رہے گی۔ اس کو جانے دیجئے کہ نظام فطرت میں اس کو کتنا دخل ہے۔ اس کی تفصیل غزل کا موضوع نہیں غزل کا تعلق اس سے ہے کہ انسان مال و دولت عزت آبرو ہوش و حواس سب اس کے پیچھے کھو بیٹھتا ہے فطرت اس کی طرف مائل ہے اس سے بے نیازی اسی کے لئے ممکن ہے جس کی فطرت میں بگاڑ ہو (عنین یا خنثیٰ) انبیاء بھی اس سے دامن نہ بچا سکے۔ یہ بلا ہمیشہ انسان پر مسلط رہی اس کی ہر ادا مرد کے لئے حیات و کائنات کا اہم مسئلہ اور آفاقی کلچر ہے ؎

فتنہ در سر بتاں مست خرام   ہائے رے کس ٹھسک سے چلتے ہیں۔ میر
چالی جیسے کڑی کمان کا تیر   دل میں ایسے کہ جا کرے کوئی ! غالب
جادو بھرا تھا سرمہ دنبالہ دار میں   ملتے ہی آنکھ دل نہ رہا اختیار میں
راضی ہوں میں وہ جو ستم ناروا کرے   بس میں کسی کے دل نہ کسی کا خدا کرے

ہر قوم کی زبان و شاعری اس کے تمدن کی عکاس ہوتی ہے خاص طور پر غزل جو سوائے اردو فارسی کے اور کسی زبان میں نہیں اس کی ایک مخصوص فضا ہے ایک خاص آہنگ ہے اس کی تشبیہوں استعاروں کی ایک الگ دنیا ہے اس کی ایک مخصوص زبان ہے اور اس میں ایک خاص لوچ، لچک اور ہلکا پھلکا پن ہے معترض اس کے لطف سے محروم ہیں اس کی ٹیکنک سے ناواقف ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل و دماغ پر جو عریاں شاعری چھائی ہوئی ہے اور جس تمدن کی برتری کے وہ قائل ہیں۔

وہاں ہر وقت اور ہر جگہ عشق آسان اور "دلے افتاد مشکلہا" کا کوئی خطرہ نہیں۔ بازار، سینما، کلب، پارک، اسکول، کالج یا ہانگ کانگ اپنے گھر پہ والدین کے علم میں ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں اس سے پردہ اور پردہ نشین نقاب۔ چلمن۔ راز عشق۔ پردہ داری محبت۔ اشتیاق دید۔ شرم و حیا ہجر و فراق کے بہت سے مضمون جو ہماری غزل کی جان ہیں ان کے لئے فرضی دور از قیاس اور غیر فطری ہیں ان کے یہاں عورت کی حیثیت غالب کے جام سفال سے زیادہ نہیں ؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

اکبر الہ آبادی نے اس معاشرے کی کتنی اچھی اور سچی عکاسی کی ہے ؎

ان سے رخصت ہوا میں اے اکبر   وصل کے بعد تھینکیو کہہ کے

ایشیا کا معشوق اتنا سہل نہیں اس کا عاشق کے اعصاب پر سوار رہنا یہاں کے تمدن کے موافق ہے اگر کسی کو عورت سے نفرت اور اردو شاعری سے رغبت ہے تو اور اصناف موجود ہیں۔ ایک صنف سخن جس کی ساری دلکشی اسی میں ہے کہ اس کا موضوع عورت ہے اس سے اس کو خارج کرنے اور فرضی غیر فطری پاک محبت داخل کرنے کی خواہش سے زیادہ بد ذوقی کیا ہو سکتی ہے۔

یہ شکایت بھی صحیح نہیں کہ گل و بلبل کے علاوہ کچھ نہیں۔ گل و بلبل۔ چاند۔ سورج اور تاروں سے زیادہ حسین شراب سے زیادہ پر کیف تیر نشتر سے زیادہ چبھنے والی کوئی چیز نہیں جب تک دنیا قائم ہے ان سے زیادہ بہتر چیزیں نہیں مل سکتیں یہ مضامین نہیں نام میں اور معشوق کے وصف ذاتی یا اضافی کے استعارے ہیں ان کا

استعمال اس وقت تک بند نہیں ہو سکتا جب تک ان سے بہتر اور موزوں تر چیزیں وجود میں نہ آجائیں اگر یہ چیزیں پرانی ہیں تو محبوب کے چشم و ابرو غیرہ کی جگہ اور حسن بھی تو خلقت آدم سے اس وقت تک نئی ہی

اس صورت میں محبوب کے چہرہ کے لئے چاند سورج پھول تبسم اور انگڑائی کے لئے بجلی نگاہ کے لئے تیر و نشتر سے بہتر استعارہ کیا ہو سکتا ہے ان کی دلکشی کبھی ختم نہیں ہو سکتی انھیں فرسودہ کہنے والا ذوق سلیم سے محروم ہے۔

جس طرح ہر نئی چیز پرانی چیزوں سے ایجاد ہوتی ہے اسی طرح دنیائے شاعری کے ان موجودات سے شاعر نیا مضمون پیدا کرتا ہے۔

معشوق کی انگڑائی بڑی دلکش ہوتی ہے۔ وہ اس حالت میں زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے فرسودہ مضمون ہے عزیز لکھنوی کا شعر ہے ؎

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا — عزیز

انگڑائی سے حسن کے بڑھ جانے کی یہ تعبیر کہ پر لگ گئے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اڑا جاتا ہے نئی بات ہے اور اپنے مرکز نے تو قیامت ڈھا دی۔ جسم میں جو حسن کے مرکز ہیں انگڑائی میں حسن ان مرکزوں کی طرف مائل پرواز تھا یعنی ان میں حسن بڑھ رہا تھا اس سے پہلے کس نے یہ بات کہی؟ اسی انگڑائی کو ماہانی جائسی نے ایک اور طرح کہا ہے ؎

حسن قامت کی جو حد کھینچی تھی رعنائی نے — اس کو دو ہاتھ بڑھایا تری انگڑائی نے

ہم پرانے عاشق ہیں پرانا مضمون ہے عشق نے اسے نیا کر دیا ہے ؎

شعلۂ حسن سے بھڑکا دو دل اپنا اول — آگ دنیا میں نہ آئی تھی کہ سوزاں ہم تھے

اسی کو جاوید نے ایک نئی طرح کہا ہے ؎

آج کے دن کی خبر دل کی دھڑکن نے دی تھی — بچپنے میں کبھی سنتے تھے جو افسانۂ عشق

عزیز مرحوم کہتے ہیں ؎

سوزِ عشق رہی بعد فنا بھی دل میں — حصہ عمر مرے عشق کو کافی نہ ہوا

دل نہ ہوتا جب بھی تیرِ اجل ہوتا دم کو — اس گرہ نے اور اس رشتہ کو محکم کر دیا

کیا یہ نئی باتیں نہیں ان میں جو چیز پرانی ہے وہ مضمون نہیں نام ہیں استعارے ہیں اور وہ کبھی نئے نہیں ہو سکتے۔

ہر بڑا شاعر نئے مضمون پیدا کرتا ہے پپیہے کی پر درد آواز کی ہزاروں توجیہیں کی گئیں ہیں مولانا صفی لکھنوی نے بالکل نئی بات کہی ہے ؎

تو بھی مایوس تمنا مرے انداز میں ہے — جب تو یہ درد پپیہے تری آواز میں ہے

عاشق مرنے کے بعد بھی سوز عشق میں مبتلا رہتا ہے بلکہ اس کی خاک کا ذرہ ذرہ اسی طرح کرب و اذیت میں رہتا ہے جس طرح زندگی میں تھا والد مرحوم نے جس اہتمام سے اس مضمون کو باندھا ہے اردو میں اس کی نظیر نہیں ملتی ؎

دل تھام لیا اپنا صحرا میں بگولوں نے — آئی کہہ کے جو گرد اٹھی بیٹھی ہوئی تربت کی

غزل کا یہ موضوع، یہ سب تشبیہیں اور استعارے ایران میں پیدا ہوئے اردو میں جب شاعری شروع ہوئی تو اسی کی تقلید کی گئی اس میں اجتہاد یہ ہوا کہ فارسی میں مذکر اور مونث کی ضمیریں ایک ہی ہیں مگر اردو عورت کی مردانگی کی متحمل نہیں لیکن غزل میں معشوق کو رسوائی سے بچانے کے لئے مذکر ضمیروں سے ابہام پیدا کیا گیا جرأت کا شعر ہے ؎

قصیدہ اور غزل میں تھا تیرا نام گر لانا — تو اے پیارے زبان پر نام میرا پھر نہ تو لانا

اس فرق کے علاوہ غزل اب تک وہی ہے جو فارسی میں ہے۔

غزل کی یہی خوبیاں اور دلفریبیاں دنیا میں ہر جگہ سے زیادہ شاعری کو اردو فارسی میں زندہ کئے ہوئے ہیں اور جب دنیا کے تمام ملکوں میں شاعری ختم ہو جائیگی جب بھی وہاں شعر بہت دنوں تک زندہ رہیگا جہاں غزل کہی جاتی ہے اس وجہ سے میں نے بھی غزل کو سب سے مقدم رکھا ہے اور اب جہاں شاعری کی لفظ آئے گی وہاں مراد غزل ہوگی۔

دہلی اور لکھنؤ کی شاعری پر تبصرہ

لکھنؤ کی شاعری پر جن لوگوں نے بحث کی ہے انھوں نے پہلے دہلی کی شاعری کو پیش کیا ہے کیونکہ لکھنؤ کی شاعری اس سے الگ کوئی چیز نہیں اس سے خودبخود دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا موازنہ ہو جاتا ہے اور اس کے بغیر لکھنؤ کی شاعری کو سمجھنا ممکن بھی نہیں۔

اس میں عام طور پر لوگوں سے غلطیاں ہوئی ہیں پہلے ان پر گفتگو ضروری ہے۔

مولانا امداد امام اثر نے لکھا ہے کہ

دہلی کی شاعری میں داخلیت اور لکھنؤ کی شاعری میں خارجیت ہے

مولانا عبدالسلام ندوی اور دوسرے نقادوں کی رائے ہے کہ

دہلی کی شاعری میں یاس و حسرت اور لکھنؤ کی شاعری میں عیش و عشرت ہے۔ دہلی کی شاعری میں صوفیت اور لکھنؤ کی شاعری میں سوقیت ہے۔ دہلی کی شاعری میں سادگی لکھنؤ کی شاعری میں تصنع ہے۔

فراق گورکھپوری کی رائے ہے کہ

دہلی کی شاعری میں امارد سے جنسی تجربے ہیں اور لکھنؤ کی شاعری میں عورت سے۔

نیاز فتحپوری کہتے ہیں۔

دہلی کا شاعر خراب الفت ہونے کے بعد ایک دنیا اپنی علیحدہ قائم کر لیتا ہے جہاں وہ کائنات سے بے نیاز ہو کے شعر نہیں کہتا بلکہ اپنے جذبات کی ایک حزیں راگنی میں گنگنایا کرتا ہے

اور لکھنؤ کا شاعر طالع ناساز کی تمام یاس آفرینیاں دیکھنے کے بعد بھی کوچہ محبوب کو نہیں چھوڑتا۔

محفل یار میں غیروں سے انکا التفات دیکھ دیکھ کے جل رہا ہے مر رہا ہے لیکن ایک سرکش گدا کی طرح وہاں سے نہیں ٹلتا یہاں تک کہ وہیں دم دیتا ہے۔ ذبح ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی نہیں بلکہ موت کا بڑا کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا محبوب بھی با زلف پریشان اس کے جنازے کے ساتھ ہے لکھنؤ میں تاثرات محبت کی یہ فضا پیدا ہو جاتا جس میں دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے نزع۔ جاں کنی۔ واویلا بین۔ شیون۔ جنازے کے مناظر ——— دردناک تو ہے لیکن خودداری اور وقار کی بلندی نہیں رکھتا

لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا رُخ وہ ہے جس کا تعلق صرف محفل طرازیوں سے ہے اور جہاں عامۃ الورود جذبات الفت سے بحث کی جاتی ہے اس رنگ میں لکھنؤ کا شاعر ہر چند اہل نظر کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش نہیں کر سکتا لیکن ایک بوالہوس کی حس پرستیاں بھی ہمیشہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہوتیں ———

لکھنؤ کی شاعری کا یہ رُخ ضرور قابل لحاظ ہے اور ایک رند شاہد باز کی زندگی کے بہت سے نکتے اس میں تلاش سے مل جاتے ہیں ———

کی روانی زبان کی پاکیزگی الفاظ کی شائستگی لکھنؤ کی شاعری میں اپنی جگہ خاص چیز ہے اگر کوئی اسے تکمیل کے ساتھ ادا کر سکے

محاورات کی شگفتگی جو اہلِ لکھنؤ کا حصہ تھی"۔ انتقادیات حصہ دوم ص ۵۰ تا ۴۱

مولانا امداد امام اثر کی رائے صحیح نہیں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کی شاعری میں داخلیت بھی ہے اور خارجیت بھی میر و ناسخ کی ہم طرح غزلیں دیکھئے ؎

میر

وہ ظالم بھی تو سمجھے کہہ رکھا ہے ہم نے یاراں کو
کہ گورستان میں گاڑیں جدا ہم اہلِ ہجراں کو

فلک نے گر کیا رخصت مجھے سیرِ بیاباں کو
نکالا سر سے میرے جائے مو خارِ مغیلاں کو

جلے ہیں کب سے مژگاں آنسوؤں کی گرم جوشی سے
اس آبِ چشم کی جوشش نے آتش دی گلستاں کو

بنے ناواقفِ شادی اگر ہم بزمِ عشرت میں
دہانِ زخمِ دل سمجھے جو دیکھا روئے خنداں کو

نہیں ریگِ رواں مجنوں کے دل کی بیقراری ہے
کیا ہے مضطرب ہر ذرہ رنگِ بیاباں کو

ہوائے ابر میں کچھ بھی نہیں جو تو نہ ہو ساقی
دمِ افسردہ کر دے منجمد رشحاتِ باراں کو

ناسخ

درازی یاد دلواتی ہے اس زلفِ پریشاں کو
عزیز اس واسطے رکھتا ہوں میں شبہائے ہجراں کو

ہزاروں صدمے جانِ ناتواں پہ ہیں نہیں مرتا
کہوں اب آبِ حیواں ظلمتِ شبہائے ہجراں کو

حنا خالق نے پیدا کی جو تیرے پاؤں کی خاطر
بنایا میرے تلووں کے لیے خارِ مغیلاں کو

نہ دیکھا ساتھ جب گلشن میں اس سرو چراغاں کو
کیا سرو چراغاں نے سپردِ گلستاں کو

ہم اے جراح برسوں رو چکے ہیں دو دن تو دے
نہ سی پھر خدا ظالم دہانِ زخمِ خنداں کو

جنوں نے جبکہ دی روزِ ازل ترغیبِ عریانی
گریباں صبح کو بخشا دیا دامن بیاباں کو

نہ کیوں کر چشمِ مستِ یار خوش ہو میرے رونے سے
کہ ناسخ دوست رکھتا ہے ہر اک میخوار باراں کو

یاس و حسرت عیش و عشرت بھی دونوں جگہ کی شاعری میں موجود ہے۔

لکھنؤ کی شاعری میں سوقیت کا خیال بھی غلط ہے بلکہ اس کا الٹا ہے دہلی کی شاعری میں سوقیت ہے لکھنؤ کی شاعری مہذب اور سنجیدہ ہے اور یہی اس کا امتیاز ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ دہلی کی شاعری میں امارد سے جنسی تجربے اور صوفیت ہے اور لکھنؤ کی شاعری میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں۔

امرد پرستی نہ ہونے پر تو کسی کو اعتراض نہیں بلکہ بعض لوگوں نے اس کی تعریف کی ہے ان میں پنڈت دتاترے کیفی بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ غزل لکھنؤ جا کے فطرت کے موافق بن گئی یعنی امرد کی جگہ عورت اس کا موضوع بن گئی۔ ہاں تصوف کی شکایت ہے۔

غزل اور تصوف | میرے خیال میں غزل کو تصوف سے کوئی ربط نہیں۔ ایسی ذات جو فہم و ادراک سے بلند انداز و قیاس سے باہر جاسے محسوس کرنے سے قاصر، کوئی چیز نہ کسی چیز کی طرح اس کے عشق میں بیقراری اس کے ہجر میں گریہ وزاری اس سے وصل کے لئے اضطراب کتنی غیر شاعرانہ بات ہے۔ سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اختر نے اس کو بہت عمدہ طریقہ سے کہا ہے ؎

پردہ نشیں ہمارے تل نا شناس میں! آتی نہیں یہ بات ہمارے قیاس میں

نیاز فتحپوری نے سچ کہا ہے کہ عشق اس دنیا میں اسی گوشت و پوست کے پتلے سے ہو سکتا ہے اس کے علاوہ اگر کوئی روحانی عشق ہے تو وہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں نہ غزل سے اس کا کوئی تعلق ہے"۔

خود تصوف کے مضامین ایسے خشک اور بے کیف ہیں جو غزل

کاموضوع نہیں بن سکتے۔

ہر شاعر کا کلام اس کے ذوق اور معتقدات کا آئینہ ہوتا ہے صوفی شعراء نے غزل میں اپنے مزعومات اور معتقدات اشاروں اور اصطلاحوں میں بیان کیے ہیں شاعری میں اصطلاحات کی گنجائش نہیں اس کا تعلق علم سے زبان نہیں ہوتا صوفیا اپنی بات کہہ کے دل ہی دل میں مزے لیتے ہوں گے ان کی نقالی اوروں نے بھی کی ہے جیسے غالب ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں
ہیں تو خود دریا و لے کوتہ نظر کے سامنے — ظرف موج و قطرہ میرے رخ اک پردا ہوا
پردہ کو تعینوں کے در دل سے اٹھا دے — کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

غیب و شہود غزل میں بے معنی لفظیں ہیں ان اشعار کو وہی سمجھ سکتا ہے جو وحدت وجود حجاب و تعینات وغیرہ مصطلحات صوفیہ سے واقف ہو یہ نہ غزل کی زبان ہے نہ غزل کے مضامین ہیں۔

غزل میں مصطلحات و مفروضات شعراء کے علاوہ کسی معنی بند لفظ کی گنجائش نہیں۔

تصوف کے اشعار کی ایک قسم وہ بھی ہے جس میں کیف ہے ؎

جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیم روز — آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی — کتنے ہیں بے حجاب کہ یوں ہیں حجاب میں

نہ کیوں وہ خوبیٔ قسمت پہ اپنی ناز کرے — نگاہ ناز جسے آشنائے راز کرے

ان اشعار میں جمال دلفروز نگاہ ناز شرم۔ ادائے ناز۔ آنکھوں آنکھوں میں دل کی بات کہہ دینا ایسی باتیں ہیں جن سے لطف پیدا ہوا ہے۔ یہ جنس لطیف کی دلکش خصوصیتیں ہیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مجازاً خدا کے لیے بھی یہ سب کہا جا سکتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایسے تمام اشعار میں صنعت ایہام یا توجیہہ ہوتی ہے اور اس میں جو دلکشی پیدا ہوتی ہے وہ تصوف کے عنصر سے نہیں بلکہ ایہام و توجیہہ کے اس پردے سے جس کے پیچھے سے ہمیں صنف نازک کی جھلک نظر آتی ہے۔

اسی طرح توکل صبر و قناعت رضا بالقضا توبہ و انابت بے ثباتی دنیا۔ ترک دنیا وغیرہ کے مضامین میں جب ہی لطف پیدا ہوتا ہے جب وہ غزل کی زبان میں کہے جائیں جیسے میر کا یہ شعر ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

ایسے اشعار اساتذہ لکھنؤ کے یہاں بھی ہیں ؎

نہ کوئی ان کے سوا اور جہاں جہاں دیکھا — وہی وہی نظر آئے جہاں جہاں دیکھا
کہیں نہاں نظر آئے کہیں عیاں دیکھا — نئے لباس میں دیکھا تجھے جہاں دیکھا

تصوف کے اشعار کی ایک قسم وہ ہے جسے اہل لکھنؤ عارفانہ کہتے ہیں اس میں مصنوع سے صانع کی معرفت کا مضمون ہوتا ہے یہ اہل لکھنؤ کا خاص موضوع ہے اور اس میں نہایت عمدہ شعر کہے گئے ہیں ؎

ہم تجھ میں محو قدرت پروردگار ہیں — اک مشت خاک کو مہ انور بنا دیا رشک

لکھنؤ کی شاعری میں سادگی

لکھنؤ کی شاعری میں سادگی نہ ہونے کا خیال بھی درست نہیں ہر بات تصنع اور تکلف ہی سے نہیں کہی جاتی کبھی سامنے کی بات برجستہ اور سادگی سے ادا ہو جاتی ہے ناسخ جو تکلف میں مشہور ہیں ان کی سادگی دیکھئے

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی ۔۔۔ عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی
بہار آتے ہی ہر سمت پھول پھولے ہیں ۔۔۔ ہوئی شگفتہ طبیعت نہ ہم ملولوں کی
صحرا کو بھی نہ پایا رشک و حسد سے خالی ۔۔۔ کیا کیا جلا ہے سا کھو جو ڈھاک بن ہیں
آتی جاتی ہے جابجا بدلی ۔۔۔ ساقیا جلد آ ہوا بدلی
زندگی زندہ دلی کا نام ہے ۔۔۔ مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں
فراق یار میں فصلِ بہار آئی ہے ۔۔۔ الٰہی آتشِ گل سے تمام باغ جلے
گھر مرا فرقت میں سونا ہو گیا ۔۔۔ کنج مرقد کا نمونہ ہو گیا

لکھنؤ کی شاعری میں تصنع

لکھنؤ کی شاعری میں تصنع کی شکایت بھی کی جاتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں صنائع و بدائع کا استعمال بہت ہے یہ بات صحیح ہے مگر قابلِ مذمت نہیں اس سے زبان کو بہت فائدہ ہوا ایہام گوئی تو پہلے ہی سے تھی اب صنائع و بدائع سے بےلطف سادگی دور ہو گئی اس کی مثال ماہر القادری کا یہ نعتیہ شعر ہے ؎

وہ جو نہ ہوتے کچھ بھی نہ ہوتا دُنیا ان سے عقبیٰ ان سے
دونوں جگ ہیں ان کی بدولت صلی اللہ علیہ وسلم

وہ جو نہ ہوتے کچھ بھی نہ ہوتا بات صرف اتنی ہی ہے اسی کو ان الفاظ میں دھرایا ہے دنیا ان سے عقبیٰ ان سے اسی کو دوسرے مصرعے میں یوں کہا ہے دونوں جگ ہیں ان کی بدولت شعر حسنِ معنی اور حسنِ بیاں دونوں سے عاری ہے۔ میں نے اس پھیکے شعر میں یوں لطف پیدا کر دیا ہے ؎

مزرعِ دنیا گلشنِ عقبیٰ دونوں شاداب ان کے قدم سے
تابشِ قدرت بارشِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم!

ہمارے عزیزوں میں حکیم سید علی صاحب آشفتہ بڑے باکمال شاعر تھے انھوں نے ایک رباعی کہی جس کے آخری دو مصرعے یہ تھے۔

اے مالک کائنات جلوے برسیں ۔۔۔ اس بزم کو بزمِ نور کرنا ہے مجھے

والد مرحوم کو جب یہ رباعی سنائی تو فرمایا تیسرا مصرع یوں بنا دو ؎

اے ابرِ کرم فلک سے جلوے برسیں

اب مصرع آسمان پر پہنچ گیا یہی صنعتوں کا مقصد اور اہلِ لکھنؤ کا خاص ذوق ہے وہ اسے محاسنِ شعر یہ کہتے ہیں مگر آج کل جان بوجھ کے لوگ اس سے بچتے ہیں اگر کوئی صنعت آجاتی ہے تو کہتے ہیں اس میں کیا دھرا ہے ایک صنعت پر شعر کی بنیاد ہے یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بھی نہ ہوتی تو کون سی خوبی پیدا ہو جاتی اساتذہ دہلی و لکھنؤ نے ہر زمانہ میں صنعتوں سے شعر میں خوبی پیدا کی ہے مومن کا مشہور شعر ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ۔۔۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب کہتے ہیں ؎

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا ۔۔۔ تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

ان اشعار میں سارا لطف صنعت سے ہے

اکبر الٰہ آبادی کا کلام اس قدر مقبول ہے ان کے ہر شعر کی بنیاد کسی صنعت پر ہے۔ صنعتوں کے مخالفین ان کے بھونڈے استعمال سے بےمزہ ہو کے صنعتوں ہی کی مخالفت کرتے ہیں بے ڈھنگا استعمال سب کی طبیعت پر بار ہوتا ہے اسی طرح بےلطف سادگی بھی ناگوار ہوتی ہے اس وجہ سے صنعتوں یا

یا سادگی کا سرے سے مخالف ہو جانا صحیح نہیں پرہیز کے قابل وہ بات ہے جس سے لطف سخن جاتا رہے خواہ بے مزہ سادگی ہو یا صناعی

نیاز صاحب نے دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا جو موازنہ کیا ہے اس سے بھی مجھے اختلاف ہے۔ انھوں نے لکھنؤ کی شاعری کے بارے میں جو کہا ہے وہی سب مومن کی شاعری کے متعلق بھی کہا ہے اگر ابتدا میں جرات و رنگین اور آخر میں داغ کو بھی شریک کر لیا جائے تو تہذیب و سنجیدگی لطف زبان و حسن بیان میں لکھنؤ کی برتری کے علاوہ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اور یہی حقیقت ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

> اب اکثر شعرا اپنے اشعار میں بازاری عورتوں کی ان اداؤں اور حرکتوں بلکہ اب کپڑوں اور ان اعضا کا ذکر بار بار کرتے ہیں جس سے شعر مبتذل ہی نہیں فحش ہو جاتا ہے اور ملک میں چونکہ بدتہذیبی اور شہوت پرستی کو ترقی ہو رہی ہے اس لئے ہر طرف سے اس پر صدائے تحسین و مرحبا بلند ہوتی جاتی ہے۔
>
> دہلی والے اس کا الزام زیادہ تر شعرائے لکھنؤ کو دیتے ہیں اور چونکہ یہ اعتراض کسی حد تک صحیح بھی ہے اس لئے کہ لکھنؤ کی شاعری نے ایسے بازاری مذاق کے شاعر واقعی زیادہ پیدا کئے لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ آخری دور کا بگڑا ہوا مذاق تھا جس میں لکھنؤ اور دہلی کی کوئی تخصیص نہیں سچ یہ ہے کہ لکھنؤ کے

> بعض شعرا میں اس مذاق کا زور و شور جب تھا اب تو ہم سمجھتے ہیں کہ داغ کی معرفت اس فخر کو دہلی نے لکھنؤ سے چھین لیا اور جس حد تک داغ کی شاعری عروج پاتی جاتی ہے اسی حد تک یہ مذاق بھی روز بروز ملک میں زیادہ پھیلتا جا رہا ہے۔ رسالہ معیار ۱۳۲۴ھ جلد ۱

مولانا کی رائے صحیح نہیں عورتوں کی اداؤں لباس اور اعضا کا ذکر میر و سودا کے یہاں بھی ہے اور غزل کا موضوع ہے اس میں ابتذال اور بازاریت زبان طرز ادا اور لہجہ سے پیدا ہوتی ہے اگر اس کو مہذب اور سنجیدہ طریقہ سے کہا جائے تو یہ غزل کی جان ہیں (تفصیلی بحث آگے آئے گی)

اس میں بازاریت کی ابتدا جرات و رنگین سے ہوئی اور داغ تک وہ رنگ باقی رہا اسے لکھنؤ کے سر تھوپنا درست نہیں اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے غلط طور پر کچھ شاعروں کو لکھنوی اور کچھ کو دہلوی قرار دے کے ان کے مخصوص طرز کو دہلی اور لکھنؤ کا طرز قرار دیا ہے یعنی جب وہ دہلی کی شاعری کی خصوصیت بیان کرتے ہیں تو میر و سودا۔ درد اور مصحفی کا کلام پیش کرتے ہیں اور آگے بڑھ کے غالب کو بھی ملا لیتے ہیں اور لکھنؤ کی شاعری میں جرات و رنگین اور انشا کا کلام پیش کرتے ہیں اس طرح وہ میر و سودا اور درد کو دہلوی اور جرات و رنگین و انشا کو لکھنوی فرض کرتے ہیں۔

میر نے نوے برس کی عمر پائی آگرے میں پیدا ہوئے ابتدائی زندگی وہیں گذاری جوانی میں دہلی اور بڑھاپے میں لکھنؤ آئے ان کی عمر برابر کے تین حصوں میں منقسم

آگرے میں پیدا ہونا جوانی تک وہیں رہنا ایسی بات ہے جس سے انھیں آگرے کا تسلیم کرنا چاہیئے مگر ہم ان کو دہلوی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ بحیثیت شاعر کے زیر بحث آتے ہیں اور ذوق شعری ان کا دہلی میں پروان چڑھا اسی وجہ سے وہ اپنے کو دہلوی کہتے اور سب انھیں دہلوی سمجھتے ہیں۔ اسی اصول پر ہم جرأت رنگین۔ انشار اور مصحفی کو بھی دہلوی سمجھتے ہیں۔

انشار نے لکھنؤ میں جو ہنگامے کیئے وہ سب اس سے پہلے دہلی میں کر چکے تھے لکھنؤ آنے اور وہاں کی فضا سے متاثر ہونے کی وجہ سے اگر جرأت و رنگین و انشار کو لکھنوی کہا جاتا ہے تو یہی وجہ میر و سودا کو بھی لکھنوی سمجھنے کے لئے کافی ہونا چاہیئے۔

جرأت اور میر میں تو کوئی فرق ہی نہیں دونوں ایک ہی زمانہ میں لکھنؤ آئے اور ایک ہی سال دونوں کا انتقال ہوا اگر جرأت کی شاعری لکھنوی ہے تو میر کی شاعری دہلوی کیوں؟

اور ستم ظریفی دیکھیئے میر تیس برس سودا بارہ برس مصحفی بیالیس برس لکھنؤ میں رہے اور لکھنوی نہیں کہے جاتے اور رنگین نو برس لکھنؤ میں رہنے سے لکھنوی ہو گئے۔

اس سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ جب دہلویت کا ذکر آتا ہے تو میر و سودا درد و غالب کا کلام پیش کیا جاتا ہے یہ نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا خاص اسلوب اور انفرادیت ہے اگر یہ دہلویت ہے تو دہلی کے ہر شاعر کا کلام ویسا ہی ہونا چاہیئے کیا وجہ ہے کہ میر۔ درد۔ سودا۔ شاہ نصیر۔ ذوق غالب مومن اور داغ سب کا رنگ الگ ہے دہلویت وہی ہو سکتی ہے جو سب میں

مشترک ہو یہ اشتراک اگر کچھ ہے تو بعض الفاظ و محاورات تذکیر و تانیث فارسی ترکیبوں کی افراط اور بھونڈے پن میں۔

سب سے پرلطف بات یہ ہے کہ دہلویت کے اظہار میں میر و درد کا بہترین کلام اور لکھنویت کے اظہار میں جس کا کلام پیش کیا جاتا ہے وہ اس کا بدترین کلام ہوتا ہے۔

اگر انشار کا طریقہ غیر راسخ اور جرأت کی چوما چاٹی لکھنؤ کی فضا کا اثر ہے تو میر و سودا کے یہاں بھی وہی ہونا چاہیئے اور ناسخ و آتش کو تو یہ کھیل کھیلنا چاہیئے تھا۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ گرد و پیش کے حالات ہی کا اثر نہیں ہوتا اس کی ذاتی افتاد طبیعت کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔

جرأت و رنگین اور انشا کی بیہودگیاں لکھنؤ کی تہذیب کے بالکل خلاف ہیں اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ ان کا رنگ کسی نے اختیار نہیں کیا بلکہ اس کو مردود قرار دیا۔

سب سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ آتش کا اسلوب دہلوی کہا جاتا ہے یہ خیال نہیں رہتا کہ آتش کا کلام دہلوی طرز کا تسلیم کر لینے کے بعد دہلی کا وہ مخصوص رنگ کہاں رہ گیا جو لکھنؤ میں نہیں پایا جاتا۔

اصل یہ ہے کہ ولی سے مصحفی تک دہلی کی شاعری کا دور تھا سارے ہندوستان میں اسی کی تقلید کی جاتی تھی۔ ناسخ سے لکھنوی شاعری کی ابتدا ہوئی تو ہر جگہ اس کی تقلید کی گئی جو آج تک باقی ہے انھیں دونوں کا فرق لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کا فرق ہے جو دونوں جگہ کی تہذیب و تمدن میں نظر آئے گا۔

تمدن کی تعریف تمدن شہری زندگی کو کہتے ہیں جس میں لباس خوراک رہنے سہنے کے طریقے رسم و رواج علوم و فنون سب داخل ہیں اور ان سب باتوں میں دیہاتیوں کی بہ نسبت شہریوں میں زیادہ سلیقہ اور نفاست ہوتی ہے۔ تمدن پر سیاسی حالات کا بڑا اثر ہوتا ہے امن و امان خوشحالی اور

فارغ البالی کا تمدن اور ہوتا ہے قتل و غارت اور افلاس و پریشانی کا اور۔ اس لئے پہلے دونوں جگہ کے سیاسی حالات کا بیان ضروری ہے مگر وہی حالات جن سے تہذیب و تمدن کو سمجھنے میں مدد ملے اور ہم یہی کوشش کریں گے۔

دہلی کا تمدن

اُردو شاعری کی ابتداء اورنگ زیب کے آخری عہد میں اُردو شاعری کی ابتدا ہوئی اس کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے بیٹوں میں تلوار چلی۔ بڑا بیٹا

بہادر شاہ اول محمد معظم کابل کا صوبہ دار تجربہ کار اور ہوشیار آدمی تھا اس نے سنہ ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء میں حکومت پر قبضہ کر کے بہادر شاہ لقب اختیار کیا۔ بگڑے ہوئے حالات کو سنبھالا مگر پانچ برس کے اندر مر گیا اور اس کے بیٹے بنبرد آزما ہوئے۔

جہاندار شاہ دوسرا بیٹا معزالدین جہاندار شاہ ذوالفقار خاں کی مدد سے ۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء میں تخت پر بیٹھا یہ ایک طوائف لال کنور (شریک لقا آرام جاں) پر فریفتہ تھا وہ بہت پست فطرت تھی ہندوستان کی ملکہ بننے کے بعد بھی اس کی بازاریت نہیں گئی رتھ میں بادشاہ کو بٹھا کے چیزیں خریدنے بازار لے جاتی تھی اس کی دو سہیلیاں ایک سبزی بیچتی تھی دوسری کی شراب کی بھٹی تھی وہ ان دونوں سے ملنے بادشاہ کو لے کے جاتی تھی ان کو بڑی بڑی جاگیریں اپنے بھائیوں کو اعلیٰ مناصب اور خطاب دلوائے تھے۔ ان کے دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے سواری کے آگے نوبت نقارا بجتا تھا امیروں کی محل سرائیں ضبط کر کے انھیں دیدی گئیں تھیں۔ حقیقت میں بادشاہ خود سفلہ مزاج تھا جس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ شہر میں ایک ڈھلوان چٹان تھی جس پر بازاری لڑکے پھسل پٹی کھیلا کرتے تھے ادھر سے ان کا بھی گزر ہوا نہیں معلوم لال کنور نے فرمائش کی یا خود جی چاہ گیا اکبر اعظم کا یہ جانشین سواری سے اتر آیا اور چٹان کو سر کر دیا

اس وقت اس پیرِ نابالغ کی عمر چہل سال سے بھی بارہ برس زیادہ تھی اِس سے اندازہ کرنا چاہیئے کہ اس کی تخلیہ کی صحبتوں میں کیا کچھ ہوتا ہوگا۔

ذوالفقار خاں | ذوالفقار خاں دبنگ آدمی تھا دوسروں کو دست اندازی کی ہمت نہ ہوتی تھی وہ بادشاہ اور لال کنور کے بہت سے احکام کی تعمیل نہیں کرتا تھا اور حکومت کو سنبھالے ہوئے تھا اس پر بھی چاروں طرف سکھوں مرہٹوں اور جاٹوں کی لوٹ مار سے بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔

فرخ سیر | بہادر شاہ کا لڑکا عظیم الشان بنگال کا گورنر جہاں دار شاہ کا بڑا بھائی جسے قتل کرکے ذوالفقار خاں نے جہاں دار شاہ کو تخت پر بٹھایا تھا اس کے بیٹے فرخ سیر نے اندر ہی اندر تیاریاں کیں اور بارہہ کے سردار عبداللہ خاں صوبہ دار الہ آباد سے مدد چاہی پہلے تو اس نے انکار کیا مگر جب یہ ماں بیٹے اس کا دامن تھام کے روئے اور سیادت کا واسطہ دیا تو سید کا دل پگھل گیا اور حمایت پہ آمادہ ہوگیا ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں چڑھائی کی جہاندار شاہ معہ لال کنور کے گرفتار اور چند روز کی قید کے بعد قتل ہوا۔

فرخ سیر بادشاہ اور عبداللہ خاں وزیر اعظم ہوا دربار ڈوم ڈھاریوں سے تو صاف ہوگیا مگر پرانے امرا جوڑ توڑ میں لگ گئے ملک کا انتظام نہ ہو سکا چاروں طرف لوٹ مار اور بدامنی اسی طرح رہی جودھ پور کا راجہ باغی ہوگیا فرخ سیر نے مختلف مقامات پر مہمیں بھیجیں سکھوں کی گوشمالی اور راجہ جودھ پور سے مصالحت ہوئی اس کی لڑکی سے فرخ سیر نے شادی کرلی جاٹوں کو بھی سزا ملی لیکن خزانہ خالی تھا۔ فوج کو تنخواہ نہیں ملتی تھی پایہ تخت میں ہنگامہ برپا تھا۔

عبداللہ خاں | امراء عبداللہ خاں کا زور توڑنا چاہتے تھے فرخ سیر

شاہی کمار (گیتی آرا بیگم) یہ دیوانہ اور معاملات سلطنت سے بیگانہ تھا۔
اس پر اپنے محسن سیدوں کے قتل کا درپے ہوگیا تین دفعہ قاتلانہ حملہ کرایا ہر دفعہ وہ بچ گئے اور سازش کھل گئی جب سیدوں کے لئے کوئی چارہ نہ رہا تو اسے قید کردیا جس میں اس نے خودکشی کرلی۔ حالات سے باخبر شاعر نے تاریخ کہی

مساوات دواش انچہ باید کردند ۔۔۔ عظمت اللہ ۱۳۱

رفیع الدرجات | ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ء) میں سید برادران نے رفیع الدرجات (ابن رفیع الشان ابن شاہ عالم) کو تخت پر بٹھایا۔ یہ مدقوق تھا جب مرنے کے قریب ہوا تو اس کی خواہش پر اس کے چھوٹے بھائی

شاہجہان ثانی | رفیع الدولہ کو شاہجہان ثانی کا خطاب دے کے تخت نشین کیا اس کو عیاشی کے سوا کسی چیز سے کام نہ تھا چند ماہ میں وہ بھی مر گیا۔

تخت و تاج کے لئے یہ خلفشار دہلی کے واسطے نیا نہ تھا جب ایک بادشاہ مرا تو یہی کچھ ہوا ان ہنگاموں سے بھی دہلی پر کوئی اثر نہیں پڑا اور وہاں کی آبادی مضطرب نہیں ہوئی ہاں سفلہ مزاج شاہوں کے تخت پر بیٹھ جانے سے ڈوم ڈھاری بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ کر حکومت کا ساز بھی بجانے لگے۔ علماء اور اہلِ کمال بے قدر ہوگئے مگر لٹی تھی لاکھ لٹے گا پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ اس مٹی ہوئی حالت پر بھی دہلی سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی اس وجہ سے اہلِ دہلی کے پاؤں وہاں سے نہیں اکھڑے۔

محمد شاہ | سید برادران نے ۱۱۳۲ھ میں شاہزادہ عالی گوہر کو قید سے نکال کے تخت پر بٹھایا اور محمد شاہ لقب اختیار کیا۔ یہ عیاشی اور ناچ رنگ میں اپنے پیش روؤں سے کم نہ تھے مگر اقبال ساتھ لائے تھے اتفاق سے سید محمد امین سعادت خاں برہان الملک ایسا آدمی انھیں مل گیا

جس نے سید برادران کو قتل کر کے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اطمینان سے رنگ رلیاں منانے لگے۔ ساز و آہنگ کا دریا بہنے لگا اور حسن و جمال در و دیوار سے برسنے لگا امرا اپنے اپنے صوبے چھوڑ کے داد عیش دینے کے لئے آ گئے۔ صاحب مرقع دہلی جو آصف جاہ کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھانے دہلی آئے تھے ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امیروں کے گھر سے لے کے بازاروں تک کونا کونا

دامان باغبان و کف گلفروش تھا!

اس زمانہ میں (۱۱۳۳ھ) ولی کا دیوان آیا جو پہلے کی بہ نسبت بہت صاف زبان میں تھا اس نے قبول عام حاصل کیا۔

سلطنت اودھ کا قیام | سید محمد امین سعادت خاں برہان الملک ۱۱۳۴ھ میں اودھ کے صوبیدار ہوئے جہاں انھوں نے اتنی مضبوط حکومت قائم کی جو مغل شاہنشاہی سے بھی قوت و طاقت میں بڑھ گئی۔

دہلی پر پہلا حملہ | مرہٹے سکھ جاٹ ہر طرف لوٹ مچائے تھے ۱۱۴۹ھ میں بالاجی بشوا ناتھ راؤ پیشوا کا لڑکا اسّی ہزار فوج سے دہلی پر حملہ آور ہوا کالکا کے میلے کو لوٹ کر شہر میں داخل ہوا اور اپنی تمام خواہشیں بادشاہ سے منظور کرا کے واپس ہوا برہان الملک کو اس کی خبر ہوئی وہ ایک جرار لشکر لے کے آندھی کی طرح آیا دو منزلہ کو سہ منزلہ اور سہ منزلہ کو چو منزلہ کرتا ساٹھ کوس کی مسافت ایک دن میں طے کر کے مرہٹوں کے سر پر پہنچ گیا ان کے حواس جاتے رہے برہان الملک کا ارادہ تھا کہ ان کو قید کر کے مع مال و متاع بادشاہ کی خدمت میں حاضر کریں امرائے دربار نے حسد سے بادشاہ کو بھڑکایا کہ شاہی حکم کے بغیر مرہٹوں پر حملہ کرنا (جبکہ بادشاہ ان سے معاہدہ کر چکے تھے) وقار شاہی کے خلاف ہے۔ فوراً واپسی کا حکم بھجوایا برہان الملک

نے اس حکم کو مخفی رکھا اور مرہٹوں کی اس شرط پر جان بخشی کی کہ وہ کبھی اودھ کا رخ نہ کریں گے۔

اس کا اثر بڑا گہرا اور دور رس ہوا جب سارا ہندوستان لوٹ مار کی آگ میں جل رہا تھا اودھ میں مکمل امن تھا۔ دہلی کا اس وقتی ہلچل کے بعد پھر وہی رنگ ہو گیا، دا رنگ، سدا رنگ، سب رنگ، سارنگ وغیرہ ناچنے گانے والوں کو خطاب دیئے گئے جس سے محمد شاہ رنگیلے مشہور ہوئے سارنگ دیو نے سارنگی ایجاد کی۔

اہل دہلی کا زنانہ پن | یہ رنگینی اس حد پر پہنچ گئی کہ مردوں میں زنانہ پن پیدا ہو گیا۔ آنکھوں میں کاجل۔ دانتوں میں مسّی، ہاتھ پاؤں میں مہندی کان میں بالے اور کپڑوں میں گوٹا لچکا ٹانکا جانے لگا۔

انشا نے دریائے لطافت میں لکھا ہے کہ سادات بارہہ دہلی والوں کو نامرد و زنانہ کہتے ہیں۔ لباس میں لچکا گوٹا ٹانکنا اور ان کی صحبت میں رہنا عار سمجھتے ہیں۔ جانسٹھ دبڈوئی گکرولی وغیرہ میں اپنی جاگیروں پر رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

بعض امرا کی توجہ سے رسد بھی قائم ہوئی اور زیج محمد شاہی مرتب ہوئی۔ فضلی نے روضۃ الشہدا کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام دہ مجلس رکھا۔

دہلی کی امرد پرستی | اس زمانے میں دہلی میں امرد پرستی کو بہت ترقی ہوئی۔ یہ ترکوں کا خاص ذوق تھا اس کی تاریخ مولانا شبلی کی زبانی سنئے:۔

امرد پرستی کی تاریخ | "ابو ہلال عسکری نے کتاب الاوائل میں لکھا ہے کہ عرب مطلقاً امرد پرستی سے ناواقف تھے لیکن جب پہلی صدی میں فتوحات کا سیلاب خراسان

تک آیا اور اہلِ فوج مدت تک وطن اور اہلِ وعیال سے دور رہے اس کے ساتھ لڑائیوں میں سادہ رو نوجوان گرفتار ہو کے آئے اور غلام بن کر خلوت وجلوت میں ساتھ رہنے لگے تو امرد پرستی اور شاہد بازی کا عام مذاق پیدا ہوا ـــــ معتصم باللہ نے عرب کو فوج سے نکال کے ترک بھر دیئے تھے ـــــ ہر جگہ فوجی صیغوں میں ترک ہی نظر آتے تھے۔ یہ نوجوان سپاہی۔ حسین اور خوشرو ہوتے تھے اس لیئے ان کی چال ڈھال رفتار گفتار بات چیت ایک ایک ادا طنازی اور شوخی کے لباس میں جلوہ گر ہوتی تھی چنانچہ اکثر اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی سپاہی بچے مکتب عشق کے معلم تھے ـــــ ایاز کا نام تم نے محمود کے معشوق ہونے کی حیثیت سے سنا ہوگا ـــــ ترکوں کی معشوقی نے یہاں تک وسعت حاصل کی کہ ترک کے معنی معشوق کے ہو گئے ع

جملہ ترکان جہاں ہندوے تو

یہ مذاق اس قدر عام ہوا کہ سلاطین و رؤسا تک علانیہ امرد پرستی کرتے تھے اور دربار میں ان کے معشوق نظر فروزی کا کام دیتے تھے شعراء سے ان معشوقوں کی تعریف و توصیف میں سر در بار اشعار لکھوائے جاتے تھے اور شعراء ممدوح کی عشق پرستی کا علانیہ ذکر کرتے تھے ـــــ جب یہ نوخط میدان میں آئے تو گھر گھر آگ

لگ گئی بڑے مقدس درویش اور ارباب حال مکتبوں میں بچوں کو گھورنے جاتے تھے ـــــ استاد شاگرد پیر و مرید ایسے نازک اور قابل ادب تعلقات بھی عشق پرستی سے خالی نہیں ہوتے تھے۔ اس حالت نے ملک اور قوم کی اخلاقی حالت پر جو اثر کیا اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مٹھی بھر تاتاریوں نے خراسان سے لے کر بغداد تک خاک اڑا دی"۔ (شعر العجم ح ۴ ص ۱۹۰ تا ۱۹۵)

اس قتل و غارت کا نتیجہ مولانا نے یہ بیان کیا ہے :۔

"تاتاریوں کے ہنگامے نے جو اسی زمانے میں شروع ہوا تمام اسلامی دنیا کو زیر و زبر کر دیا۔ اینٹ سے اینٹ بج گئی شرق و مغرب تک سناٹا ہو گیا۔ تصوف کی بنیاد دنیا و مافیہا کی بے قدری اور بے حقیقتی پر ہے یہ سب کو آنکھوں سے نظر آ گئی ـــــ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس کثرت سے صوفی شعراء اس زمانے میں پیدا ہوئے کسی زمانے میں نہیں پیدا ہوئے

صوفیت کی ترقی کا نتیجہ امرد پرستی کی فضا میں جو ہوا اس کی کیفیت مولانا شبلی نے یہ بیان کی ہے۔

اس زمانے میں امرد پرستی کا عام مرض پھیلا ہوا تھا صوفیہ اور اہلِ نظر اس کو عشق حقیقی کی منزل اولین قرار دیتے تھے اور ارباب ذوق کے لئے تفریح خاطر کا اس کے سوا کوئی سامان نہ تھا۔ شیخ (سعدی) چونکہ اس سانپ کو کھلا چکا تھا۔ اس کی مضرتوں سے خوب واقف تھا۔ اس لئے اس نے سختی سے اس کی برائیاں کی ہیں۔ ۵

سراز مغز دو از درم کن تہی — چو خاطر بفرزند مردم نہی

مکن بد بفرزند مردم نگاہ — کہ فرزند خویشت بر آید تباہ

صوفیہ کا پردہ اس طرح کھولتے ہیں ؎

گروہے نشینند با خوش پسر — کہ ما پاکبازیم و اہلِ نظر

صوفیوں کے اس دعوے کو کہ جمال سے ہم کو صنعتِ ایزدی کا مطالعہ مقصود ہوتا ہے اس طرح رد کرتے ہیں ؎

چرا طفل یک روزہ ہوشش نبرد — کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خورد

محقق ہماں بیند اندر ابل — کہ در خوبرویانِ چین و چگل

یعنی صنعت ایزدی کا مطالعہ مقصود ہے تو ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ میں نظر آتی ہے۔ خوشجمال اور پری جمال کی کیا تخصیص ہے۔ ایک باریک بیں کو اونٹ کے ناموزوں ڈیل ڈول میں بھی وہی صنعت کاریاں اور نکتہ آفرینیاں نظر آتی ہیں جو چین و چگل کے معشوقوں میں ہیں ——— ریاکار عالموں کی قلعی سب نے کھولی ہے لیکن صوفیہ کا گروہ جو ہمہ تن ریاکار ہے ان کی نسبت کسی کو ریاکاری کا گمان بھی نہیں ہوتا اور ہو بھی تو عوام کے ڈر سے ظاہر نہیں کرسکتا۔ شیخ (سعدی) اس راز سے خوب واقف تھا۔ اس لیے اس نے نہایت لطیف پیرایوں میں اس مضمون کو ادا کیا ہے ؎

برون نمی رود از خانقہ یکے ہشیار — کہ پیش شحنہ بگوید کہ صوفیاں مستند

محتسب در قفائے رنداں است — غافل از صوفیانِ شاہد باز

اس طرح تصوف کے ساتھ امرد پرستی پھیلتی رہی یہاں تک کہ جب

حکومت قائم ہوئی انھوں نے شعراء کو مدحِ اہلِ بیت میں قصیدے اور مصائب میں مرثیے کہنے کی ہدایت کی علماء نے حدیث و تفسیر میں کتابیں لکھیں علومِ اہلِ بیت کی اشاعت ہوئی۔ پیری مریدی کا خاتمہ ہوا۔ خانقاہیں ویران صوفیہ منتشر اور امرد پرستی ختم ہوئی۔ مگر مغبچہ۔ ترسابچہ۔ ترک بچہ۔ سبزہ خط وغیرہ مضامین یادگار چھوڑ گئی۔

ترکی ذوق ترکستان میں یہ ذوق ترقی کرتا رہا۔ ہندوستان میں انھیں ترکوں کے ساتھ آیا علاء الدین خلجی اور ملک کافور قطب الدین مبارک شاہ اور نومسلم لڑکے خسرو گجراتی کا عشق تاریخ میں موجود ہے۔ بابر نے تزک میں اپنے استاد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ امرد پرست تھا۔ سمرقند کے بارے میں لکھتا ہے کہ سربازار امارد کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے لوگ گھومتے تھے کوئی بغیر امرد کے نظر نہیں آتا تھا۔

اپنی پہلی بیوی سے ناچاقی کا سبب یہ لکھا ہے کہ میں اس زمانہ میں ایک لڑکے بابری پر دیوانہ تھا۔ جہانگیر نے تزک میں بھی ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں سرمد اور ابھے رام کا عشق مشہور ہوا۔ جعفر زٹلی نے اورنگ زیب کے ایک لڑکے کو بھی اس کا شکار بتایا ہے اور بہادر شاہ کے زمانہ میں اس کی عمومیت پر ایک گاف مردانامہ لکھا ہے۔ (میں نے گاف لکھا ہے انھوں نے صاف لکھا ہے) یہ گاف مردانامہ ان کے کلیات میں موجود ہے۔ کچھ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

پان کھا کر گاف مروا کھیلئے — باغ جا کر گاف مروا کھیلئے

بادشاہی ہے بہادر شاہ کی — بن بنا کر گاف مروا کھیلئے

وقت آں آمد کہ در ہر بیر کھائے — گھس گھسا کر گاف مروا کھیلئے

عطر مل کے چوتڑوں کے بیچ میں — مل ملا کر گاف مروا کھیلئے

غرض ملنا بتاتا ہے کہ طبقہ امراء میں یہ ذوق پھیل گیا تھا۔

دہلی کے مشہور امرد پرست

محمد شاہ کے زمانے میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ جس طرح دوسرے شہروں میں امراء رنڈی بازی میں شہرت رکھتے تھے اسی طرح دہلی کے امراء امرد پرستی میں مشہور تھے خان اعظم کے متعلق صاحب مرقع دہلی نے لکھا ہے۔

"بمقتضائے رنگینی مزاج اور بہار راگ ہندوستان کے میلوں میں ممدوح ہیں۔ ان کی طبیعت امارد پسند ہے سادہ رویوں کی محبت میں گرفتار ہیں اپنی جاگیروں کی ساری آمدنی ان پر صرف کرتے ہیں۔ جہاں کسی امرد رنگین کی خبر پاتے ہیں اس کی حسب خواہ رعایت کر کے رفاقت کی کمند میں پھانس لاتے ہیں۔ اس گروہ کی ایک جماعت ان کی حسن سعی سے مناسب مناصب پر فائز ہو کر ان کی انیس بساط ہے اور ایک جماعت مراعات خانگی پر اکتفا کر کے محفل نشاط کو رنگین بنائے ہوئے ہے سواری کے ساتھ بڑی شان و شکوہ سے گھوڑوں پر سوار ہو کے چلتے ہیں۔ غرض جہاں کوئی سبزہ رنگ نظر آتا ہے خان اعظم سے منسوب ہے اور ہر نوخط اس عظیم الشان سے وابستہ ہے۔" صـ۲۷

ایک دوسرے رئیس مرزا منو کے متعلق لکھتے ہیں۔

"مرزا منو جو امیر زادہائے زمانہ میں ہیں اس فن کی جادہ کار میں یگانہ ہیں۔ امیر زادے اس فن کی گھاتیں ان سے سیکھتے ہیں اور ان کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں وہ اس محفل کے صدر ہیں ان کی بزم غلمان صورت کے منتظم ہیں ان کا گھر شداد کی بہشت اور پری زادوں کا آشیانہ ہے جو نوخط رنگین اس محفل سے ربط نہیں رکھتا وہ فرد باطل ہے اور جو تمکین اس مجمع میں شریک نہیں بے اعتبار ہے ان کی محفل شاہدوں کا دارالعیار ہے۔ صـ۲۷

میرن صاحب کا حال سنئے:۔

"میرن صاحب وزیر الممالک کے یہاں معزز و محترم ہیں تلاش مردم حسین میں طرفہ مہارت رکھتے ہیں۔ ہر روز ایک نیا لڑکا پھانس لاتے ہیں۔ صـ۳۳

دہلی میں امارد کے اڈے

رنڈیوں کے اڈوں کی طرح دہلی میں لڑکوں کے اڈے تھے قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں:۔

شام کے وقت حسین و خوبرو اور ملیح لڑکے ان (تاباں) کے مکان پر جمع ہوتے تھے ان کو زیورات سے آراستہ و پیراستہ کیا جاتا تھا اس کے بعد امرائے قزلباش کے طلب کرنے پر محافوں میں بٹھا کے اعلام کرانے کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ صـ۲۶

دہلی کے مشہور امرد

دوسرے شہروں کی رنڈیوں کی طرح دہلی کے امارد مشہور تھے۔ صاحب مرقع دہلی کا بیان ہے:۔

اللہ بندے سبزہ و آغاز متناسب الاعضا لوگوں کا منظور نظر اور مقصود خاطر ہے۔ رحجے امرد سیہ فام ہے:۔

ہنگامہ پیرا سیان بنکا کسی کے یہاں نہیں جاتا۔ اس کا شیفتہ خود اس کے گھر جاتا ہے سلطانہ سبزہ رنگ دس بارہ سال کا سن ایک عالم کو مفتون اور ایک

خلقت کو مجنون بنائے ہوئے ہے۔ سر بن روپے کے
ماتھے کی چمک نظروں کو خیرہ کرتی ہے۔ بڑی مشکل
سے ہاتھ آتا ہے (مرقع دہلی ص۱۱)

حد یہ ہے کہ علماء و فقہاء اور صوفیا بھی اس میں مبتلا تھے۔ مرزا مظہر جانجاناں کے متعلق صاحب تذکرۂ علماء ہند لکھتے ہیں۔

"دانشمند متبحر جامع فضائل صوری و معنوی بود اکتساب علوم از علمائے وقت نمودہ و حدیث از حاجی محمد افضل سیالکوٹی اخذ کردہ و شرف ارادت و خلافت از حضرت سید محمد نور بدایونی مرید و خلیفہ شیخ سیف الدین مرید .... مرید و خلیفہ شیخ محمد معصوم عروۃ الوثقیٰ مرید و خلیفہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی یافتہ ص۲۲۷

یہ فضائل صوری و معنوی سے آراستہ اور شیخ لطافت سے پیراستہ بزرگ امرد پرست تھے۔ تذکرہ گلزار ابراہیم میں لکھا ہے:۔

"حسن پرستی سے وابستگی تمام رکھتے تھے اور عشق حقیقی و مجازی سے کام انعام اللہ خاں صاحب یقین اور محمد فقیہ دردمند ان کے شاگردان رشید سے کہلاتے ہیں اور میر عبدالحی تاباں علیٰ ہذا القیاس اسی طرح گنے جاتے ہیں۔ ص۲۱۱

انعام اللہ خاں یقین کے حالات میں بھی اس کا ذکر ہے۔

منظور نظر مرزائے مذکور ص۳۷

محمد فقیہ دردمند کے حالات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔

"منظور کردہ مرزا مظہر جانجاناں

عبدالحیٔ تاباں کے ذکر میں بھی ان کے اس تعلق کا ذکر ہے۔

"ان کا عشق مظہر کے دل میں گھر کر گیا تھا۔"

تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں مرزا صاحب کے متعلق لکھا ہے۔

"میر عبدالحیٔ تاباں کی محبت میں زار و نزار تھا۔

شیفتہ نے مرزا صاحب کے اس ذوق کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

"برعنا جوانان نظرش بود۔

تذکرۂ گلزار ابراہیم میں عبدالحیٔ تاباں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے ملاحظہ فرمائیے:۔

"تاباں تخلص میر عبدالحیٔ نام۔ شاہجہاں آبادی نہایت عزیز و خوبصورت اور صاحب جمال تھا۔ دلی سے شہر میں بے مثال تھا۔ ہندو مسلمان ہر گلی کوچہ میں ایک نگاہ پر اس کی لاکھ جان سے دین و دل نثار کرتے تھے اور پرے کے پرے عاشق جانباز کے یاد میں اس لب جاں بخش مسیحا دم کے مرتے تھے۔ تکلف یہ ہے کہ اس رعنائی اور دلربائی پر خود بدولت بھی دل کھو بیٹھے تھے ـــــ اس لیلیٰ صفتی پر مانند مجنوں ہمیشہ سرگرم فریاد و آہ رہتے تھے یعنی سلیمان نامی ایک لڑکے کو چاہتے تھے اور اس کی محبت میں باوجود وصل کے آٹھ پہر کراہتے تھے"۔

مرزا سودا کو بھی ان کے عاشقوں کی فہرست میں لکھا ہے۔

"بلکہ مرزا رفیع سودا ابنا بر یک نظر توجہ اکثر اشعار کو ان کے اصلاح کرتے تھے۔ ص۴۸

میر احمد یار بھی اسی طرح کے معشوقوں میں تھے۔ تذکرہ میر حسن میں ان کے متعلق یہ لکھا ہے:۔

"جو آبو دبا کمال وجاہت کہ یوسف ثانی تواں گفت و راں زماں
عالم عالم فریفتہ رخ نیکو و شیفتہ زلف از بود در وقت
احمد شاہ ہنگامہ حسن او گرم بود ایں ہمہ شعرائے متاخرین مانند
پروانہ دل خود را بر شعلۂ حسنش می سوختند او نیز بایشاں
صحبت می داشت ـــــ میر ضیا سلمہ نظر الفت داشتند
چنانچہ تا حال ہر وقت کہ یاد آدمی کنند می گریند۔

تذکرۂ گلزار ابراہیم میں ان کا ذکر انھیں اوصاف کے ساتھ ہے:
" احمد یار جوانے نہایت زیبا شاگرد میر تقی میرؔ و محبوب
میر ضیا در زمان احمد شاہ جمیع شعرائے تعلیم بوے داشتہ اند۔"

میر حسنؔ کے تذکرے میں ایسے بہت سے لوگوں کا ذکر ہے۔
"جعفر علی خاں ذکیؔ :۔ سوائی رام راجہ بود بروعشق داشت"
محمد افضل افضلؔ " بر کدام ہندو بچہ گوپال نامی بود کہ عاشق شد"
نور اللہ :۔ " بر یک فرنگی بچہ عشق بہم رسانیدہ"
میر رضا علی رضاؔ :۔ بر شخصے دہب علی عاشق است
محمد عظیم عظیمؔ :۔ بر سادہ عذاراں شیدا"
میر سنگیؔ :۔ بر شخصے تعشق داشت۔
صلاح الدین پاکبازؔ :۔ " بر سوہنا دھن کہ قوال بچہ بود نظر الفتے می داشت"

تذکرۂ گلزار ابراہیم میں ایسے بہت سے پاکبازوں کا ذکر موجود ہے۔۔
مہتاب رائے زیباؔ :۔ " بر منوں (جوہری بچہ) نامی عاشق شدہ"
محمد چاند رخشاںؔ :۔ بر زعفران نامی عاشق شدہ"۔

مصحفی نے اپنے تذکرے میں فدوی کے متعلق لکھا ہے:۔
" قدم در راہ امرد پرستی گزاشتہ چند جا خانۂ جنگی ہم کردہ
بکو دکان حسین تعشق درزیدہ"

" میر تقی میرؔ نے ذکر میرؔ میں ابدالی کے حملہ سے دہلی کی تباہی پر تاسف کے ساتھ اس پر بھی افسوس کیا ہے کہ بازاروں میں وہ حسین لڑکے اب دکھائی نہیں دیتے اس کے معنی یہ ہیں کہ دہلی میں اس طرح کے لڑکے بازاروں میں عام طور پر گھوما کرتے تھے۔۔ چونکہ سعد اللہ خاں اس کا بڑا اڈہ تھا۔ صاحب مرقع دہلی کا بیان ہے کہ:۔

رقص امار دخوشرو سے قیامت آباد ہے اطراف و
اکناف نوخط لڑکوں سے بھرے پڑے ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ لڑکے جہاں آباد کے اک شہر رکھتے ہیں ناز و آ جاتے ہیں بغل میں اشارہ کیا جہاں

میر کو طوفان تتمہ[1] بازار میں ۔۔۔ دیکھیو شاید وہیں وہ گلفروش
گر ٹھہرے فلک آگے انھوں کے تو عجب ہے ۔۔۔ پھرتے ہیں پڑے دلی کے لونڈے جو پری سے
لڑکے دلی کے ترے ہاتھ میں کب آئے ہیں میرؔ ۔۔۔ پیچھے اک ایک کے سو سو کئی لگے ڈاگ پھرے

میر غفر غنیؔ کی وہ مشہور گفتگو جس میں انھوں نے شعرا پر تنقید کی ہے اس میں انشاؔ کو یہی طعنہ دیا ہے۔

"آگے نتھی زاد (پری زاد) تھے ہم بھی گھوغنے (گھورنے)
جاتے تھے اب شالغ (شاعر) بن گئے ہیں (دریائے لطافت)

---

[1] تتمہ بازار۔ بازار میں تجارت کے لیے بیٹھنے والے۔ اسی سے تتمہ بازاری ہے یعنی وہ محصول جو تتمہ بازاروں سے وصول کیا جائے۔

اخلاقی پستی کی حد یہ ہے کہ اشعار کو طعنہ تو دے رہے ہیں لیکن اپنی دلبستگی کا کس بلند آواز سے اظہار ہے اور طرہ یہ کہ اس کے ناقل خود بیان اشعار۔

ملا دو پیازہ احمد شاہ کے دور میں ملا عبد المومن دہلوی جو ملا دو پیازہ کے نام سے مشہور ہیں جید عالم تھے اور بہت ظریف الطبع تھے انھوں نے ایک فرہنگ لکھ کے اس وقت کی سیاسی اقتصادی تمدنی اور معاشرتی حالات کی تاریخ مرتب کر دی ہے چند لفظیں ملاحظہ کیجئے:۔

البادشاہ ۔	کاہلی زبان	الوزیر ۔	ہذیر آہ بیچارہ کال
النواب ۔	مجموعہ تغافل	الامیرزادہ ۔	کون دہندہ بہوس
الغلام ۔	مشتاق طعام	الامرد ۔	رہنمائے شہوت
التیز دو ۔	نوکر باہیانہ تا شخص	البیوقوف ۔	کردری و باب دہر

الامیرزادہ کے جو معنی لکھے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں دہلی کے امیرزادوں نے یہ پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اس کی تائید میر تقی میر کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے ؎

ست مل اہل دول کے لڑکوں سے — میر جی ان سے مل فقیر ہوئے

مولانا شبلی نے سچ کہا ہے کہ "جب کوئی عیب سوسائٹی میں عام ہو جاتا ہے تو وہ عیب نہیں رہتا" اس زمانے میں امرد پرستی اتنی عام ہو گئی تھی کہ اسے عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شعراء بڑی بیباکی سے اس کا اظہار کرتے تھے۔ ؎

زبس ہم کو نہایت شوق ہے امرد پرستی کا — جہاں جاویں وہاں ایک آدھ کو ہم تاک رکھتے ہیں

ہر ایک سبزہ ہے ہندوستاں کا معشوق — بجا ہے نام جو عالم رکھا ہے کھیروں کا

جو لونڈا انام سن امرد پرستی کا چرچا تھے چونکے	میں اس کو بیچ دے باتوں میں جاتا ہو جو لالسا لگ	
رکھے اس لالچی لڑکے کو کوئی کب تلک بہلا	ٹہلی جاتی ہے فرمائش کبھی یہ لا کبھی وہ لا	
دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے	کام عشاق کا تمام کیا	پیام
دل لیکے لونڈے دلی کے کب کا پچا گئے	اب ان سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو	میر
کیا لڑکے دلی کے ہیں عیار اور نٹ کھٹ	دل لیتے ہیں یوں کہ ہرگز نہیں ہوتی آہٹ	〃
کیا کیا نہ لوگ کھیلتے جاتے ہیں جان پر	اطفال شہر لائے ہیں آفت جہان پر	〃
کیا میر تو روتا ہے پامالی دل ہی پر	ان لونڈوں نے تو دلی سب سر پہ اٹھالی ہے	〃
شہر کے شوخ سادہ رو لڑکے	ظلم کرتے ہیں کیا جوانوں پر	〃
تھے زمانے میں جن کے خرچے روپے	ٹھانسا کرتے تھے ان کو آنوں پر	〃

فراق گورکھپوری نے سچ کہا ہے:۔

"دہلی میں عشق کو صرف تنہائی ملتی ہے اور زیادہ تر امرد پرستانہ جذبات کے تجربے"۔ رسالہ نگار ریاض ۶۳

بیحیائی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ایک رنڈی آدھ بیگم پیجامہ نہیں پہنتی تھی نچلے حصہ پر نقش و نگار بنا کے برہنگی کی کراہت کم کرتی تھی اس کو قبول عام حاصل تھا اور ہر محفل میں اس کی جگہ تھی۔ اس فضا میں کوئی بات سنجیدہ اور مہذب کس طرح رہ سکتی تھی۔ اس دور کا کلام اس وقت کے معیار تہذیب و تمدن کا آئینہ ہے۔

ان لوگوں نے اپنے آخری زمانے میں اصلاح زبان کی طرف توجہ کی بہت سی ناگوار لفظیں۔ ستی۔ سیتی۔ سین ترک کر دیں الفاظ کی صحت ضروری قرار دی جیسے تسبی سے تسبیح۔ صحی سے صحیح اس پر بھی بقول مصنف شعراء الہند۔ "ان کی زبان مبتذل اور مکروہ الفاظ کا مجموعہ ہے"۔

دہلی پر دوسرا حملہ دہلی میں اس جنگ و آہنگ کے دور (۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء) میں نادر شاہ بلائے آسمانی کی طرح نازل ہوا محمد شاہ نے دو لاکھ فوج سے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ تین دن تک دلی میں قتل عام رہا۔ ستر کروڑ کا سامان اور تخت طاؤس لے کے واپس ہوا شہر اس طرح برباد ہوا کہ مدتوں آباد ہونے کی امید نہ رہی ٹیک چند بہار جس نے اپنی آنکھوں سے دہلی کو لٹتے دیکھا تھا یاں لکھتا ہے۔

"دریں ایام کہ در نہایت کیفیت و لطافت ہر کوچہ چون لف
بنفشہ مویان دل آویز و ہر محلہ ش برنگ نفس بلبلاں شور انگیز
بود گردیدہ از بوقلمونی ہائے تقدیر ایں گونہ چشم زخمے رسیدہ
اکنوں مانند زلف بتاں عمر طویلے می باید کہ دار العشق بحالت اصلی در آید"

اسی ہنگامے میں اودھ کے صوبیدار برہان الملک نے دہلی میں انتقال کیا اور ان کے داماد مرزا مقیم صفدر جنگ کو اودھ کا صوبہ ملا۔

دہلی پر تیسرا حملہ اس حملہ سے دہلی ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی ہر طرف بدامنی اور غارتگری کا دور دورہ تھا کہ احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء میں حملہ کیا مرزا مقیم صفدر جنگ شہزادہ احمد کو لے کے مقابلہ کو روانہ ہوئے۔ سرہند کے مقام پر معرکہ کارزار گرم ہوا سترہ دن کی سخت جنگ کے بعد ابدالی کو شکست دی۔ شہزادہ احمد کامیاب واپس ہوا پانی پت کرنال میں محمد شاہ کے مرنے کی خبر ملی صفدر جنگ نے بانس کی کھپچیوں کا تاج بنا کے موتیوں کی جھالر لگائی اور شہزادہ احمد کے سر پر رکھ کر ان کی شاہی کا اعلان کیا احمد شاہ نے ان کو وزارت عظمیٰ پر سرفراز کیا اور دہلی روانہ ہوئے۔

غازی الدین خاں اب امرا اور صفدر جنگ میں اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی کچھ دنوں کے بعد بادشاہ کی نظریں بھی ان سے پھر گئیں اور وہ

اپنے صوبہ پر واپس چلے آئے۔ غازی الدین خاں نے میدان صاف کے بادشاہ پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کی انھوں نے پھر صفدر جنگ کو بلوایا مگر وہ بیماری کی وجہ سے نہ جا سکے۔ غازی الدین خاں نے ناکارے اور بے دست و پا بادشاہ کو قید کر کے آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں۔

عالمگیر ثانی ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء میں عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھا کے سیاہ و سفید مالک بن گیا اسی سال صفدر جنگ کا انتقال ہوا اور شجاع الدولہ جانشین ہوئے۔

غازی الدین خاں بادشاہ کو لے کے پنجاب گیا اور ابدالی کے صوبیدار موسیٰ خاں کی ناکتخدا بہن سے نکاح کیا اور اس کی ماں سے زبردستی تیس لاکھ روپے وصول کر کے پنجاب کی صوبیداری ادینہ بیگ کو دے کے واپس ہوا۔

دہلی پر چوتھا حملہ ابدالی کو خبر ہوئی تو وہ ہندوستان آیا اور دہلی کو دو مہینے تک لوٹتا رہا اس طرح کہ:۔

"شہر را آتش زدہ خانہا سوختند ـــــ بقتل و غارت پرداختند دروازہا شکستند
اکثرے را سوختند و سرہا بریدند عالمے را بخون و خاک کشیدند
تا سہ شبانہ روز دست ستم بر نہ داشتند از خوردنی و
پوشیدنی ہیچ نگزاشتند سقفہا شگافتند دیوارہا شکستند
جگرہا سوختند و پشت سیرتاں بردرو بام اکابران بے سیری
تمام شیخان شہر را بحال خراب بزرگان محتاج دم آب
گوشہ نشینان بے جا شدند اعیان ہمہ گدا شدند وضیع و شریف
عریان، کدخدایان بے خانماں اکثر بہ بلا گرفتار سوائے کوچہ و
بازار . . . . ہفت ہشت روز ایں ہنگامہ گرم بود من کہ
فقیر بودم فقیر تر شدم عالم از بے اسبابی و تہیدستی ابتر شد (ذکر میر)

ابدالی نے محمد شاہ کی بیٹی سے شادی کی غازی الدین خاں کو وزارت سے معزول کر کے روہیلہ سردار نجیب اللہ خاں کو وزیرِ اعظم بنا کے واپس ہوا اس کے جاتے ہی غازی الدین خاں نے مرہٹوں کی مدد سے دہلی پر چڑھائی کی نجیب الدولہ بھاگ کے اپنی جاگیر پر چلا گیا۔ شاہزادہ عالی گوہر بنگال کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ نے مرہٹوں کی خوشامد سے اپنی شاہی برقرار رکھی اب پھر غازی الدین نے مرہٹوں کو لے کے پنجاب کو لوٹا اور وہاں مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا اسی طرح ہندوستان کے اکثر صوبے مرہٹوں کے قبضے میں آ گئے۔

دہلی پر پانچواں حملہ | روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں نے ساری روداد احمد شاہ کو لکھی اور اسے ہندوستان کی حکومت سنبھالنے کی دعوت دی اس نے حملہ کیا غازی الدین خاں سمجھا کہ عالمگیر ثانی نے مرہٹوں کے خلاف ابدالی کو بلایا ہے اس نے بادشاہ کو قتل کر کے لاش جنگل میں پھنکوا دی اور خود روپوش ہو گیا۔ اور ابدالی سے پانی پت کے میدان میں وہ تاریخی مقابلہ ہوا جس میں مرہٹوں کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا بے شمار مرہٹے مارے گئے۔

ابدالی دہلی کا تخت خالی چھوڑ کے واپس ہوا اب دہلی سکھوں، مرہٹوں، روہیلوں، جاٹوں اور پنڈاریوں کی لوٹ مار کا مرکز بن گئی یہ لوگ سمجھتے تھے کہ دلی والوں کے گھر دولت سے بھرے ہیں ان پر اتنی سختیاں کیں کہ آسمان کانپ گیا۔ مرہٹوں نے دیوان عام کی سونے کی چھت اکھاڑ لی۔

شاہ عالم | بادشاہ کے قتل کی خبر سن کے اس کے بیٹے عالی گوہر نے ۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء میں اپنی شاہی کا اعلان اور شاہ عالم لقب اختیار کیا ہے۔ اس وقت وہ بہار کے ایک موضع کھٹولی میں خیمہ زن تھا۔

بکسر کی جنگ | انگریزوں کا اقتدار بنگال میں قائم ہو چکا تھا بہار میں

پٹنہ تک ان کا قبضہ تھا۔ میر قاسم کو وہ بنگال سے نکال چکے تھے وہ شجاع الدولہ کے پاس مدد مانگنے آئے تھے۔

شاہ عالم نے پٹنہ سے انگریزوں کو نکال کے اس پر قبضہ کر لیا مگر انگریزی فوجوں نے آ کے ان کو شکست دے دی۔ شجاع الدولہ میر قاسم کو لے کے شاہ عالم کے پاس پہنچے اور بکسر کے مقام پر ۱۱۷۸ھ / ۱۷۶۴ء میں معرکہ ہوا جس میں شکست کھائی۔ شاہ عالم انگریزوں کے کیمپ میں چلے گئے اور ان سے معاہدہ کر کے بنگال و بہار اڑیسہ کی دیوانی اور بنارس و غازی پور تک، ایک تہائی حکومت کی سند ان کو دے دی اور خود الٰہ آباد میں آ کے مقیم ہو گئے۔

شجاع الدولہ مرہٹوں کو لے کے پھر انگریزوں کے مقابلہ پر آئے جس میں صلح ہوئی انگریزوں نے ان کا ملک چھوڑ دیا اور انھوں نے فیض آباد میں قیام کر کے اپنے کو ایسا مضبوط کیا کہ جو امن و امان اور خوشحالی یہاں تھی وہ ہندوستان میں کہیں نہ تھی۔

دہلی سے پنجاب تک مرہٹے پھیلے اور لوٹ مار مچائے تھے۔ ہر طرف سے لوگ فیض آباد کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے اور شجاع الدولہ انھیں آباد کرنے میں فخر اور مسرت محسوس کر رہے تھے۔

نجف خاں | ۱۷۷۱ء میں نجف خاں ایک ایرانی امیر بادشاہ کا وزیرِ اعظم ہوا۔ اس نے حالات کی درستی کی بہت کوشش کی بادشاہ کو دہلی لایا اہلِ دہلی جو اس وقت تک بے بادشاہ کے ہر قوم کی لوٹ مار کا نشانہ بنے ہوئے ان کی جان میں جان آ گئی۔

نجف خاں نے جاٹوں سکھوں اور روہیلوں کو زیر کیا اور مرہٹوں

اور انگریزوں سے تعلقات بڑھائے شہر میں امن قائم ہوا لیکن سنہ ۱۱۹۶ھ وہ [illegible] مر گیا۔

پیشوا اور سندھیا اب پیشوا وزیر اعظم اور سندھیا نائب وزیر بنا بادشاہ کے خرچ کے لیے پینسٹھ ہزار ماہوار مقرر کر دیا وہ مرہٹوں کے وظیفہ خوار بن گئے۔

دہلی پر چھٹا حملہ روہیلوں کو مرہٹوں کا یہ اقتدار کب گوارا ہو سکتا تھا غلام قادر خاں نے دہلی پر حملہ کیا شاہی فوج مرہٹوں سے ناراض تھی وہ روہیلوں کے ساتھ ہو گئی اور قلعہ پر قبضہ ہو گیا غلام قادر نے چاہا کہ متھرا پر فوج کشی کر کے مرہٹوں کی طاقت کا خاتمہ کر دے۔ سیتل داس خزانچی نے خزانہ خالی بتایا غلام قادر نے شاہ عالم پر سختی کی کہ روپیہ قبولیں مگر وہاں روپیہ کہاں تھا پہلے اس نے قید کیا پھر لاتوں گھونسوں سے مارا جب کسی طرح نہ قبولے تو سینے پر چڑھ کے آنکھیں نکال لیں بیگموں کو طمانچے مار مار کے لہولہان کر دیا۔ شہزادوں اور امیروں کو الٹا کر کے ٹنگوا دیا اور پشتوں کی گڑی ہوئی دولت قبولوا کے تہ خانے اور چھتیں کھدوا کے نکال لی۔

دہلی پر ساتواں حملہ شاہ عالم نے انگریزوں مرہٹوں اور آصف الدولہ کو امداد کے لیے لکھا آصف الدولہ نے ایک فوج اور کچھ رقم بھیجی ادھر سے سندھیا فوج لے کے آیا غلام قادر خاں بھاگ گیا مگر گرفتار ہوا پہلے اس کو گدھے پر سوار کر کے ایک ایک کوڑی بھیک منگوائی اس کے بعد زبان کٹوائی پھر آنکھیں نکالیں پھر ناک کان کٹوائے آخر میں ہاتھ پاؤں کٹوا کے لوتھڑا بادشاہ کے پاس بھیجدیا مگر وہ راستے ہی میں مر گیا لاش دہلی پہنچی جو گھورے پر پھنکوا دی گئی۔

ان ہنگاموں میں دہلی بار بار لٹتی رہی اور اہل دہلی پر وہاں کی زمین تنگ ہو گئی پوتڑوں کے رئیس روٹیوں کو محتاج ہو گئے انتشار کا بیان ہے کہ دہلی میں کم تر لوگوں کو نان شبینہ میسر ہوتی ہے۔ مثل مشہور تھی۔

شاہ عالم ثانی نہ چولھے پہ توا نہ گھڑے میں پانی

ادھر لکھنؤ میں چین برس رہا تھا اہل کمال سر اور آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے لوگوں نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ ہر طرح کے صاحبان فن وہاں چلے آئے اور دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا

اس دور میں میر۔ سودا۔ سوز۔ درد اور اثر ایسے اساتذہ پیدا ہوئے ان کا کلام اس وقت کے حالات کی تصویر ان کی پریشانی خوف و ہراس اور مردہ دلی کی تفسیر ہے ؎

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے	ان کو اس روزگار میں دیکھا	میر
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے	دل ہوا ہے چراغ مفلس کا	״
سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا	بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا	درد
وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا	یعنی کبھو تو اپنے بھی دل دماغ تھا	״
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے	ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے	״
جہاں کو فتنے سے خالی کبھی نہیں پایا	ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا	״

عاشقانہ مضامین بھی نہایت گھٹیا درجے کے مفلس عاشق و معشوق کی تصویر ؎

یاد آتا ہے ترے یار کی ایسی تیسی	آج آتا ہے ترے یار کی ایسی تیسی	سوز
جو کرتا ہوں فریاد میں اس کے آگے	تو کہتا ہے تاباں تو جاتا نہیں ہے	تاباں
ابھی پست ہو جائے گا لاتوں کے مارے	ترا شور کچھ مجھ کو بھاتا نہیں ہے	״

ابتذال کی حد ملاحظہ کیجیے ؎

سر سبز خط سے دونا ہوا حسن یار کا	آخر خزاں کے آئے کچھ نہ اگا تا بہار کا	سوز
دعا دی تو کہنے لگا دور رہو !	سنی میں نے دعا تیری دعا کی	״

کہا میں نے کہ کچھ خاطر میں ہو گا ۔۔۔ تمہارے ساتھ جو میں نے وفا کی "سو تو
تو کہتا ہے کہ بس بس جو پیچ کر بند ۔۔۔ وفا لایا ہے دت تیری وفا کی "

سندھیا سندھیا نے بادشاہ کو دوبارہ تخت پر بٹھایا کاروبار سلطنت اپنے ہاتھ میں لئے نو لاکھ سالانہ شاہی مصارف کے لئے معین کر دیے اور فی الجملہ دہلی میں امن قائم ہوا۔

بادشاہ نابینا انتظام سلطنت کے قابل کبھی نہ تھے ہاں شاعر تھے اُردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے لکھنؤ کے بعض امرار سیاسی وجوہ سے دہلی چلے گئے تھے اور شعر و سخن کی محفل جمائے ہوئے تھے ان میں شجاع الدولہ کے بیٹے امین الدولہ ناصر جنگ عرف مرزا مینڈو کے مشاعروں کی بڑی دھوم تھی۔ بڑا اہتمام ہوتا تھا ختم مشاعرہ پر دعوت عام ہوتی تھی ان مشاعروں میں بڑی رسا کشی ہوتی تھی ایک طرف انشاء اللہ خاں انشا برکت اللہ عشاق تھے دوسری طرف حکیم قدرت اللہ قاسم حکیم ثناء اللہ فراق مرزا عظیم اکثر تلواریں کھینچ جاتی تھیں اور نواب بیچ میں پڑ کر صلح کراتے تھے۔ بادشاہ سلامت کبھی اپنی غزل بھیجتے تھے ان کے درباری شاعر انشا، جرأت رنگین تھے جن کی شاعری کا خوبی ہے کہ ان کے یہاں حزن و یاس نامرادی اور ناکامی نہیں کیونکہ دہلی کے حالات بدل چکے تھے پھکڑپنے اور بازاری قسم کے مضامین نظم کئے جاتے تھے ؎

ادا اب جان لینی ہے جوانی تمہاری ۔۔۔ غضب ڈھا رہی ہے جوانی تمہاری "
یار آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا ۔۔۔ چمپئی رنگ اس کا اور جوبن گدرایا ہوا "
اس کی صحبت کیا کیجئے ملاقات کہیں اور ۔۔۔ دن کو تو معلوم ہے کہ رات کہیں اور "
دیکھ بوسہ مجھے چتون میں بتاتا ہے کہ نہیں ۔۔۔ ایسا پایا ہے کبھی تو نے مزہ اور کہیں "

یاد آتا ہے وہ میرا لگے جانا اور آہ ۔۔۔ پیچھے ہٹ کر اس کا یہ کہنا کوئی آ جائے گا
یاد جب آتا ہے یہ کہنا تو اڑ جاتی ہے نیند ۔۔۔ اپنی ہٹ تو رکھ چلے لو اب تو ہٹ کر سوئیے "
تنگ چلا میں جو شب وصل تو ہٹ کر بولے ۔۔۔ جھانکتا روزن در سے نہ ہو ہے ہے کوئی "
دو تین دن تو ہو چکے اب پھر چلو وہیں ۔۔۔ فیروز شہ کی لاٹ کے اس تخت کے کنگر پہ آج

امرد پرستی کے مضامین جو ہر دور میں رہے ہیں وہ ان بیہودہ گوئیوں کے علاوہ ہیں ۱۲۰۳ھ تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد یہ شعرا بھی لکھنؤ روانہ ہو گئے۔

دہلی پر آٹھواں حملہ چودہ برس تک شاہ عالم اسی عالم میں رہے ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک فوج لے کے آیا اور مرہٹوں کو نکال کے ایک لاکھ روپیہ ماہوار بادشاہ کا وظیفہ مقرر کر دیا اب "سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم" رہ گئی۔ شہر میں مکمل امن قائم ہوا چہل پہل پیدا ہوئی۔ مگر شعراء سب لکھنؤ چلے آئے دہلی میں کوئی قابل ذکر شاعر نہیں رہ گیا۔

لکھنؤ میں سعادت علی خاں حکمران تھے میر تقی میر۔ مصحفی۔ انشاء جرأت رنگین زندہ تھے آتش فیض آباد میں تھے اور کمسن تھے۔

دہلی میں ذوق تیرہ برس کے، غالب پانچ برس کے اور مومن تین سال کے تھے۔

لکھنؤ میں ناسخ کا ڈنکا بج رہا تھا مولانا عبدالقادر رامپوری اس زمانے میں لکھنؤ آئے تھے وہ اپنے سفر نامہ میں لکھتے ہیں۔

"شیخ امام بخش ناسخ کو ان دنوں اس میں دن دونی شہرت حاصل تھی ص ۱۶۰"

انھوں نے زبان و شاعری میں ایسی ایسی اصلاحیں کیں جن سے اس میں سنجیدگی اور حسن پیدا ہو گیا اور سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔

مصحفی ایسے کہنہ مشق استاد نے ان کی تقلید کی۔ غالب کا بیان ہے
کہ میری شاعری کی ابتدا تھی جب ناسخ کا دیوان دہلی پہنچا جس طرح
دہلی کے دیوان کی دھوم مچ گئی تھی اسی طرح لوگ ناسخ کے کلام پر
ٹوٹ پڑے۔ میں نے اور مومن نے ان کا اتباع کیا (جلوۂ خضر)

ناسخ کے اتباع سے ذوقی۔ غالب اور مومن کے کلام میں شاعرانہ رنگینی
پیدا ہوئی مگر کچھ بھونڈاپن باقی رہا جس کا خود غالب نے اعتراف
کیا کہ "میرے کلام میں جو محاورے غیر فصیح ہیں وہ دہلی کی زبان کا اثر ہیں"

شاعری میں بھی ایسی باتیں باقی رہ گئیں جنھیں ذوقِ سلیم برداشت
نہیں کر سکتا مومن کا یہ شعر زبان اور مفہوم دونوں کے لیے ڈھنگے پن
کی اچھی مثال ہے۔

سن کے میری مرگ بولے مر گیا اچھا ہوا ؎ کیا برا لگتا تھا جس دم سامنے آجائے تھا

معشوق کو رقیب نے سیم بر کہا تو اس نے پستان کھول کے دکھا دیے اس پر عاشق
صادق نے اس کی قباحت سمجھائی۔

غیر کو سینہ کہے سے سیمبر دکھلا دیا ؎ تم نے کیا کچھ کس کو اپنی بات پر کھلا دیا

عاشق کی بے غیرتی اور پست فطرتی کی حد دیکھیے۔

ہے شب وصل غیر بھی کاٹی ؎ اب مجھے آزمائے گا کب تک

ہونٹوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے ؎ غالب

بدمذاقی کا شاہکار ہے۔

پروسیۂ سفرۂ کباب دل سمندر کھینچ

لطف زبان اور حسن معنی کا نادر نمونہ ہے

گر نفس جادہ سر منزل تقوی نہ ہوا

اس میں تقوی راضی کا قافیہ اور بد ذوقی کی ایسی مثال ہے جس کا جواب اردو شاعری
میں نہیں ہے۔

دہلی پر لوٹاں حملہ دہلی میں بہادر شاہ ظفر لکھنؤ میں واجد علی شاہ اختر کا دور تھا اور
ناسخ و آتش کے شاگردوں کا ڈنکا بج رہا تھا۔ لکھنؤ میں انتزاع سلطنت ہوا اس
کے بعد ہندوستان میں غدر ہوا رہی سہی دہلی بھی لٹی ہزاروں بے گناہ جس طرح مارے
گئے اس کا ایک دن کا نظارہ لارڈ رابرٹس بیان کرتا ہے۔

"ہم صبح کو لاہوری دروازے سے چاندنی چوک میں گئے تو ہم کو
شہر حقیقت میں مُردوں کا شہر نظر آتا تھا کوئی آواز سوائے
ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں کے سنائی نہ دیتی تھی کوئی زندہ آدمی
نظر نہ آیا ہر طرف مُردوں کا بچھونا بچھا ہوا تھا جن میں بعض حالت
نزع اور جانکنی میں مبتلا تھے ہم چل رہے تھے تو بہت آہستہ
آہستہ بات کرتے تھے کہ ہماری آواز سے مُردے چونک نہ پڑیں۔
اس بات کے دیکھنے سے کہ ایک طرف مردوں کی لاشوں کو کتے کھا رہے
ہیں۔ دوسری طرف لاشوں کے آس پاس گدھ جو ان کے گوشت
کو نوچ کر مزے سے کھا رہے ہیں اور ہماری آمد کی آواز سے
کچھ اڑ کر تھوڑے فاصلہ پر جا بیٹھتے ہیں ہم کو بڑی عبرت ہوئی
اور ہمارا دل رنجور ہوتا جاتا تھا بہت سے مُردے ایسے پڑے
تھے کہ گویا زندہ ہیں بعض مُردوں کے ہاتھ اوپر کو اٹھے ہوئے
تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی طرف اشارہ کر رہے
ہیں غرض ان مُردوں کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی جیسے ہم کو
انکو دیکھنے سے ڈر لگتا تھا ویسے ہی ہمارے گھوڑے ان کو دیکھ کر

بدکتے اور ہنہناتے تھے مُردوں کی لاشیں پڑی تڑپتی تھیں ان
کے تنفس سے ہوا میں بیمار کرنے والی بدبو اٹھ رہی تھی۔"

ایک اور انگریز لکھتا ہے۔

"دہلی کے باشندے اگرچہ سب نہیں مگر آدھے باشندے بے تصور
شہر کے گرد و نواح دیہات اور جنگلوں میں پڑے ہوئے بلک
رہے ہیں۔ بحث ۱۹۵۲ء مرتبہ میاں محمد شفیع صفحہ ۲۱۷ تا ۲۱۸

ہندوستانیوں کا خون اس طرح بہانے کے بعد جب انگریزوں کا کلیجہ
ٹھنڈا ہوا تو شہر کی آرائش کی طرف متوجہ ہوئے محلے کے محلے اور بازار کے بازار
ڈھانے لگے اس سے بچے کھچے لوگوں کا ٹھکانا بھی نہیں رہا۔ مرزا غالب نے اپنے
خطوط میں دہلی کی اس تباہی کا نقشہ جابجا کھینچا ہے چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"یہاں شہر ڈھے رہا ہے بڑے بڑے بازار خاص بازار،
اُردو بازار اور خانم بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ
تھا اب پتہ نہیں کہ کہاں تھے صاحبان امکنہ و دکاکین نہیں
بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا برسات بھر مینہ برسا اب
تیشہ و کلند کی طغیانی سے مکان گر گئے۔"

"مرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو دلی کی تباہی پر تم کو رحم
نہیں آتا بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو یہاں نتیجہ بند تو میسر نہیں۔
صحاف اور نقاش کہاں ہیں؟"

ایک خط میں نواب علاء الدین احمد خاں کو دہلی کی تباہی کی داستان یوں لکھی ہے۔

"صاحب! کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ
دلی بڑا شہر ہے ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔

اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے وہ دلی نہیں
جس میں تم نے تحصیل علم کیا، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ
کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے، وہ دلی نہیں ہے جس میں
اکیاون برس سے مقیم ہوں ایک کیمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا
حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود معزول بادشاہ کے ذکور
جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں اناث
میں سے جو پیرزن ہیں کٹنیاں اور جوان ہیں کسبیاں ہیں امرائے
اسلام میں اموات گنو حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا۔
سو روپیہ روز کا پنشن دار۔ سو روپیہ مہینہ کا روزینہ دار بن کر
نامرادانہ مر گیا۔ میر نصیر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ۔ نانا اور نانی
کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں
کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا تھا بیمار پڑا نہ دوا، نہ غذا، انجام کار
مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی احیا کو پوچھو
ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا۔ اس کے پاس
ایک پیسہ نہیں ٹکے کی آمدنی نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے۔
مگر دیکھیے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے بڈھے صاحب ساری
املاک بیچ کر نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے
گئے، ضیاء الدولہ کی پانسو روپیہ کرایہ کی املاک واگزاشت
ہو کر پھر غرق ہو گئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔
دیکھیے کیا ہوتا ہے قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور
بلب گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔

شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔

ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے؟ جو حکما کا حال لکھا ہے وہ بیان واقع ہے علمار اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے ان کو بھی سچ جانو اپنے والد ماجد کی طرف سے خاطر جمع رکھو۔ سحر۔ آسیب کا گمان ہرگز نہ کرو خدا چاہے تو استعمال ایارجات کے بعد بالکل اچھے ہو جائیں گے اور اب بھی خدا کے فضل سے اچھے ہیں۔ یکشنبہ ۱۶ر فروری ۱۸۶۲ء

عافیت کا طالب غالب

رئیس احمد جعفری نے بہادر شاہ اور ان کا عہد ایک ضخیم کتاب لکھی ہے، اس میں غدر کے بعد کے حالات یہ لکھے ہیں:۔

دہلی غدر کے بعد | صدہا عورتوں نے بدکاری کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اول کو برقعہ اوڑھ کر مسافروں کی سراؤں کے گرد قطاروں کی قطاریں مسافروں کے بلانے کے انتظار میں بیٹھی یا کھڑی رہتی ہیں اور اس طرح دو چار پیسے صبح کو کما لاتی ہیں۔ بہت سی عورتوں نے اپنا سر منڈوا ڈالا اگر کوئی شخص کبھی ایک خمیری روٹی یا ایک مٹھی چنے کوڑیاں تقسیم کرتا تو صدہا مسلمان عورتیں جمع ہو جاتیں جن میں سے بعض صورتوں سے نجیب زادیاں معلوم ہوتیں جو خود کبھی صدہا روپیوں کی خیرات کرتی تھیں اب کوڑیاں مانگتی ہیں۔ جن کے آگے دو دو چار چار مامائیں کام کرتی تھیں اب خود ماماگیری کے قابل نہ رہیں۔ بعض بڑی عورتیں جن کی حسانیت پر فرنگیوں کو بھی رشک آتا تھا۔ اپنی خوش نصیبی سے بعض انگریزوں کے گھر بیٹھ گئیں دہلی میں پہلے بہت کم خانگیوں کے گھر تھے اشراف کبھی اپنے محلوں میں آباد نہیں ہونے دیتے یا پھر جب شہر آباد ہوا ہے تو ہر محلہ میں ایسے دو چار گھر ضرور تھے۔

منشی ذکاء اللہ کی زبانی | بہادر شاہ ظفر کی صاحبزادی احمدی بیگم کی داستان سنئے۔ احمدی بیگم کے شوہر مرزا منجھو جو غدر میں کام آئے بڑے دبدبے کے آدمی تھے ان کی سرکار بنی ہوئی تھی۔ بیسیوں آدمی ان کے دسترخوان پر بیٹھتے تھے دروازے پر نالکی پالکی موجود تھی۔ جب مرزا مارے گئے اور شہر کی حالت بگڑی تو بڑی بیگم نے اپنا اور بہو بیٹیوں کا تمام زیور خانم کے بازار والی حویلی میں گاڑنے .... کا ارادہ کیا پیڈیوں میں زیور بھرا ہوا تھا۔ ہزاروں کا مال تھا شہر کی کیفیت لمحہ بہ لمحہ ردی ہو رہی تھی عین شب برات کے روز یہ سب شہزادیاں کھڑی ہوئیں احمدی بیگم کی ضعیفی میرا بچپن تھا انھوں نے سو برس کے قریب عمر پائی۔ آخری دنوں میں وہ باہر نکلنے کے قابل نہ رہیں اور بہت تکلیفیں اٹھا کر یہ شہزادی دنیا سے اس طرح رخصت ہوئی کہ کفن تک میسر نہ ہوا ___ فالج نے بالکل بے کار کر دیا تھا چل پھر نہ سکتی تھیں اور کئی دموں کا گزارہ اس ایک دم کی محنت پر تھا۔

میری (منشی ذکاء اللہ) بارہ تیرہ برس کی عمر ہو گی کہ میری والدہ مرحومہ نے احمدی بیگم کا پتہ دے کر مجھے ایک روپیہ دیا کہ دے آؤ ___ میں گیا۔ شہزادی کے گھر میں مٹی کے ٹوٹے برتن تھے اور سردی کے موسم میں بادشاہ کی اولاد کی

اور سکڑی بیٹھی تھی۔ احمدی بیگم اس روپے کو دیکھ کر جس قدر خوش ہوئیں اور جو دعائیں ان کے منہ سے نکلیں اس کا اظہار مشکل ہے۔ اس وقت ہنستا ہو گیا اور ہنستا ہو آیا۔ مگر آج جب اس جھلنگا چارپائی کا خیال آتا ہے تو تڑپ جاتا ہوں۔

شہزادیاں کسبیاں بن گئیں وہ شہزادیاں جو جاہ و جلال کی زندگی بسر کر رہی تھیں طوائف اور کسبیاں بن گئیں۔

شہزادی نکاح باورچی سے متواتر فاقے رنگ دکھاتے ہیں کہ ربیعہ بیگم بہادر شاہ کی لڑکی کا نکاح حسینی باورچی سے ہوتا ہے ——— منشی ذکاء اللہ اس شادی کا ذکر طنز و تعریض کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

بہادر شاہ کی بیٹی ربیعہ نے اپنا نکاح حسینی باورچی سے اس لئے پڑھایا کہ روز تر دیگی[1] کھانے میں آئے گی۔ فاطمہ سلطان جس کے باپ کے سر پہ تاج شاہی رکھا جاتا تھا مشنریوں کے زنانہ اسکول میں وظیفہ دار بن کے معلمی کا پیشہ سیکھا ص ۹۸۴ تا ۹۸۶

میں نے دہلی کی تباہی کی داستان ذرا تفصیل سے اس لئے بیان کی ہے کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ دہلی کی صرف رونق اور دولت ہی نہیں لٹی بلکہ اخلاق بھی تباہ ہو گیا۔ ان حالات میں تہذیب و تمدن اور سیرت و کردار زبان اور خیالات میں بلندی کہاں سے آتی۔

---

[1] تر دیگی غلط ہے تہ دیگی ہونا چاہیئے۔

لکھنؤ کے تمدن کا پس منظر

یہ بتایا جا چکا ہے کہ شاعری تمدن کا آئینہ ہے اور تمدن نام ہے طرز زندگی میں نفاست و شائستگی کا جس کی انسانی فطرت دلدادہ ہے وہ ہر نفیس اور شائستہ بات کو فوراً قبول کر لیتی ہے۔

ایران کا تمدن معاشرت کی اسی نفاست سے ایران کی تہذیب ساری دنیا پر فائق ہے کوئی قوم ایسی نہیں جس نے اس سے کچھ نہ سیکھا ہو عربوں نے ایران کو فتح کیا مگر اس کی تہذیب کے آگے سر جھکا دیا۔

ہندوستان میں جن مسلمانوں نے حکومت کی وہ افغانستان و ترکستان کے مغل اور پٹھان تھے ایرانی کوئی نہ تھا مگر شان و شوکت رعب و داب تہذیب و شائستگی نفاست و پاکیزگی میں ایران کی نقل کرتے تھے یہاں تک کہ درباری آئین اور سرکاری زبان فارسی تھی فارسی ادب ان کا قومی ادب تھا فارسی شاعری ان کی شاعری تھی گلستان بوستاں شاہنامہ سکندر نامہ یوسف زلیخا ان کی درسی کتابیں تھیں فارسی خط ان کا خط تھا ایرانی کھانے ان کے دسترخوان کی لذت تھے اور مغلوں کے زمانہ میں تو ایرانی ہی طبیب و شاعر منجم و فلاسفر فاتح ملک مدبر سلطنت حکومت کی شان اور ملک کا استحکام تھے جو عالم طبیب شاعر سپاہی خطاط ایران سے آیا ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اعلیٰ عہدہ و منصب پر فائز ہو گیا۔ ایران ولایت اور ایرانی ولایتی کہا جاتا تھا جس میں عظمت و برتری کا مفہوم مضمر تھا۔

ہمارا سفر ایران سنہ ۱۹۵۴ء میں عراق کے راستہ سے میں ایران گیا بغداد سے ایک ایرانی ہمارے ہم سفر ہوئے اتفاق سے ہم اور وہ بس میں ایک سیٹ پر

بیٹھے کھڑکی کی طرف وہ تھے۔ جب وہ کسی ضرورت سے جاتے تو پہلے اپنے جوتے اتار کے ہاتھ میں لیتے پھر میرے زانوں کو نانگھتے اسی طرح آتے وقت وہ زحمت اٹھاتے میں نے کہا بھی کہ اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے مگر انہوں نے گوارا نہیں کیا۔ جب میں نے ان کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ آقائے علی نقی فلسفی کے بھائی ہیں اور میرے متعلق انھیں ایک پاکستانی مسافر ہونے کا علم تھا اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک عام آدمی کے ساتھ ان کا یہ مہذب برتاؤ انسانیت کا احترام تھا۔

خانقین ہمارا سفر جاری رہا غروب آفتاب کے وقت ہم عراق کی سرحدی چوکی خانقین پہنچے وہاں آمد و رفت کو دخول و خروج سُنا وہاں سے تین چار کوس پر

مورد خسروی ایران کی سرحدی چوکی مورد خسروی میں صدور و خروج سننے میں آیا اور ایرانیوں کی پاکیزگی ذوق کا اندازہ ہوا صدور و ورود بھی عربی لفظیں ہیں اور دخول خروج میں ذم کا پہلو بھی عربوں کے محل استعمال کے موافق ہے مگر انھیں اس کا احساس نہیں ہوا۔

گل زمین ایران اب ایران میں ہمارا سفر شروع ہوا رات ہو چکی تھی اس وجہ سے مورد خسروی سے صبح تک کی مسافت کا علم نہیں صبح کو جس چیز نے سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا وہ نہروں آبشاروں درختوں پھولوں اور سبزے کی فراخی تھی چوراہوں پر ایک دائرہ میں سبزہ درخت، پھول اور حوض نظر آیا۔

اہل ایران کی نفاست پسندی حوض پر ایک تختی پہ لکھا تھا "نظافت را مراعات دارید" اور ہم نے کسی کو حوض پر منہ ہاتھ دھوتے یا وضو کرتے نہیں دیکھا پانی الگ لے جا کے منہ ہاتھ دھوتے ہیں۔ اس سے جہاں ملک نہروں آبشاروں درختوں اور پھولوں سے بہشت نظر آیا وہاں اس کے باشندوں کی طبعی نفاست کا اندازہ بھی ہوا کہ انھوں نے طہارت کو کافی نہیں سمجھا نظافت کو ضروری سمجھا جس کی فطرت میں نفاست ہوتی ہے اس کے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے زبان و خیالات میں بھی نفاست ہوتی ہے اور کسی چیز میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جسے کہیں ہم بھونڈا پن کہیں ابتذال کہیں چھچھورا پن کہیں بے سلیقگی کہیں بازاریت کہتے ہیں ایرانیوں کی ہر بات نفاست میں ڈوبی ہوئی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے ان کے تمدن کو ساری دنیا سے ممتاز کیا ہے اس میں فطرت نے بھی ان کا ساتھ دیا ہے۔

ہر گھر میں قدرتی نہر کی ایک پتلی سی شاخ گزرتی ہے جس سے ہر وقت سرد و شیریں صاف اور تازہ پانی ملتا ہے۔

گھر پھولوں سے بھرے ہیں دیواروں پر بیلیں چڑھی ہیں، خانہ باغ، پائیں باغ انہیں کی زبان کی لفظیں ہیں جو ان کے تمدن کا آئینہ ہیں راستے اور گلیاں پھولوں اور درختوں سے گلزار ہیں رنگ اور پھول ان پر برس رہا ہے قالین پر بیل بوٹے دروازوں پر پھول پتیاں اینٹوں پر گل بوٹے مکان کی جالیوں میں پھول زمین پر گل کاری (ٹائل) در و دیوار پر نقش و نگار صنادید عجم کی یادگار ہے ان کی زبان میں رنگینی ہے ان کی شاعری میں رنگ اور پھول سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ آنکھ نرگس، چہرہ گلاب، جسم یاسمین، دہن غنچہ، لب برگ گل، ہنسی خندۂ گل، قد سرو، زلف سنبل ہے۔ یہ استعارے ایران سے تمام دنیا میں پھیلے۔

مہندی گلاب اور نرگس ایران کی خاص چیزیں ہیں۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے لکھا ہے۔

" ہندوستان کے قدیم ہندو لٹریچر میں عورت کے سولہ سنگھار میں مہندی نہیں یہ ہندوستان کی چیز نہیں ہے مسلمانوں کے ساتھ آئی ہے۔

فارسی شاعری میں اس سے جیتے مضمون پیدا کئے گئے ہیں وہ کسی اور زبان میں نہیں ہیں نرگس اور گلاب وہاں کا خاص پھول ہے نرگس کو کہیں اور کی آب و ہوا راس نہیں آئی اس لئے اس نے ایران سے باہر قدم نہیں نکالا گلاب ہر جگہ پہنچا مگر ایران میں اس کا جس جس طرح استعمال ہوا کہیں نہ ہو سکا وہاں اسے گل کہتے ہیں یہ تمام پھولوں کا سرتاج ہے اس کا رنگ آنکھوں میں کھب جاتا ہے اس کی خوشبو مشام کو معطر دل میں سرور آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کرتی ہے۔ بلبل مست ہو کے چہکنے لگتی ہے اور اس کے قریب بیٹھ کے اس کی مستی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ رات رات بھر بولتی ہے۔

گلے کے ہار میں اس کا پیوند ہار کو بھاری بھرکم بنا دیتا ہے گلدان میں دوسرے پھولوں کے ساتھ رعایا میں بادشاہ معلوم ہوتا ہے شاعری میں تشبیہ و استعارہ ہے اس کا عرق کھانوں کو معطر کرتا ہے محفلوں کو بساتا ہے مریضوں کی دوا ہے زبان میں اس کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے سیکڑوں مرکبات ہیں تنہا گل کے کئی معنی ہیں۔ گلابی کے کئی مفہوم ہیں ہر اچھی چیز اس سے تعبیر کی جاتی ہے اچھی صورت گل رو گل رخسار گل عذار گل چہرہ خوبصورت جسم گل اندام گلبدن اچھا لباس گل پیرہن اچھی بات گل فشانی گل پاشی گل ریزی اچھی آواز گلبانگ۔ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کے سابقے لاحقے اتنے زیادہ ہوں۔

لاحقے | گلاب، گل آفتاب، گلابی، گل بو، گل بازی، گل برگ، گل بن، گل بیگانہ، گلبانگ، گل پاپوش، گل پاشی، گل پوش، گل پیادہ، گل تر، گل تراش، گل تسبیح، گل چیں، گلچین، گل زرد، گلدام، گل دام، گلدار، گل دوز، گل رعنا، گل رنگ، گل زمین، گلزار، گلستان، گل شمع، گل شکر، گلشن، گل صبح، گلفام، گلقند، گلکار، گل کدہ، گلگوں، گلگونہ، گل میخ، گل مہتاب، گلنار، گل دشت، گلی۔ گل چشم۔ گل کفش۔ گل خودرو۔ گل رستہ۔ گل نورستہ۔ گلدان۔ گل شب افروز۔

سابقے | برگ گل، تبسم گل، خندہ گل، عرق گل، غنچہ گل، دامن گل، زر گل، بوئے گل، نکہت گل، شمیم گل، فصل، موسم گل، سبد گل، قبائے گل، جامۂ گل، رنگ گل، روغن گل، ساغر گل۔

محاورے | گل گفتن، گل دیگر شگفتن، گل گشتن، گل در آب کردن، گل دادن، گل گل شگفتن، گل خوردن۔

اب معلوم ہوا کہ وہ دنیا کو گلشن ایجاد کیوں کہتے ہیں۔

رنگ اور ایرانی | یہی عالم رنگ کا ہے ہر اچھی چیز رنگین ہے، رنگین نوا، رنگین سخن، رنگین زبان، رنگین بیان، رنگین شعر، رنگین ادا، بہت سے محاورے ہیں۔ رنگ بروے آوردن، رنگ ریختن، رنگ زدن، رنگ بستن، رنگ شکستن، رنگ بر آب ریختن، رنگ گرفتن، رنگ گذاشتن، رنگ نہادن، رنگ ماندن، رنگ چسپیدن، رنگ مالیدن، رنگ پوشیدن، رنگ خندیدن، رنگ برخاستن، رنگ گسیختن، رنگ گرداند، رنگ جستن، رنگ، رنگ بردن وغیرہ غرض رنگ و بو کا ایک سیلاب ہے اور دنیائے رنگ و بو اسی سے تعبیر ہے اس طوفان رنگ و بو میں پلنے والے اپنی شاعرانہ طبیعت سے روزانہ نئی تشبیہیں اور استعارے پیدا کرتے رہتے ہیں۔

خراسان میں ایک لڑکا دو گلدان ہاتھ میں لئے بیچ رہا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ ہم گل و ہم گلدستہ، گلدستہ کے لئے ہم نے یہ فقرہ نہیں سنا تھا۔

اہل ایران کی ایجادیں | دنیا میں ہزاروں چیزوں کے وہ موجد ہیں اور اس دور ترقی میں بھی ان کی بہت سی ایجادوں پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا جام و صراحی تخت و تاج دربار اور اس کے آئین ساری دنیا نے ایران سے سیکھے کافوری شمعیں، شمعدان اور فانوس ان کی نفیس طبیعت اور پر ایجاد ذہن کی پیداوار ہے۔ بیمارستان (اسپتال) دنیا میں سب سے پہلے ایران (جند شاپور)

ہیں بنا اور طب یونانی وہیں سے ساری دنیا میں پھیلی۔

دنیا میں سب سے پہلے مشین ایرانیوں نے ایجاد کی۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ میر فتح اللہ شیرازی نے آلۂ جر ثقیل مشین گن (ایک راؤنڈ میں بارہ فیر کرنے والی بندوق) قلعہ شکن توپ ہوا سے چلنے والی چکی ایجاد کی۔

خط نستعلیق ایرانیوں نے ایجاد کیا جب ایران میں عربی خط (نسخ) رائج ہوا تو اس کی ناہمواری اہل ایران کی نفیس اور حسن پرست طبیعت پر بار ہوئی انھوں نے اس میں گول دائروں اور نوک پلک سے حسن پیدا کیا اور اس کا نام نسخ تعلیق رکھا کیوں کہ وہ نسخ پر تعلیق تھی "خ" ثقل کی وجہ سے خارج ہو گئی اور نستعلیق رہ گیا پھر اس میں جدتیں پیدا کیں اور اس کی بہت سی قسمیں ایجاد کیں خط گلزار خط ماہی، خط غبار، خط طغرا، خط ریحان، خط شفیعہ وغیرہ اور ہر خط کو مضمون کی مناسبت سے استعمال کیا۔

نسخ کو بھی انھوں نے اس کی حالت پر نہیں چھوڑا اس میں بھی ایک حسن پیدا کیا گویا اونٹ کو بنا سنوار کے دلہن بنا دیا۔ مکانوں کی جالیاں اور ٹائل کی زمین ان کی اختراع ہے۔

قالین کی ایجاد بھی ان کی حسن پسند طبیعت کا کارنامہ ہے انہوں نے جیسے قالین بنائے دنیا میں کہیں نہ بن سکے آج بھی وہ اعلیٰ تمدن کا اہم جزو ہے اور اس سے بہتر کوئی ایجاد اب تک نہیں ہو سکی سفید فرش اور اس کا نام چاندنی نورجہاں کی اختراع ہے۔ عطر بھی اس کے حکم اور تجویز سے بنا اس سے پہلے مشک رکھتے اور غالیہ (خوشبودار بوٹی) بالوں میں ملتے تھے درختوں میں پیوند کاری بھی انھوں نے ایجاد کی۔ راستوں میں میلوں کے نشانات اور کارواں سرائیں انھوں نے بنائیں۔ کھانے میں پلاؤ زردہ مزعفر متنجن شیر برنج انہیں کی ایجاد ہے۔

شاعری میں غزل، رباعی اور مثنوی کے وہ موجد ہیں۔

ایران کے تمدن میں انقلاب صفویوں کے زمانہ میں ایرانی تمدن میں انقلاب آیا شیعیت اس میں شدت سے داخل ہوئی اہلبیت سے عقیدت میں ترقی ہوئی شعراء کو مدح اہلبیت میں قصائد اور مصائب میں مرثیہ لکھنے کی ہدایت ہوئی اور اس پر بڑے صلے دیئے گئے علماء کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا یہاں تک کہ سلاطین ان کے سامنے تخت و تاج پیش کر کے ان کی نیابت میں امور سلطنت انجام دیتے تھے اپنی بیٹیوں کی شادی ان کے ساتھ کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلبیت مرکز عقیدت بنے صوفیت و امرد پرستی کا خاتمہ ہوا خانقاہیں ویران ہوئیں مجلس و ماتم نذر و نیاز اور تعزیہ داری کو فروغ ہوا۔ یہی زمانہ ہندوستان سے روابط بڑھنے کا تھا شاہ اسمٰعیل نے بابر کی اور شاہ طہماسپ نے ہمایوں کی مدد کی جس کے نتیجہ میں ترکستان افغانستان اور ہندوستان میں ان کی حکومت قائم ہوئی بابر اور ہمایوں سے قریبی تعلق رکھنے والوں کا بیان ہے کہ یہ دونوں شیعہ ہو گئے تھے[1] ان کے زمانہ میں ہر شعبہ میں ایرانی نظر آتا تھا اور اپنی صلاحیتوں سے سب پر چھایا ہوا تھا۔

ہندوستان کا قدیم تمدن ہندوستان کے قدیم تمدن میں ہاتھی کی سواری کو بڑی اہمیت تھی اور اس میں شک نہیں کہ اس سے زیادہ شاندار سواری دنیا میں کوئی نہیں۔ جامہ مختلف قسم کی پگڑیاں۔ مٹھائیاں۔ کھانوں میں پوریاں کچوریاں مال پوا دہی بڑے پھلکیاں مزیدار چیزیں تھیں۔ پان بھی یہاں کی خاص چیز ہے جس سے کسی وقت منہ میٹھا پھیکا نہیں رہتا۔ طوائفیں بھی یہاں کی

---

[1] محمد اکبر جوہر ہمایوں کے آفتابہ بردار نے ہمایوں نامہ ایک مستقل کتاب اس موضوع پر لکھی ہے جس میں ان دونوں کو شیعہ ثابت کیا ہے یہ کتاب حیدرآباد دکن اور کراچی میں چھپ چکی ہے۔

دنیا بھر سے الگ بڑی خصوصیتوں کی حامل تھیں جنسی تسکین کے علاوہ شادی بیاہ اور تفریحی محفلوں کا وہ لازمی جزو تھیں ان کا گانا اور ناچنا یہاں کی محفلوں میں ایک سماں باندھ دیتا تھا وہ امراء اور رؤسا کی مقرب اور ان کی تفریح کا سامان تھیں شادی بیاہ کی بھی بہت سی رسمیں یہاں مخصوص تھیں ان سب کو مسلمانوں نے اور ان کی بہت سی باتیں ہندوؤں نے اختیار کر لیں اس طرح ایک مخلوط تمدن قائم ہوا۔

لکھنؤ کا تمدن

برہان الملک سید محمد امین ایرانی امیر زادے جوانی میں بیوی سے خفا ہو کر اپنے وطن نیشاپور سے نکلے اور ہندوستان کا رخ کیا یہاں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے بہت جلد بلندی پر پہنچ گئے پہلے سعادت خان پھر برہان الملک بہادر جنگ خطاب ملا ۱۱۳۲ھ میں اودھ کے صوبیدار ہوئے ان کے ساتھ بہت سے ایرانی سپاہی اور سردار جو دہلی میں بیکار پڑے تھے لکھنؤ آئے جب یہاں ان کا تسلط ہو گیا تو اپنے اہل خاندان اور لواحقین کو ایران سے بلوا لیا اس طرح لکھنؤ میں ایک چھوٹا سا ایران آباد ہو گیا یہ لوگ صفوی دور کے ایرانی تھے جو شیعیت میں بہت سخت اور رسم عزا کی بجا آوری کا بڑا اہتمام کرتے تھے اب لکھنؤ میں بھی مجلس و ماتم ہونے لگا جس طرح ایران میں ہوتا تھا۔ اس کی ترقی دیکھ کے دہلی کے مشہور مرثیہ گو حیدری لکھنؤ چلے آئے ان کی مرثیہ خوانی خوب چمکی اور لکھنؤ میں پہلے پہل شیعیت نمودار ہوئی۔ اس سے پہلے کوئی شیعہ نہ تھا اودھ کے مشہور فلسفی ملا احمد اللہ شیعہ ہو گئے اور ان سے متاثر ہو کے بعض اور لوگوں نے بھی شیعیت اختیار کر لی۔ برہان الملک خود شاعر تھے اور بہت اچھے شعر کہتے تھے ان کے گرد علماء و شعراء کا مجمع رہتا تھا۔

اور سب ان کی قدردانی سے خوشحال تھے۔ کئی شاعر ایران سے آئے اور ان کی مصاحبت میں داخل ہوئے۔

اب لکھنؤ میں جو تمدن قائم ہوا اس میں دہلی سے زیادہ شائستگی اور نفاست تھی کیونکہ یہاں ایران کی نقالی نہ تھی بلکہ اصل ایران آ گیا تھا جس میں شیعیت نمایاں تھی برہان الملک نے سولہ برس اودھ پر حکمرانی کی ۱۱۵۲ء میں زہر باد سے دہلی میں انتقال ہوا۔

صفدر جنگ برہان الملک نے اپنے بھانجے مرزا مقیم کو ایران سے بلوا کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا وہ ابو المنصور خاں صفدر جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ پانچ سال تک مہمات سلطنت میں شریک رہنے کے بعد اپنی بیٹی صدر جہاں بیگم سے ان کی شادی کی برہان الملک کے بعد وہ اودھ کے صوبیدار اور ابدالی کو شکست دینے کے صلہ میں ہندوستان کے وزیر اعظم ہوئے۔ ملکی نظم و نسق اور شجاعت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے تمام مورخین ان کی بہادری پر متفق ہیں۔ خود بھی شاعر اور شعراء کے قدردان تھے ایک ایک شعر پر ہزاروں روپیہ انعام دیتے تھے علماء اور صاحبان کمال کے مرجع تھے خوش رو و خوش خلق شان و شوکت اور خوش پوشاکی میں مشہور تھے ان کے ہاتھیوں کے گنگا جمنی جھولے کارچوبی جھولیں گھوڑوں کے گنگا جمنی ساز و یراق کی ہندوستان بھر میں شہرت تھی میر تقی میر نے ذکر میر میں لکھا ہے کہ "ان کی شان و شوکت بادشاہ سے بھی زیادہ تھی ان کی فوج کے سپاہیوں کی بانات کی وردیاں تھیں اسلحے سے لیس گھوڑے ساز و یراق سے آراستہ تھے دنیا بھر کے سپاہیوں سے زیادہ ان کی تنخواہ تھی اس پر بھی وہ جیالے نوجوانوں کو خفیہ تنخواہ دیتے تھے اور سپاہیوں پر عام بخشش بھی کرتے تھے اس کی شہرت سن کے

نادر شاہ کی فوج کے بہت سے سپاہی اور سردار ہندوستان آکے ان کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔

سخاوت میں بھی وہ مشہور تھے کوئی ان کی داد و دہش سے محروم نہ تھا۔

شام اودھ

اجودھیا کے قریب برہان الملک کی فوجی چھاؤنی بنگلہ کو انھوں نے ترقی دے کے شہر بنا دیا اور ایران کے ایک شہر کے نام پر اس کا نام فیض آباد رکھا اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہندوستان میں سہ پہر کو بازار بند ہو جاتے تھے ایران میں اسی وقت بازار گرم ہوتا تھا اور گیارہ بارہ بجے رات تک چہل پہل رہتی ہے۔ یہی حالت فیض آباد کی بھی تھی یہی شام اودھ ہے جو ہندوستان میں ایک انوکھی بات ہونے کی وجہ سے مشہور ہو گئی۔

سنہ ۱۱۶۵ھ میں ان کو زہر باد ہوا نہایت کرب میں مبتلا تھے مگر اتنا تحمل تھا کہ اس کا اظہار نہیں ہوا انتقال کے بعد لوگوں کو ان کی قوت برداشت پر حیرت ہو گئی کہ مرنے سے کچھ پہلے وہ بڑی شان و شوکت اور سکون وقار سے بیٹھے دیکھے گئے تھے۔

ان کے زمانہ میں شان و شوکت خوش پوشا کی لکھنؤ کے تمدن میں داخل ہو ئی اور ان کے بعد اذیت کا تحمل اہل لکھنؤ کی وضع بن گیا کراہنا اور ہائے وائے کرنا بزدلی سمجھا جانے لگا۔

جنگ شجاع الدولہ

سنہ ۱۱۶۵ھ میں جلال الدین حیدر شجاع الدولہ اپنے والد منصور کے بعد حاکم اودھ ہوئے۔ فنون حرب اور جسمانی قوت میں یکتائے زمانہ تھے ایک ضرب میں بھینسے کی گردن اڑا دیتے تھے گوسفند کا کلہ چیر ڈالتے تھے۔ روپے کے حرف چٹکی سے مسل کے مٹا دیتے تھے انھوں نے فوج کی تعداد بڑھائی توپ اور بندوق ڈھالنے کے کارخانے قائم کئے عام طرز زندگی

میں سپاہیانہ بانکپن پیدا ہوا اور فیض آبادی آن مشہور ہوئی ایرانی طرز کے چار سو باغ اور سیر گاہیں بنائیں جن کی اتنی شہرت ہوئی کہ شاہ عالم ان کو دیکھنے آئے۔

شعر و سخن کے دلدادہ اور اہل کمال کے قدر دان تھے دہلی کی ابتری سے اہل کمال نے فیض آباد کا رخ کیا اور انہوں نے ان کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ان باتوں میں اپنے پیش روؤں سے بڑھ کے قدم مارا

وہ ایرانی ہونے کے ساتھ ساتھ دہلوی بھی تھے ان کی بیوی اور ماں ایرانی باپ کی بیٹیاں ضرور تھیں مگر دہلی میں پیدا ہوئی تھیں خود شجاع الدولہ نے دہلی میں آنکھ کھولی۔ امرائے دہلی کے اکثر ذوق ان میں موجود تھے رقص و سرود جانوروں کی لڑائی ان کی بہترین تفریح تھی ارباب نشاط سے دلچسپی کی شہرت دور دور پہنچی کشمیر کلکتہ اور اطراف ملک سے اتنی حسین و جمیل طوائفیں آئیں کہ ان سے فیض آباد کی گلیاں کوچے بھر گئے۔ کسی عورت کو شہر سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی اس حکم میں طوائفوں پر پابندی مقصود تھی وہ اپنے کو قید نہ سمجھیں اس کے لئے ان پر طرح طرح کی نوازشیں ہوئیں اور بغیر کسی خدمت کے انعام و اکرام کا دستور قائم کیا کہ وہ خوش اور مطمئن رہیں۔

سیر و شکار میں عموماً سبھی ارکان سلطنت فوج کا ایک بڑا حصہ شہر کے خوش باش امیر رسد کے لئے ہر طرح دوکاندار ساتھ ہوتے تھے ہر منزل پہ بازار لگ جاتا طوائفوں کے ڈیرے نصب ہو جاتے اور جنگل شہر بنجاتا۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ طوائفوں کی کتنی کثرت تھی اور وہ زندگی کا ایک جزو بن گئی تھیں۔

ان کے گھر میں ایرانی فضا تھی ان میں متانت و وقار سنجیدگی اور

بلند نظری تھی طوائفوں سے اتنی دلچسپی اور قدردانی کے بعد بھی انہیں تہذیب و متانت کے حدود سے تجاوز کی اجازت نہ تھی وہ یہاں آ کے پہلے تہذیب سیکھتیں ادب تعظیم کے طریقے دیکھتیں اس کے بعد کسی رئیس کے سامنے آنے کے قابل ہوتیں۔

شجاع الدولہ کے سالے سالار جنگ کھانے کے بڑے شوقین تھے ان کی وجہ سے اہلِ لکھنؤ میں کھانے کا ذوق پیدا ہوا دور دور سے باورچی آئے اور بڑے لذیذ و تکلفی کھانے پکنے لگے۔

مذہبی حیثیت سے ہندو مسلمان دو فرقے تھے جنہوں نے ایک دوسرے کے بہت سے رواسم اختیار کر رکھے تھے۔

سنی شیعہ کی تفریق نہ تھی شیعہ تھے تو مگر کوئی علیحدہ قوم نہ تھے نکاح طلاق دفن کفن سب اہلِ سنت کے طریقہ پر ہوتا تھا نماز جماعت وغیرہ کچھ نہ تھی کیونکہ کوئی شیعہ عالم نہ تھا۔

مذہبی رواسم میں پیری مریدی عرس قوالی بڑے پیر کی فاتحہ میراں جی کے گلگلے شیخ سدو کا بکرا سید احمد کبیر کی گائے مدار صاحب کی کندوری سید سالار کا جھنڈا شیعہ سنی دونوں کے مذہبی رواسم تھے۔

محرم میں دس دن تعزیہ داری بھی سب مل کے ایک ہی طریقہ پر کرتے تھے۔ صرف شجاع الدولہ کا علم عام طریقہ کے خلاف اٹھتا تھا لمبی چھڑ میں بڑا سا علم اس کی گردن میں گریبان کے بیچ کا حصہ مضبوط بندھا ہوا جس کے دونوں سروں پر زرتار لٹکتی ہوتی تھی اس سے کچھ نیچے چھوٹی سی مشک اس کے نیچے پرچم اس کے نیچے پھریرا سیاہ یا سفید شہاب چھڑکا ہوا شجاع الدولہ یہ علم لے کے سیاہ لباس میں سر برہنہ پا برہنہ

ماتم کرتے نوحہ پڑھتے گشت کرتے تھے۔

عزاداری کا یہ طریقہ شجاع الدولہ کے زمانہ سے شیعوں میں رائج ہو گیا۔ سپاہیانہ بانکپن خوش پوشاکی خوری شان و شوکت تہذیب و متانت کرب و اذیت کی اتنی برداشت کہ اس کا اظہار نہ ہو شعر و شاعری کے ساتھ رقص و سرود اور اربابِ نشاط سے دلچسپی لکھنؤ کے تمدن میں داخل ہوئی۔ ۱۱۸۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

آصف الدولہ

شجاع الدولہ کے فرزند اکبر مرزا یحییٰ آصف الدولہ رستم جنگ ۱۱۸۸ھ حکمراں ہوئے ایک سال کے اندر فیض آباد چھوڑ کے لکھنؤ چلے آئے اور باون گاؤں ملا کے اس کو وسیع کیا نئے محلے عمارتیں اور باغ ایسے عالیشان اور اتنی کثرت سے بنوائے کہ لکھنؤ دنیا کا سب سے بہتر شہر سمجھا جانے لگا۔ بڑے دیندار سخی بہادر شاعر اور فنِ تاریخ و سیر میں کامل تھے۔ ان کے زمانہ میں بڑے بڑے اہلِ کمال لکھنؤ آئے اور شعر و سخن کا ذوق بڑھا۔

ان کو تعزیہ داری سے بڑی دلچسپی تھی اپنا عظیم الشان امام باڑہ بنوایا محرم میں وہ تعزیہ کی زیارت کو نکلتے تھے ہر تعزیہ پر کچھ چڑھاتے تھے یہ طریقہ عام ہو گیا رؤسا نے بھی اسے اختیار کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا شہر تعزیہ خانہ بن گیا مجلسیں بڑے اہتمام سے ہوتی تھیں ایران تک سے حدیث خواں واقعہ خواں روضہ خواں اور کتابخواں آئے۔

پہلے شیعہ مجتہد

ان کے زمانہ میں مولانا دلدار علی (غفرانمآب) عراق و ایران سے مذہبی علوم کی تکمیل کر کے آئے اور لکھنؤ میں قیام کر کے شیعوں کی جمعہ و جماعت قائم کی نکاح طلاق دفن کفن سب ان کے طریقہ پر ہونے لگا۔

شیعیت اور صوفیت میں کوئی حد فاصل نہ تھی علمائے عراق نے اس موضوع پر کچھ نہیں کہا علمائے ایران میں ملا محمد باقر مجلسی نے ایک ہلکی سی روشنی ڈالی۔ علامہ محسن کاشانی صاحب تفسیر صافی قوالی کے جواز کے قائل تھے۔ قاضی نور اللہ شوستری نے بھی صوفیا کی بڑی حمایت کی ہے شیخ علی حزیں بھی صوفیت کے حامی تھے۔

غفرانمآب پہلے شیعہ عالم ہیں جنھوں نے آصف الدولہ کے زمانہ میں صوفیت کے خلاف مہم کا آغاز کیا ایک مستقل کتاب (شہاب ثاقب) لکھی اور تقریر و تحریر سے یہ ثابت کیا کہ صوفیت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں صوفیا گمراہ ہیں سوائے آئمہ اہلبیت کے کوئی مرکز عقیدت بننے کے قابل نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا عرس، قوالی بڑے پیر کی فاتحہ شیخ سدو کا بکرا ابو جمہ کبیر کی گائے غازی میاں کا جھنڈا اور چادر۔ گاگر وغیرہ رواسم جو شیعوں میں رائج تھے وہ چھوڑ دیئے گئے ان کی جگہ حاضری علم تعزیے اور آئمہ و شہدائے کربلا کی نذر و نیاز ہونے لگی۔ اس زمانہ میں لکھنؤ کے تمدن میں کسی خاص چیز کا اضافہ نہیں ہوا مگر ہر چیز میں ترقی ہوئی غفرانمآب کی کوشش سے شیعیت کو بڑا فروغ ہوا اور غزل میں بھی عورت سے عشق یا ہیا نہ بانکپن اور شیعی عقائد کا اظہار کیا جانے لگا۔ میر تقی میر نے تو مناظرانہ نوک جھونک سے بھی پرہیز نہیں کیا۔ باغ فدک خلافت بلافصل وغیرہ کا ذکر ان کی غزلوں میں موجود ہے۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں آصف الدولہ کا انتقال ہوا۔

یمین الدولہ سعادت علیخاں | آصف الدولہ کے بعد ان کے سوتیلے بھائی سعادت علیخاں سنہ ۱۲۱۲ھ کو مسند حکومت پر بیٹھے وہ بہت بڑے عالم مفکر فلسفی سیاستداں اہل کمال کے سرپرست تھے رقص و سرود اور حسن پرستی کی فضا میں انہوں نے پرورش پائی تھی شعر و سخن کی فضا میں آنکھ کھولی تھی نفاست و پاکیزگی

ذوق ان کے گرد و پیش پھیلی ہوئی تھی سنجیدگی و وقار ان کی فطرت تھی۔ اس وقت تک رات کو سواری کے ساتھ مشعلوں کا رواج تھا انھوں نے سونے چاندی کی اسی سو لالٹینیں بنوائیں جن میں شمعیں جلتی تھیں یہ خوبصورت چھڑوں میں ان کی سواری کے ساتھ رہتی تھیں۔

شجاع الدولہ کے زمانہ سے ناچ گانے اور طوائفوں سے دلچسپی فرمانروایان اودھ کی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ سعادت علی خاں ایسا متین و سنجیدہ شخص بھی اس [illegible] نہ بچ سکا صبح کو اجلاس کے وقت ایک طرف امرائے دربار فوجی افسر کام کے لیے حاضر رہتے تھے دوسری طرف طائفے رقص و سرود میں شہانہ اور راگ الاپنے میں مشغول رہتے تھے نوبت و نقارے کی آواز اس پر مستزاد تھی اور وہ کام کرتے میں اٹھ اٹھ کے کھڑکیوں میں سے دیکھتے رہتے تھے یہی حالت تمام امراء کی تھی عوام کو بھی اس سے بڑی دلچسپی تھی اس وجہ سے طوائفوں کی بڑی کثرت ہو گئی ان کو شہر سے باہر جانے کی ممانعت تھی نواب کا خیال تھا کہ یہ شہر کی رونق ہیں حکومت اور رؤسا کی طرف سے ان کو بغیر کسی خدمت کے انعامات ملتے رہتے تھے۔

زبان کے معاملہ میں بھی ان کا ذوق بہت پاکیزہ تھا شوکت الفاظ کے ساتھ بلیغ مختصر معنی خیز اور مرصع فقرے برجستہ ان کی زبان سے نکلتے تھے۔ وہ ملائی کو بالائی کہتے تھے انشا نے دریائے لطافت میں لکھا ہے کہ :-

"حضور والا کی اردو میں تحریر و تقریر مقامات حریری کی یاد دلاتی ہے۔ نہ کوئی ایسا فصیح زبان اور شیوا بیان پیدا ہوا نہ ہوگا کسی وقت ان کی بات لطیفہ سے خالی نہیں ہوتی کبھی طباق کبھی ایہام کبھی ترشیح کبھی محتمل الضدین"

بظاہر یہ خوشامد معلوم ہوتی ہے مگر سچ پوچھیئے تو ان کی ادبیت کا حق ادا نہ ہو سکا حریری نے انشاء پردازی کی ہے اور سعادت علی خاں کی معمولی بات چیت اور روزانہ کے احکام ہیں یہ بات حریری کو کہاں نصیب ہوئی انہوں نے قانون بنایا کہ جو منشی املا کی غلطی کرے اسی حرف کے ہم عدد اس پر جرمانہ کیا جائے۔ ایک نیا منشی نوکر ہوا اس نے بجائے نوع لو "برنو" لکھدیا تحریر نظر سے گذری اس پر حکم لکھا،

"منشی نو لفظ نوع را بطرز نو نوشت عین خطا کرد ہفتاد روپیہ جرمانہ"

ایسی برجستہ عبارت بڑے بڑے انشا پرداز نہیں لکھ سکتے سرکاری درزی نے اضافہ تنخواہ کی درخواست دی اس پر حکم لکھا ؎

گر زمیں را با سماں دوزی ندہندت زیادہ از روزی

جان بیلی صاحب فارسی دانی میں بڑی شہرت رکھتے تھے خود بھی ان کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا سعادت علی خاں کے مختصر معنی خیز اور مرصع جملوں کی شہرت تھی بیلی صاحب جب رزیڈنٹ ہو کے لکھنؤ آئے تو کہا تو میں ان سے مختصر سوال کروں اور انھیں طولانی جواب دینا پڑے اپنے دل میں کچھ سوال مرتب کئے جب ملاقات کو آئے تو سلام، مزاج پرسی کے بعد پوچھا۔

آپ کے عجائب خانہ میں کون کون سے جانور ہیں؟ از شیر تا بیٹر۔

آپ کے ملک کے کیا حدود ہیں۔؟ از سنگ تا گنگ

ہمالیہ گنگا

بیلی صاحب حیران ہو گئے اور پھر کسی سوال کی جرأت نہ ہوئی۔

سعادت علی خاں کا یہ انداز تحریر و تقریر بحد مقبول ہوا خاص و عام سب معمولی گفتگو صنائع و بدائع میں کرنے لگے۔ سودا بیچنے والوں کی صدائیں مشہور ہیں۔

علماء کی تقریر و تحریر بھی اسی رنگ میں ڈوبی ہوتی تھی سلطان العلماء مجتہد العصر کی تصنیفیں ایسے فقروں سے بھری پڑی ہیں ان کی روزانہ کی گفتگو اور مقدمات کے فیصلے بھی اسی رنگ میں ہوتے تھے۔

منی طوائف بدکاری جرم میں گرفتار ہوئی جرم ثابت ہوا فیصلہ میں لکھا

"منی بالتضم والتشدید"[1]

ایک حکیم صاحب نے کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کر لیا اس کی شکایت صحیح ثابت ہوئی فیصلہ میں لکھا۔

"حکیم صاحب رفع قبض نمایند"

یہ انداز تقریر و تحریر لکھنؤ کے تمدن کا ایک جزو بن گیا۔

سعادت علی خاں کو اپنے باپ دادا اور بھائی کی طرح عزاداری سے بڑی عقیدت تھی وہ محرم بہت اہتمام سے مناتے تھے۔ ابتک صرف دس دن محرم میں تعزیہ داری ہوتی تھی انھوں نے چہلم بھی قائم کیا تال کٹورے کی کربلا اور حضرت عباس کی درگاہ بنوائی۔

میر سید علی نے سوز خوانی میں وہ کمال پیدا کیا کہ لوگ حیران ہو گئے اور لکھنؤ میں سوز خوانی نے ایک اعلیٰ فن کی حیثیت اختیار کی۔

ایک نیا شہر انگریزی طرز کا آباد کیا۔ بڑے بڑے شعراء دہلی سے آئے اور مختلف سرکاروں سے وابستہ ہوئے۔

پرکاش نے بتاسے پر ناچ کے لوگوں کو حیرت میں ڈالدیا

---

[1] منی برائی میں شدت سے ملوث ہوئی۔

سنہ ۱۲۲۹ھ کو سعادت علی خاں کا زہر سے انتقال ہوا۔

غازی الدین حیدر | غازی الدین حیدر سعادت علی خاں کے فرزند اکبر اپنے باپ کے بعد سنہ ۱۲۲۹ھ میں مسند حکومت پر بیٹھے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اپنی شاہی کا اعلان کیا اپنے نام کا سکہ ڈھلوایا۔ دو کروڑ میں تاج و تخت اور گنبد زر نگار تیار ہوا اٹھارہ ذی الحجہ سنہ ۱۲۳۴ھ کو تخت شاہی پر جلوس فرمایا سلطان العلماء مجتہد العصر نے اپنے دست مبارک سے تاج شاہی ان کے سر پر رکھا اور پہلا حکم کچھ سادات کی تنخواہ کا شاہی قلم سے صادر ہوا شاہ زمن لقب اختیار کیا۔ وہ بڑے شجاع و بہادر عالم و فاضل علماء و فضلا کے سرپرست و مرجع تھے۔

شاعری سے بھی دلچسپی تھی حمد نعت اور مرثیہ زیادہ کہتے تھے غزل میں بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ فارسی کی ایک بلند پایہ لغت (ہفت قلزم) کے مصنف ہیں ایک عربی لغت (تاج اللغات) مستند علماء سے لکھوائی۔

ٹائپ کے حرفوں کا چھاپے خانہ اور کنواری لڑکیوں کی شادی کا محکمہ قائم کیا۔ طبیعت نفاست پسند اور جدت طراز تھی کپڑوں کے ذوق کی بشپ ہیبر نے بہت تعریف کی ہے ایک ٹوپی مندیل کی قسم کی ایجاد کی گھوڑے اور مچھلی کی شکل کی کشتیاں بنوائیں ہاتھی کا ایسا ہودا بنوایا جو چاروں طرف گھومتا تھا گینڈے پر ہودا رکھ کے سواری کی بے طناب کا خیمہ بنوایا۔ حقہ کا نام حسنِ محفل رکھا نجف اشرف قدم رسول اور سعادت علی خاں کا مقبرہ تعمیر کرایا نہر کھدوائی اور اس میں پانی کے لئے انجن منگوایا ان کے زمانہ میں شہر کی بہت رونق بڑھی۔

آداب نشست و برخاست اور لوازم تعظیم و تکریم سخت ہو گئے چھینکنا کھانسنا۔ جماہی لینا کھجانا بے تحاشا ہنسنا خلاف تہذیب قرار پایا خطاب و جواب میں بڑی لچک اور دلکشی پیدا ہوئی سلام و مزاج پرسی کے انداز میں اشتیاق اور خلوص کا مفہوم پیدا ہوا سنجیدگی متانت کی پابندی لازمۂ شرافت تھی۔ غیر مہذب آدمی شرفا کی محفل میں بیٹھنے کے قابل نہ تھا اس وجہ سے ہر شخص کو آئین تہذیب کا معیار بننا پڑا مصاحب، طوائفیں نشستگاہ خاص طور پر مہذب ہو گئے یہ بات صرف دربار اور امیروں کی سرکار تک نہ رہی بلکہ عام ہو گئی اس کا اثر یہ ہوا کہ بازاری اور مکروہ لفظیں لونڈا۔ لیڑ۔ چانٹا۔ چوتیا۔ بڑھو۔ بھڑوا۔ ابے وغیرہ زبان سے خارج ہو گئیں نقل قول کی ضرورت پر موزوں الفاظ سے کام لیا جاتا ہے یہ معیار تہذیب دہلی میں بھی نہ تھا۔

فن سپہ گری کو ترقی ہوئی لوگ عموماً سپاہیانہ وضع میں رہنے لگے شعر و شاعری کا ذوق بڑھا علوم و فنون کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا علماء شعراء اطبا اور دوسرے صاحبان فن دور دور سے آئے اور قدر دانی سے سرفراز ہوئے نفاست اور پاکیزگی ذوق کا شہرہ ہوا

تعزیہ داری کو ترقی ہوئی بادشاہ نے حضرت علی کے روضہ کی نقل تعمیر کرائی اور اس کا نام شاہ نجف رکھا انگلینڈ سے بلور سبز کی ضریح ڈھلوا کے منگوائی علم و تعزیت کے ساتھ یہ ضریح بھی اٹھائی جاتی تھی۔

سنہ ۱۲۴۲ھ میں ان کا انتقال ہوا اپنے بنوائے ہوئے امام باڑہ (شاہ نجف) میں دفن ہوئے لالہ صاحب رائے فریاد نے تاریخ کہی ہے

حیدر بنجف مقام بگرفت

نصیر الدین حیدر | غازی الدین حیدر کے اکلوتے بیٹے نصیر الدین حیدر سنہ ۱۲۴۲ھ میں

تخت سلطنت پر بیٹھے۔ اور سلیمان جاہ لقب اختیار کیا سلطان العلماء سید محمد رضا مجتہد العصر نے تاج پہنایا۔ دبدبہ و شکیل رعب شاہی چہرہ سے نمایاں اعلیٰ درجہ کے شہسوار اچھے پیراک اور خوشگو، شاعر تھے بادشاہ تخلص تھا ان کا دربار بڑے رعب و داب کا دربار تھا کسی کو چھینک آگئی تو اس کی ناک کٹوالی[1] طبیعت میں بڑی نفاست اور خوشبو سے بہت رغبت تھی عطر اور پھول کا استعمال عجیب عجیب طرح کیا خس کی ٹٹیوں پر کیوڑہ اور گلاب چھڑکا جاتا تھا عطر کے فوارے چھوٹتے تھے اور حوض بھرے جاتے تھے ہزاروں کاری باغوں کے علاوہ سیکڑوں روپیہ کے پھول روزانہ بازار سے آتے تھے[2] مزاج میں اتنی نزاکت تھی کہ بیلے کے تیل کی خوشبو ناگوار ہوئی۔

خوبصورت عورتوں کو جمع کرنے اور انھیں آراستہ رکھنے کا بے حد شوق تھا کئی ہزار کہاریاں بہرہ دارنیاں خواصیں اور کنیزیں تھیں جو بہت بناؤ سنگھار سے رہتی تھیں ان کی لونڈیوں نے جو لباس پہن ڈالا وہ مغل اعظم کی ملکہ اور شہزادیوں کو نصیب نہیں ہوا ایک ایک دوپٹہ چار چار ہزار کی لاگت کا ہوتا تھا[3]

رفاہ عام کا بڑا خیال تھا شہر کے ناداروں کا وظیفہ معین کیا انگریزی اسپتال یونانی شفاخانہ۔ محتاج خانہ اپاہج خانہ بنوایا جو ابتک موجود ہے۔ گومتی پر لوہے کا پل بنوایا۔

علم نجوم کے بڑے ماہر تھے رصد خانہ سلطانی تعمیر کرایا اور زیچ سلیمان جاہی مرتب کرائی۔

لیتھو کا چھاپہ خانہ کھولا ڈرامے کی بنیاد قائم کی رقص و سرود کو ترقی

---

[1] لکھنؤ میں چھینکتے ناک کٹنا محاورہ اسی بنا پر [2] فسانہ عبرت [3] تاریخ اردو

اور عالموں کی کثرت ہوئی شعر و سخن کا ذوق اور سپہ گری شوق بڑھا سارا شہر ہتھیار بند ہوگیا تعزیہ داری کو بہت عروج ہوا۔ ذوالجناح اور مہندی نکالنے کی ابتدا کی آخر ربیع الاول تک ایام عزا قرار دیئے ایک عالیشان کربلا تعمیر کرائی میر ضمیر نے تحت لفظ مرثیہ پڑھنے کا طریقہ ایجاد کیا۔

اہلِ بیت سے مودت اور عقیدت عام تھی اہلِ سنت تفضیلی تھے ہندو مسلمان سب تعزیہ داری کرتے تھے پہرہ دار حکم حیدر جاگو کہہ کے پہرہ دیتے تھے فقیر مناقب پڑھ کے بھیک مانگتے تھے یہ لکھنؤ کے شباب کا زمانہ کہا جاتا ہے اس وقت لکھنؤ کا تمدن یہ تھا۔

لباس کا شوق۔ عطر کا ذوق۔ سپہ گری میں مہارت ہتھیار سے لیس شہسواری بٹیر بازی مرغ بازی عشق و عاشقی شعر و شاعری رقص و موسیقی علوم و فنون کی قدر جسمانی تکلیف کا اتنا تحمل کہ زبان سے ہائے وائے نہ نکلے خوش خوراکی اور کم خوری مفلسی کو چھپانا۔ اپنے کو خوشحال ظاہر کرنا ادب و تعظیم کا لحاظ رفتار و گفتار میں سنجیدگی وقار بازاریوں کے الفاظ سے پرہیز نکتہ رسی و بذلہ سنجی خلق و انکسار باتوں میں اپنی تعریف اور نمائش کا پہلو نہ آنے دینا گفتگو میں تشبیہ و استعارہ صنائع کا صرف شعروں اور مصرعوں کا برمحل استعمال ہر بات میں اپنے اوپر نگاہ احتساب کہ کوئی فعل نفاست و سنجیدگی کے خلاف سرزد نہ ہو۔ اس معاشرہ میں نسلیں گذر گئیں ذہن اس سانچے میں ڈھل گئے سپہ گری کی آن بان کے ساتھ خلق و انکسار عشق و عاشقی اور رقص موسیقی کے ساتھ تہذیب و وقار نفاست و نزاکت مزاج بلند نظری جدت اور جودت طبع حاضر جوابی نکتہ سنجی فصاحت و بلاغت اہلِ لکھنؤ کی خصوصیت اور شناخت بن گئی۔

ناسخ کی شاعرانہ اصلاحیں

اسی فضا میں ناسخ نشوونما پائی ان میں فصاحت کا شعور ذوق سلیم شاعرانہ حیثیت صلاحیت جدت طبع بے انتہا تھی ان کی فطری صلاحیتیں لکھنؤ کی تہذیب و نفاست کے سانچے میں ڈھل کر ایسے پاکیزہ ذوق کی شکل میں نمودار ہوئیں جس کا لکھنؤ کی تہذیب تقاضا کر رہی تھی انھوں نے زبان کی صفائی و پاکیزگی کے ایسے قاعدے بنائے اور ان پر عمل کر کے فصاحت و بلاغت کا ایسا معیار قائم کیا کہ لوگوں کو اس کی تقلید سے گریز ممکن نہ ہوا۔ شاعری میں مضامین کی سنجیدگی اور ادارے مطلب میں جدتوں سے ایسی دلکشی پیدا کی کہ سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی ہر جگہ کے شاعر نے اس کی تقلید کی کہنہ مشق اپنے انداز کو چھوڑ کے ان کی پیروی کرنے لگے مصحفی ایسے استاد کل استاد مرعوب ہوئے کہ سر مشاعرہ ان سے غزل پڑھنے کی اس طرح فرمائش کی ہے

ہاں مگر شیخ کی خدمت میں یہ ہے اپنا سوال ؟ پڑھ چکے ہم تو کچھ اب آپ عنایت کیجے

معلوم ہوتا ہے کہ غزل کہتے وقت ناسخ کا اتنا رعب تھا کہ نہیں معلوم وہ اس زمین میں کیا کیا گلکاریاں کریں گے عنایت کیجے کے قافیہ میں دل کی بات بے اختیار زبان پر آگئی۔

اپنے چھٹے دیوان کے مقدمہ میں ان کی تقلید کا صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے :۔

تخلص خود را اسم بالمسمیٰ نگاشتہ بر طرز ریختہ گویان
سادہ کلام در عرصہ قلیلے خط نسخ کشیدہ ________
غزلیات ایں دیوان ششم را اکثرے بر زمینہ ایشاں گفتہ

غالب ایسا مغرور شاعر جو بڑے بڑوں کی حقیقت نہیں سمجھتا کسی کی جھوٹی تعریف کو کبھی کہتا اور اپنے لیے اس کو ننگ و عار جانتا ہے ناسخ کے

آفتاب کمال کے سامنے سربسجود ہو جاتا ہے اور ان کو موجد و مجدد و مصلح زبان و شاعری تسلیم کرتا ہے۔ عبدالغفور نساخ کو ایک خط میں لکھا ہے :۔

"ہم فقیر لوگ اعلان کلمۃ الحق میں بے باک اور گستاخ ہیں شیخ امام بخش ناسخ طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روش کے ناسخ تھے۔"

ناسخ کو اپنے دیوان کے ساتھ جو خط بھیجا ہے اس کے ایک ایک لفظ سے وہی عقیدت ٹپکتی ہے جو ایک لائق شاگرد کو اپنے باکمال استاد سے ہونا چاہیے۔

غالب کا خط ناسخ کے نام

"ایں ورقہائے بخون جگر نگار بستہ ارمغانیست بغالب جگر خستہ بحضرت خدام والا مقام سخن سنج معنی نیاہان امید گاہ بی نظامی ظہوری ظہور۔ نظیری نظیر فیضی فیض۔ ضمیری ضمیر۔ شافی شان نوائی نوا۔ فغانی فغان۔ در علم صائب و در عمل راسخ مخدوم معظم مطاع مکرم۔ مولانا ناسخ کہ در سخن طرح نوی ریختہ اند و در ریختہ نقش بدیع انگیختہ او فرستادن ایں فہرست نادانی بدان دانا آموز کار نہ ازان رواست کہ طبع آہنگ نمائش و ہمت بعرض تجمل گرائش دارد بلکہ نامہ نگار درین پردہ سگالیدہ است کہ غیر ایں تیرہ بخت سرانجام قلم و تحریر بلیغان نگاہ قبول مولانا رد ہشتہ اند زدو انچہ بجز لک انصاف قابل ازیں اوراق بتر زدن نرسیدہ است بغازہ تحسین مخدوم رخ امتیاز افروزد۔"

ناسخ نے اپنا دیوان مرزا موہن جان کے ہاتھ غالب کو بھیجا تھا اس کا شکریہ جن الفاظ میں ادا کیا ہے اس کے ضروری اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

"ندانم چه می نگارم که درین نگرستن نگه از ناز بدیده در نمی گنجد و درین نگارش خامه از شادی در بنان می رقصد۔ بخت را برسائی ستایم و پندارم که بطور معنی رسیده ام و خود را بگمان مایگی آفرین گویم و انگارم که موسی را باید بعصا دیدم۔

زہے دیوان که مدادش از دودۂ چراغ طور است و غلافش از دیباے طراحوری معنی را گنجینه۔ چون بگوئی فواد نامه گرا در نگارنده این یکیم شادم که این نامه دو میں نقشش است از آن خامه اگر این گنجینه نامه دلپذیر نبود سے مرا این را بچشم نظر نبود ہے۔

آرے ہر متاعے را که بیک نامے نام برآورد گرد چشم زخمش ہمه بیشتر آید۔ سبحان الله سخن بروزگار مخدوم بپایه بلند بود دارد و بازار رونق دیگر پدید آمد۔" (پنج آہنگ)

اس خط میں غالب نے ناسخ کے مقابلہ میں اپنی ہیچ میرزی اور ان کے کمال کا جن لفظوں میں اعتراف کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے بہت مرعوب تھے اور ان کے مقابلے میں کسی شاعری کی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ کچھ انھیں پر موقوف نہیں اس وقت کے تمام ادبا و شعرا ان کے طرزِ سخن کے شیدا اور اس کی تقلید حسن کلام کی ضمانت سمجھتے تھے دہلی کے مستند اہلِ زبان اور قادر الکلام شاعر مرزا قادر بخش صابر گلستانِ سخن میں یوں زمزمہ سرا ہیں۔

"گرسنہ ہزار اس کے مائدہ سخن سے زلہ ربا دعویدارِ کمال اس کے شوکت الفاظ سے پائمال اہلِ انصاف اس کو استاد مانتے اور ارباب فہم اس کے شعر کو سحر جانتے ہیں۔"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ گلشن بے خار میں یوں نغمہ طراز ہیں۔

"نسیم طبعش نکہت ریز۔ شمیم گل فکرش دل آویز۔ طائر بلند پرواز غورش جز بشاخ سدرہ آشیانہ نسازد۔ و مرغ تیز بال خیالش جز ببام فلک جلوہ نیانداز د۔ والا مایہ۔ بلند اندیشہ۔ نازک خیال در تلاش مضمون تازہ و معنی سیراب بے مثل و بے مثال"۔

مؤلف تذکرہ بہارِ بے خزاں یوں گل نشانی کرتے ہیں:۔

"سحر بیان استاد نزاکت بنداں زباں بود"

تذکرہ خوش معرکہ زیبا کے مؤلف لکھتے ہیں:۔

"ناسخ رسم کہن مجتہد شعر و سخن۔ صاحب رائے سلیم یادگار رضا و کلیم خلاق معانی شیریں بیان مرحوم مغفور شیخ امام بخش ناسخ۔"

مؤلف بہارستان اددھ رقمطراز ہیں:۔

شیخ امام بخش ناسخ سر دفتر شعرائے عظام لکھنؤ مانا گیا ہے فصاحت و معنی آفرینی میں یکتائے روزگار تھا فکر رسا اور بلاغت کلام میں مرزا صائب اور ملا ظہوری سے گوئے سبقت لے گیا ؎

طرز اندیشہ آفریدہ اوست — در تن لفظ جان دمیدہ اوست

نصر اللہ خان خویشگی گلشن ہمیشہ بہار میں لکھتے ہیں۔

شاعر غرّا کلامش از سقم معرا طبعش نکہت انگیز فکرش دل آویز والا مایہ عالی پایہ بلند اندیشہ

ناسخ کی زبان و شاعری کے قبول عام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کا کلام لکھنؤ کا تحفہ سمجھا جاتا تھا شیفتہ ان کے حال میں لکھتے ہیں:۔

جدید غزلوں کے بھی دو تین اشعار جو بعض احباب تحفتہً لکھنؤ سے لائے

تھے قلم بند کئے گئے۔"

(گلشن بیخار)

صفیر بلگرامی نے جلوۂ خضر میں غالب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب ناسخ کا کلام دہلی پہنچا تو ایک دھوم مچ گئی، میں نے اور مومن نے ان کا متبع ہونا چاہا۔

اتنی پسندیدگی کی وجہ سمجھنے کے لئے انہی لوگوں کے بیانات پر غور کرنا چاہیئے۔

مصحفی:۔ طرز جدید کے موجد متقدمین کے کلام پر خط نسخ کھینچ دیا۔

غالب:۔ طرز جدید کے موجد۔ پرانی ناہموار روشن کے ناسخ۔ شاعری کو پایہ بلند پر پہنچایا۔ اردو کے قالب میں روح تازہ پھونکی"۔

شیفتہ:۔ ان کا کلام دل آویز۔ ان کی فکر بلند۔ خیال نازک تلاش مضمون تازہ اور معنی سیراب میں بے مثال ہے۔

نصر اللہ خان:۔ طبع نکہت انگیز فکر دل آویز۔ بلند اندیشہ۔ نازک پیشہ۔

مرزا قادر بخش صابر:۔ شوکت الفاظ سے ان کا کلام سحر ہے"۔

سعادت ناصر خان:۔ ناسخ رسم کہن خلاق معانی۔

بہار بے خزاں:۔ سحر بیاں استاد نزاکت بندان زباں

دبستان اودھ:۔ نصاد معنی آفرینی میں یکتا روزگار نظیر مرزا صائب اور ملا ظہوری سے بازی لے گئے۔

ان اقوال سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے نزدیک بلند پروازی معنی آفرینی نازک خیالی طرز ادا میں جدت اور زبان میں فصاحت و بلاغت تھی کی وجہ سے ناسخ کے کلام میں دلکشی ہے اور یہی باتیں شاعری کی جان ہیں یہی دہلی و لکھنؤ کا فن ہے فرق صرف اتنا ہے کہ لکھنؤ میں یہ فن سنجیدہ صاف ستھرا اور معراج کمال پر پہنچا ہوا ہے اس کی تفصیل لکھنؤ کی شاعری کو سمجھنے میں مدد دے گی۔

زبان میں ناسخ کی انقلابی اصلاحیں

۱۔ گنواری بازاری۔ بھونڈی۔ بھدی لفظیں اور ترکیبیں ترک کیں۔

۲۔ تذکیر و تانیث کا تعین بڑے سلیقہ سے کیا۔

۳۔ علامات فاعلیت وغیرہ کا ترک ممنوع قرار دیا۔

۴۔ حرف کا دبنا۔ گرنا اور بڑھنا ترک کیا۔

۵۔ تعقید اور اضمار قبل الذکر سے پرہیز کیا۔

ان اصلاحوں سے زبان میں روانی سلاست اور صفائی پیدا ہو گئی۔

۶۔ شعر کی ایک خاص زبان بنائی۔

لکھنؤ کی مادری زبان لکھنؤ میں دو زبانیں بولی جاتی ہیں ایک گھر کے اندر کی زبان ہے جسے اہل لکھنؤ کی مادری زبان کہنا چاہیئے اس میں عربی فارسی لفظوں تشبیہوں استعاروں اور صنعتوں کا بڑا ہلکا پھلکا استعمال ہے بچے بوڑھے عورت مرد سب یہی زبان بولتے ہیں۔ مثلاً مزاج عالی مزاج اقدس گھر کے اندر کی زبان نہیں اس کی جگہ مزاج اچھا ہے؟ مزاج کیسا ہے؟ کہتے ہیں بڑے بڑے علماء گھر کے اندر اسی سادی زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔

ہم آپ کو لکھنؤ کی دو ہمسائیوں کی بات چیت سناتے ہیں ایک ہمسائی اپنے گھر کی کھڑکی سے دوسری ہمسائی کے گھر آئی ہیں۔

بہن تسلیم۔ تسلیم مزاج اچھا ہے آج کدھر بھول پڑیں؟ کیا بتاؤں سارا دن الم غلم میں گذرتا ہے گھر کے کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی آج سب کاموں کو تج کے آئی ہوں۔ بٹیا کہاں ہیں؟ کمرے میں سو رہی ہیں رات کو باجی اماں کے یہاں رتجگے میں گئی تھیں۔ ماشاء اللہ کیا سن ہے؟ خدا رکھے دسواں برس ہے

اللہ سلامت رکھے اب تو شادی کا سن ہوگیا کہیں سے بات آئی ہے ؟

ہاں چچا کے لڑکے کا پیام ہے مگر وہ شہدہ پاک پنج عیب شرعی نہ کماتا ہے نہ کجاتا ہے۔ کنکیا ہے اور وہ ہے محلے لقندرے گھیرے رہتے ہیں باپ کی دولت ہے جو ہوا میں اُڑ رہی ہے۔

باپ دیتے کیوں ہیں ؟ اے لو۔ کیوں نہ دیں چہیتے ہیں اکلوتے ہیں۔

نوج۔ "ایسی چاہت پہ خدا کی مار" جو بچے کو برباد کر دے خدا رکھے بہن کا لڑکا بھی تو سمجھدار ہوگیا۔

دو کی بیوی۔ آپ کہاں رہتی ہیں اس کی تو شادی بھی ہوگئی۔ اے سچ کہئے کہاں ہوئی ؟ پھوپھی کی لڑکی سے۔

خدا مبارک کرے۔ لڑکی کیسی ہے ؟

چندے آفتاب چندے ماہتاب کا منی سی مورت۔ بوٹا سا قد نک سک سے درست۔

کچھ سلیقہ کی بھی ہے ؟ کیوں نہیں سینا پرونا پکانا ریندھنا کیا نہیں آتا ماشاء اللہ پانچوں انگلیاں پانچ چراغ ہیں۔

میاں کا کیا حال ہے ؟ پروانہ ہے دیکھے جیتا ہے۔

جہیز کیا ملا ؟ ارے جہیز کی بھلی چلائی ہوئی بچھیا بہن کے نام کچھ کہیں کے ٹوٹے پھوٹے دو چار ٹھیکرے بوری بوری کپڑے انھیں کے ہاتھ لگے ہیں دو چار تار چھینے۔

چلو دو سر تو جڑ گئے۔ ہاں خدا رکھے گھر آباد ہوگیا میاں بیوی دونوں خوش ہیں۔ بس اور کیا چاہیئے۔

خدا رکھے صاحب زادے کا کیا حال ہے ؟

بہن کیا بتاؤں خدا لعوت دے ایسے لڑکے سے نہ ہونا اچھا۔

اے نوج۔ دور پار۔ چھائیں پھوئیں۔ شیطان کے کان بہرے انگریز بندوں کو۔ آپ کو وہم بھی نہیں آتا جو منہ میں آیا کہہ ڈالا۔ خدا رکھے ابھی سن ہی کیا ہے ؟ اے سن کیوں نہیں موا لونبڑ ہوگیا نہ لکھنے کا نہ پڑھنے کا سارا دن کنکوے پیچھے لقر لقر کرتا پھرتا ہے نہ کھانے کی سدھ نہ پینے کی سوکھ کے کانٹا ہوگیا آنکھیں ہیں کہ ڈھکر ڈھکر کر رہی ہیں دو نوالے اتارے اور بھاگا دو نوالے اتارے اور بھاگا کا کھائے گا دن بھر میں پانچ چھ دفعہ مگر وہی دو چار نوالے وہ بھی سیٹھ کے اہل دلی ہیں۔ جاتا کہاں ہے، باہر تو میں نکلنے نہیں دیتی وہی بارہ دری کے سامنے والے ہاتے (احاطہ) میں دن بھر ادھم مچائے رہتا ہے۔

اکیلا ؟ نہیں اکیلا کیوں ہرمزی خانم کا لڑکا اچھے صاحب کا لڑکا اور محلے کے دو چار شہدے۔

خدا رکھے سن آنے پر سنبھل جائے گا بچپنا ایسا ہی ہوتا ہے شادی بیاہ ہوگا بیوی بچوں میں پھنس جائے گا پھر کہاں کا کنکوا کہاں کا وہ اے بہن آپ کی کیسی باتیں یہ عادتیں کہیں چھٹتی ہیں بچپنے سے سنتی آ رہی ہوں۔ نواب آغن صاحب کے میں۔ ان بڈھے کنکوا لڑ رہا ہے پوتا پوتی نواسا نواسی والے ہوگئے مگر کنکیا ہاتھ سے نہ چھوٹنا تھی نہ چھوٹی الے سب ایسے تھوڑی ہوتے ہیں اتنے بڑے شہر میں ایک نواب آغن صاحب ایسے نکل گئے تو کیا۔ ایک انہیں پر تھوڑی موقوف ہے ایسے نہیں معلوم کتنے آغن صاحب شہر میں

نوٹ:۔ خط کشیدہ فقرے عورتوں سے مخصوص ہیں باقی عورت مرد سب یکساں بولتے ہیں۔

لہ تکرار بار بار کے مفہوم کو ظاہر کرتی ہے۔

ہیں۔ آخر ان سے کنکیا لڑانے والے بھی تو ہوں گے۔

لکھنؤ کی ادبی زبان | دوسری زبان باہر کی ہے یہ ذکاوت و ذہانت ادبیت اور قابلیت کے اظہار کی زبان ہے اس میں عربی۔ فارسی لفظیں تشبیہیں استعارے اور ضائع و بدائع ہیں ناسخ نے اس زبان کو شعر میں اس خوبی سے استعمال

لکھنؤ کی ٹکسالی زبان | کیا کہ عربی فارسی لفظوں اور ترکیبوں سے ؎

تماشائے بخون غلطیدن بسمل پسند آیا

یا

سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات

کی طرح فارسیت نہیں پیدا ہونے پائی بلکہ اردوے معلی بن گیا ؎

یہ سما عدون کا ہے اس کے عالم کہ جس نے دیکھا ہوا وہ بیدم

نیام تیغ قضائے مبرم نقب ہے قاتل کی آستیں کا

ناسخ کے اس شعر میں ان کے اور شعروں کی بہ نسبت عربی فارسی لفظیں اور ترکیبیں زیادہ ہیں۔ یہ شعر خاص طور پر اس لیے منتخب کیا گیا ہے کہ عربی فارسی لفظوں اور ترکیبوں کی افراط کے بعد بھی ناسخ کے شعر سے فارسیت نہیں ٹپکتی بلکہ نہایت فصیح اردو معلوم ہوتا ہے اسی کو ٹکسالی زبان کہتے ہیں۔ لوگ اس کا مطلب نہیں سمجھتے وہ اسے مستند زبان کے معنی میں بولتے ہیں۔

ٹکسالی زبان کے معنی | دنیا کی کسی زبان میں مستند زبان کو ٹکسالی نہیں کہا جاتا۔ ٹکسال میں سکے ڈھلتے ہیں زبان سے اس کا کوئی تعلق نہیں یہ صرف اردو میں ناسخ کی زبان کے لیے کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ محلہ ٹکسال میں وہ رہتے تھے ان کی زبان میں جو شعر کہتا تھا اس کی تعریف میں کہا جاتا تھا کہ یہ ٹکسالی زبان ہے یعنی ناسخ کی زبان ہے باہر والوں نے اس کا مطلب نہیں سمجھا وہ اسے مستند زبان کے معنوں میں بولنے لگے۔

شاعری میں ناسخ کی انقلابی اصلاحیں

۱۔ بھونڈے بازاری اور اوباشانہ مضامین اور انداز بیان کو ترک کر کے تہذیب و شائستگی پیدا کی۔

۲۔ ہر طرح کے اخلاقی تمدنی اور فلسفیانہ مضامین غزل میں داخل کیے۔

۳۔ صنائع بدائع تشبیہ و استعارے ایہام و اشاریت سے نئی راہیں کھولیں۔

۴۔ ادائے مطلب کے سیکڑوں طریقے بتائے ؎

بلبل ہوں بوستان جناب امیر کا ٭ روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

معجزہ شاعرانہ ہے شعراء نے اس زمین میں غزلیں کہیں کسی نے گویوں نے سلام کہے۔ میر انیس ایسے خدائے سخن نے سلام کہا اور پوری قوت سے کہا مگر اس کا جواب نہ کہہ سکے اس کی ساری خوبی ادائے مطلب میں ندرت سے ہے۔

شدت جنوں سے برہنگی کی حالت کس طرح بیان کرتے ہیں ؎

پوچھتا اشک اگر گوشہ داماں تا ٭ چاک کرتا میں جنوں میں جو گریباں ہوتا

عالم بیخودی

دل کو خوش آئی میں صحرا کی ببولیں پر خار ٭ اب کسی سرو گل اندام سے کچھ کام نہیں

دنیا میں مجھ سے زیادہ گنہگار کوئی نہیں۔ ؎

نجات ہوگی عذاب حساب سے سب کو ٭ جو پہلے روز قیامت مرا حساب ہوا

مفلسی کی وجہ سے کوئی پرسان حال نہیں۔

سد راہ کس و ناکس ہے مرا شہرۂ فقر ٭ ورنہ کب مجھ کو میسر کوئی درباں ہوتا

ترکِ دنیا میں آسودگی ہے ؎

کھلے دروازے ہر شب چین سے سوتے ہیں ہم جب سے !
دیا ہے خانہ ویرانی کو عہدہ پاسبانی کا !!

اسی مضمون کو دوسری طرح یوں کہا ہے ؎

بادشاہی کر رہے ہیں انزوائے فقر میں ؛ بخت خفتہ کو کہیں اطبالع بیدار ہم

معشوق کے باغ میں چلنے سے گلوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور باغ بے رونق ہوگیا۔ اس مضمون میں ناسخ کا اہتمام اور جدت دیکھیے وہ کہتے ہیں کہ باغ کی ساری رونق اس وجہ سے ہے کہ تو اپنی نزاکت سے باغ میں نہیں جاتا اگر تو اپنی نزاکت سے باغ میں جانے کی اجازت مانگے تو روئے گل سے رنگ اُڑنے کی اجازت طلب کرے۔ ؎

تو نزاکت سے گلستاں کی جو رخصت مانگتا ؛ رنگ روئے گل سے اُڑنے کی اجازت مانگتا

گلوں کی پردہ دری کیا ہوئی تمھیں منظور ؛ جو آج سیرِ گلستاں کو بے نقاب چلے، رفتارِ ناز کا اثر دیکھیے۔

آستین تن سے پیدا گوئی چراغِ جاں پر ؛ کیا گیا وان روشِ ناز سے ٹھوکر دامن

قناعت کا فائدہ کس طرح بیان کیا ہے۔

فاقہ مستی پہ قناعت ہو جو تم کو میکشو ؛ ہے لبالب بادۂ عشرت خمِ افلاک میں

اپنی عاشق مزاجی کس انداز سے بیان کی ہے ؎

تو نے شہبازِ نظر کو جو ادھر چھوڑ دیا ؛ ہم نے بھی طائرِ دل باندھ کے پر چھوڑ دیا

معشوق کے چہرہ کے سامنے چاند سورج ماند پڑ جاتے ہیں اس کو کس طرح کہا ہے۔

جلوۂ رخسارِ تاباں سے وہ رشکِ مہر و ماہ ؛ چاند سورج کو بنا دیتا ہے تارا چاند کو

عشق میں جان نہیں بچتی اس مضمون میں ناسخ کی جدت دیکھیے۔

تنگ ہو کر زیست سے ہو جاؤں کسی پر عاشق ؛ کوئی اور اس کے سوا مرنے کی تدبیر نہیں

دُنیا کی ہر چیز بے ثبات و ناپائیدار ہے اس مضمون کو کس طرح ادا کیا ہے ؎

عیاں ہے ہر حباب بحر سے کیفیت دنیا ؛ برائے چشمِ بینا ہیں ہزاروں جامِ جم پیدا

مرزا محمد ہادی صاحب عزیز نے ایک دفعہ ناسخ کا یہ مطلع پڑھا ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا ؛ طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اور کہا کتنا سجا ہوا مطلع ہے مگر ہمارے دل پر کیا اثر کرتا ہے ؟

میں نے کہا اگر اس سے ان کے شاعرانہ کمال سے انکار ہے تو مجھے اختلاف ہے جب پہلے پہل یہ مطلع میں نے سنا تو مجھ پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اس سے پہلے کسی نے اس مضمون کو اس طرح ادا نہیں کیا جس اہتمام سے انھوں نے کہا ہے اداے مطلب کے ان اسلوبوں سے اردو پہلی مرتبہ ناسخ کی بدولت واقف ہوئی انھوں نے نئے اسلوب کی راہیں کھولیں تشبیہ و استعارے کے استعمال کے نئے نئے طریقے بتائے زبان میں اداے مطلب کی صلاحیتیں پیدا ہوئیں۔

ناسخ سے پہلے اُردو میں غالب و اقبال کہاں تھے یہ سب ناسخ ہی کے خوشہ چیں ہیں وہ کون سا اسلوب اور مضمون ہے جو غالب نے ناسخ سے نہیں لیا۔

مرزا صاحب مسکرا کے چپ ہو رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ناسخ ہی نے زبان کو اس قابل بنایا کہ اس میں اداے مطلب کی صلاحیت پیدا ہوئی ایک ہی بات کو سیکڑوں طرح سے کہا ہے ایک شبِ ہجر کے مضمون کے ہر شعر میں اندازِ بیان کی ندرت دیکھیے۔

طولِ شبِ فراق کے شکوے سے فائدہ ؛ ہم جاں بلب ہیں ہم کو امیدِ سحر کہاں

شبِ فرقت میں شمع کا کیا ذکر ؛ زندگی کا چراغ بجھ گیا ہے

وہ کہہ گئے تھے کہ آئیں گے ہم چراغ جلے ؛ تمام رات چراغوں سے دل کے داغ جلے

روز اک شام و سحر کرتا ہے پیدا چرخ خلق
صبح میری شام غم کو مہماں کرتا نہیں

شب فراق نہ دیکھی نہ میں نے روز سیاہ
کبھی نہ ہوش تمہارے فراق میں آیا

آفتاب حشر بھی تارا ہے اس کی شام کا
گردش ایام میں صبح شب ہجراں نہیں

ہے بیاں کسکو شب فرقت میں ہوش
ہو چکی ہوگی ہزاروں بار صبح

وصل میں تھا صبح سے بیزار میں !
ہجر کی شب مجھے ہے بیزار صبح

وصل کی شب ہو چکی اندھیر ہے
شام سے دکھلاتی ہے آزار صبح

وصل میں غائب تو حاضر ہجر میں
دیتی ہے ہر شب نیا آزار صبح

توقع ہے شب فرقت میں مجکو صبح ہوتی کی
معاذ اللہ کتنا موت سے انساں غافل ہے

رات ایسا انتظار یار میں بیتاب تھا
بستر گل نہ تھا میں اگ پر سیماب تھا

رات مجکو ترے آنے سے جو مایوسی ہوئی
انتظار مرگ تھا یا اشتیاق خواب تھا

خواب ہی میں نظر آتا وہ شب ہجر کہیں
سو مجھے حسرت دیدار نے سونے نہ دیا

ہے شب ہجر تا ابد نہیں صبح
نہ رہا خوف روز محشر کا

صنعتوں کا استعمال | صنعتوں کے استعمال سے وہ شعر میں جس طرح لفظی و معنوی حسن پیدا کرتے ہیں اس کی تعریف نہیں ہو سکتی ؎

کشتی اس کی نہ ڈوبے صورت موج
جو کہ طوفان کو ناخدا سمجھے !

کتنا بلند خیال ہے اس کو کتنی روانی اور فصاحت سے پیش کیا ہے اور کشتی ۔ موج ۔ طوفان ۔ ناخدا سب جمع کر دیا ہے ؎

سیر خشکی و تری گھر ہی میں میسر ہو جائے
دل اگر آئینہ ہو جائے سکندر ہو جائے

جستجو کہتی ہے زنجیر بآواز بلند
بستۂ عقل جو ہے غم سے وہ آزاد نہیں

چلا عدم سے میں جبراً تو بول اٹھی تقدیر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار دیتا جا

کس قدر بلند مضامین ہیں ان کو کس روانی برجستگی صنائع و بدائع اور طرز

ادا کی ندرت کے ساتھ بیان کیا ہے اور سنئے ؎

اے اجل کی تو نے بار جسم سے اگر نجات
کب سے میری پیٹھ پر یہ خاک کا پشتارہ تھا

عشق جب کامل ہوا ہے عین حسن
آگ میں پڑ جائے جو سنئے آگ ہے

نکتہ آفرینی ملاحظہ کیجئے ؎

ہمارے کیف کو کچھ خوف احتساب نہیں
خیال چشم ہے یاں ساغر شراب نہیں

جانب رحمت حق دھیان ہے ان رندوں کا
شاد ہو جاتے ہیں کیا دیکھ کر میخوار گھٹا

جینا فراق کا نہیں ہرگز حساب میں
مدت ہوئی ہے مر چکے ہیں ہم حساب سے

محذوفات سے ندرت | ان کا ایک خاص اسلوب الفاظ و فقرات کے حذف سے بیان میں ندرت پیدا کرتا ہے ؎

ہر ایک کی صدا لئے قدم دوڑتی ہے دل
بہتر ہے مجکو پاس ترے انتظار سے

وہ بدگماں سمجھتا ہے چاند کا مشتاق
کبھی جو ہم سوئے گردوں نگاہ کرتے ہیں

فصل گل میں ہیں ہوا زور ایام تو یہ ہے مدام
عمر بھر اے مکیشو باب اجابت باز ہے

آتا ہے رشک اے دل پر آبلہ تجھے
کیا جلد پھوٹتا ہے پھپھولا حباب کا

اشاریت | اشاریت کے معنی ہیں ایک نازک کنایہ سے ذہن کا معنی کی طرف منتقل ہونا اور اسی طلب کی اس ندرت سے لطف معنی بڑھ جاتا ہے اور یہ شاعری کا بڑا نازک مرحلہ ہے ناسخ نے اس میں جو کمال دکھایا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی ؎

نور مہتاب ہے دھوئیں کی مثال
ہائے کیا آج رات کالی ہے !

خلل پذیر ہمیشہ ہے کارخانہ عقل
کبھی نہ خانہ زنجیریاں خراب ہوا

ابہام | کسی بات کا واضح طور پر نہ کہنا ابہام ہے شاعری میں ابہام اس کو لطف پیدا کرتا ہے جب وہ سیکڑوں وضاحتیں اپنے دامن میں لئے ہو نہیں تو مہمل ہے ناسخ نے

اس میں جو کمال دکھایا ہے اس کی مثال اُردو میں کوئی نہیں ؎

دل اس بت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے   خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے

حیات و کائنات کے مسائل | زندگی کی تلخ حقیقتیں کس شاعرانہ انداز میں پیش کی ہیں ؎

عالم ہے محو آئینہ خانہ کی سیر میں   اپنے سوا کسی کے کوئی روبرو نہیں!
تمام صفحۂ عالم ہے ایک ہی صفحہ   سرِ کتاب کا یہ اک ورق تمام نہیں
موسم گل کر گیا پرواز باغ دہر سے   یاں ابھی تنکے ہیں بہر آشیاں منتقل یہیں
دشمن اگر وہ دوست ہوا ہے تو کیا عجب   یاں اعتبار دوستیِ جسم و جاں نہیں
ہے حشر دیکھنا قسمت چلی آتی ہے ٹھہرا   اُڑ کے گلشن کو جو بعد ذبح اپنے پر چلے
ہم میکدے میں آئے تو خالی تھے ظرف لیے   رہتے تھے خم شراب کے اول بھرے ہوئے
ذکرِ پرواز تو کیا تنگ ہے اتنا یہ چمن   جھاڑ بھی سکتے نہیں ہم کبھی شہپر اپنا

روزمرہ اور سادگی دیکھیے

ہے عجب رنگ کی وحشت تمہیں دیوانوں کی   دل نہ آبادی میں لگتا ہے نہ ویرانے میں
وصل میں بھی ملے کبھی دل کو نہ آتا تھا قرار   اے فلک تو نے کیا اس کو گرفتارِ فراق
مجھ سے انصاف تو کر چھوٹ نہ سکا ایک عیب   میں نے کیونکر ترے لیے نفرت میں زمانہ چھوڑا
ہوتا وہ غم دوست کہ سب اپنے ہی دل میں رکھتا   غم عالم کی اگر دل میں سمائی ہوتی
صحنِ گلشن میں جو اس گل کی سواری آئی   سمجھے مرغانِ چمن بادِ بہاری آئی
لڑ کے بیٹھے ہوئے تھے آپ کسی دن سے من گئے   بگڑے ہوئے تمام مرے کام بن گئے
فراقِ یار میں فصلِ بہار آئی ہے   الٰہی آتشِ گل سے تمام باغ جلے

تمثیل | ان کی بڑی خصوصیت تمثیل ہے جس میں انھوں نے غالب کو بھی پیچھے ہٹا دیا اور ایسی نادر تمثیلیں پیدا کیں جن کا مثل اُردو میں نہ تھا ؎

عشق سے کس کے دل کو لاگ نہیں   کون سا گھر ہے جس میں آگ نہیں

چوٹ دل کو جو لگے آہِ رسا پیدا ہو   صدمہ شیشہ کو جو پہنچے تو صدا پیدا ہو
رہتا ہے کہاں ساتھ برے وقت میں کوئی   پتھر کو لگی چوٹ شرارے نکل آئے
آزاد ہیں قیود سے افتادگانِ خاک   اُڑتا پھرا شجر سے جو برگ خزاں گرا

شوخی | ان میں سنجیدہ ظرافت اور متین شوخی بھی تھی جو خاص لطف پیدا کر دیتی تھی ؎

خبر کرے کوئی زاہد کو آئے بہر مدد   شکستِ توبہ کو پھر موسم بہار آیا
کعبہ میں جا کے بیٹھ رہوں گا میں دیکھنا   تو دیر سے نکالے گا اے بت اگر مجھے
مے پرستو آؤ کر لو محتسب کو سنگسار   بچ رہے ہیں سنگ کچھ میخانے کی تعمیر سے
توڑی واعظ نے اگر گردنِ مینا ناحق   مے پرستوں نے بھی مسجد کا منارہ توڑا
صبحدم جب صحن مسجد میں اذاں ہونے لگی   ہم نے بھی میخانے کے دروازہ پر آواز دی
جو ہم فنا ہوں تو لازم ہے اے نظر بازو   ہمیں بھی یاد کرو جب کوئی حسیں دیکھو!

تصوف | ان کے یہاں تصوف بھی ہے مگر وہ تصوف نہیں جو سمجھ میں نہ آئے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے مسلکِ شاعری کی مطابق بہت صاف اور واضح ہے ؎

سب طرف سے دیدۂ باطن کو جب یکسو کیا   جس کی خواہش تھی وہی ہر سو نظر آیا مجھے
تو کسی سے نہیں ہے بیگانہ   پر کوئی آشنا نہیں تجھ سے
کس کی ہم جستجو میں نکلے تھے   نہیں پاتے کہیں سراغ اپنا
ہے جی میں آفتاب پرستوں سے پوچھیے   تصویر کس کی ہے ورقِ آفتاب میں

تغزل | غزل کا تیکھا پن ملاحظہ ہو ؎

بھول کر او چاند کے ٹکڑے ادھر آ جا کبھی   میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی
تری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت   ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں
گیا وہ چھوڑ کر رستے میں مجھ کو   اب اس کا نقش پا ہے اور میں ہوں
وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں   ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

دل ہی اس کا جانتا ہے جس پہ گذرا ہے یہاں — عشق کا صدمہ زبانوں سے کہا جاتا نہیں
آسماں پر دل فرشتوں کے بہے جاتے ہیں آج — یہ زمیں پر پاؤں رکھنے کا نیا انداز ہے
چلنے سے عمر رواں اپنی ٹھہر جاتی ہے — جب ترا جلوۂ رفتار نظر آتا ہے
سو رمز کی کرتا ہے اشاروں میں وہ باتیں — ہے لطف تکلم سے خموشی میں زیادہ
سو رقص سے افزوں ہے پری رو تری رفتار — پاؤں کی صدا لاکھ ترنم سے زیادہ
پوچھ اے ناصح نہ کچھ میری اداسی کا سبب — اب میں خود دن رات حیراں ہوں ہوا ہے کیا مجھے
بیٹھ جاتا ہوں جگر تھام کے میں دیوانہ — وہ پری رو مری محفل سے جب اٹھتا ہے
دل کو تھامے ہوئے بیٹھے ہیں جو ہم فرقت میں — ہم نشیں آج بہت درد نہاں اٹھتا ہے
دل دوڑتا ہے کوچۂ دلدار کی طرف — جب سے نہیں ہے طاقت رفتار پاؤں میں

زبان کی یہ صفائی، بیان کی یہ سنجیدگی مضامین کا یہ تنوع طرز ادا کی یہ جدت مضمون کی یہ خلاقی۔ تمثیلات کی یہ شان صنعتوں کا یہ حسن استعمال نہ میر کو نصیب تھا نہ سودا کو یہ اردو میں بالکل نئی چیزیں تھیں۔ انھیں کو دیکھ کے مصحفی مقلد ہوئے غالب کو ان کی نشتریت محسوس ہوئی نقادان سخن نے میر و سودا کے کلام سے مقابلہ کر کے فیصلہ کیا کہ ناسخ نے اس پر خط نسخ کھینچ دیا اور "در ریختہ طرح نوی ریختہ"

بعد کے شعرا نے اس طرح نوی کی پیروی کی غالب نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ ہم نے اور مومن نے ان کا اتباع کیا ان کے بہترین اشعار وہی ہیں جن میں وہ ناسخ کی زبان و شاعری کے تتبع میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ۵

یہ نہ تھی ہماری قسمت جو وصال یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا — غالب
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا ،،
بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا ،،

درد منت کش دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا — غالب
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا ،،
میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا ،،
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا ،،
نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں — جس کے شانے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں ،،
آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے — آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا — مومن
میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا — میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا ،،
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا ،،
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا ،،
ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں ،،
ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو — عذر کچھ چاہیے ستانے کو ،،
برق کا آسمان پر ہے دماغ — پھونک کر میرے آشیانے کو ،،
اک لحظہ نہیں قرار جی کو — موت آئے بس ایسی زندگی کو ،،
کوئی نہ رہا جو پوچھے آ کر — کیا روؤں میں اپنی بیکسی کو ،،

معلوم ہوا کہ ناسخ نے زبان و شاعری میں جو انقلاب پیدا کیا اس کو لوگوں نے زبان کے اعلیٰ معیار فصاحت و بلاغت پر پہنچنے اور شاعری میں ادائے مطلب کی جدتوں تشبیہ و استعارہ کی ندرتوں مضامین کی وسعتوں خیالات کی بلندی تہذیب و شائستگی متانت و سنجیدگی کی وجہ سے پسند کیا ان سب کی تفصیل آپ سن چکے۔ مصحفی، غالب اور سعادت ناصر خاں نے ایک بات اور کہی ہے کہ وہ پرانی ناہموار روش کے ناسخ تھے۔ اس پرانی ناہموار روش کو جب تک آپ نہ دیکھیں گے لکھنؤ یا ناسخ کی ہموار روش کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ناہموار روش مضمون و آبرو و میر و سودا سے مصحفی و انشا و جرأت تک باقی رہی اس لیے ناسخ سے پہلے کے تمام اساتذہ کا کلام دیکھیے۔

اُردو شاعری کا ابتدائی دور

آبرو۔ یکرنگ۔ مضمون۔ ناجی۔ حاتم۔ آرزو۔ فغاں۔ مظہر

مجھے درد و الم گھیرے ہے نت میرے میاں تھا
انداز سے زیادہ نپٹ ناز خوش نہیں
دل یوں ڈرے ہے زلف کا مارا سیہ ناگ سین
مسی کے چرچا غیر سے جا کر چھپچھوندر چھوڑ دی
ہنسی تیری پیاری سے پھلجھڑی ہے !
چھپ کر تیٔ لفظوں سے اس طرح آپلنگ کر
کہتے ہیں ہم پکار سنو کان دھر سجن
یکرنگ پاس اور سجن کچھ نہیں بساط
انگوٹھی لعل کی کرتی قیامت آج گر ہوتی
نہ لو زبلاد کو کہ خط رکھتا یا منڈاتا ہے
لیا اس گلبدن کا ہم نے بوسہ !
کئی عالم کئے ہیں قتل ان نے
دریائے اشک اپنا جب سر پر موج مارے
مرے شوخ خرابانی کی کیفیت نہ کچھ پوچھو !
منت سودا ہے ارے یار کہاں جاتا ہے
کہتا پیچ و تاب اب وہ ڈسیں مجھ کو کالیاں
نہیں آتا ہے تکیہ پہ آرام۔
الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا
لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر

خبر لیتے نہیں کیسے ہو تم میرے میاں تھا — آبرو
جو خال اپنی حد سے بڑھا سو مسا ہوا ،،
رسی سے اژدھا کا ڈرے خون ڈسا ہوا ،،
گھر چلا عاشق کا ان لوگوں کا کیا ٹوٹا ہوا ،،
یہی غنچہ کے دل کی گھپڑی ہے ! ،،
کوئی سینہ زیبا لئے تیرے قدم کا کھٹکا ،،
گر غیر سے ملو گے تو دیکھو گے ہم نہیں۔ یکرنگ
رکھتا ہوں میں دو نین کہو تو نذر کروں ،،
جنھوں کی ان پہنچی لڑجوے دو ایک کلیجہ — ناجی
مرے تشنہ کی خاطر لطف سے سبزی بناتا ہے ،،
تو کیا ہو مار رقیبوں نے بھڑکا — حاتم
کرے کیا ایکلا حاتم بچارا ،،
طوفان نوح بیٹھا گوشہ میں موج مار — آرزو
بہار حسن کو دی آگ اس نے جب بجھی تھی ،،
آ مرے دل کے خریدار کہاں جاتا ہے — فغاں
ظالم اسی لئے سینے زلفیں جیسی پالیاں ،،
یہ سر پا دل سے تیرے ہل رہی — مظہر
ڈبو لیا ہائے آنکھوں نے شرہ کا تھا چپنار ،،
فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

اُردو شاعری کا عہد زریں

میرؔ۔ سوداؔ۔ دردؔ۔ سوزؔ

یہ اُردو شاعری کا قدیمی دور کہا جاتا ہے اس لئے ہم اسے تفصیل سے پیش کریں گے

تغزل

کہتے ہیں لوگ یار کا ابرو پھڑک گیا
ماہ نو تجھ یاد ابرو میں ہے سینہ کا خراش
ملے جب دن سے گیا ہو کر خفا وہ تند خو
دشنام دیجئے وہ جدھر کا کھینچا
مژہ اس چشم کا کھٹکے ہے دل محزوں میں
کیونکر نہ چشم و ابرو سے ہو قتل دل مرا
خون جگر کا کھانا دل پر نہیں گوارا
آہ کس طرح تری راہ میں گھبرو کہ کوئی
اس کنج لب پہ چیکے ہوئے منہ کو رکھ کے ہم
دل پہنچا بلا کی کو نپٹ کھینچ کسالا
مت آنکھ ہمیں دیکھ کے یوں مار دیا کر
میرے سنگ مزار پر فرہاد !
ہم وحشیوں سے مدت مانوس ہو رہے ہیں
طاقت نہیں ہے دل میں نے دل بیار رہا ہے
ملو ان دنوں ہم سے اک رات جانی
ہوا جاتی رہی کی عہد ہی توشک گلی کی

تیغا سا کچھ نظر میں ہماری سڑک گیا — سودا
کس بہولے سے ہے کم یہ بر سینے کا خراش ،،
غنچۂ دل کی کھلی پھر میں نہ کلیاں دیکھیاں ،،
چبھتی ہے میرے دل میں وہی آن آن آن ،،
نیشتر میرے ہے لہو کی پڑی جیبوں میں ،،
دو ترک مست لیکے جو تیغا پلا کریں ،،
اس ترش ابرو کی جبیں نہ ہوئے چیں ،،
سعدہ ہو نہ سکا عمر چلی جاتی کا ،،
دلچسپ اس مقلم پہ حرف و کلام کیا ،،
لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ — میر
عشق ہیں بلا ان کو نہ سنگار دیا کر ،،
رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد ،،
مجنوں کو شوخ لڑکے کہنے لگے ہیں کاکا ،،
کیا ناز کر رہے ہو اب ہم میں کیا رہا ہے ،،
کہاں ہم کہاں تم کہاں زندگانی ،،
جواب بھی سوز ہو مل کر تو جا زا دلا کا سودا

لباس اور سامان آرائش

دندان و لب پہ ساگ تھا نیم جاں میں لیکن
شکل تیری کے میاں بند ہیں کیتے آن کے
اندام گل پہ ہو نہ قبا اس مزے سے چاک
میں دیکھی دشمن ایمان لٹک پل گوش میں در کی
پان کھا کھائے آرسی کے بیچ
جلوہ ماہ تہ ابر تنک بھول گیا
کیا بدن دیکھا جسی چولی سے ہائے
چلے ہیں نو ندھے سہتا ہے کمنی جھمکی چولی سے ہر
سیر کے قابل ہیں تنگ پوشی ان کے
لطافت قبائے تنگ پہ گل کے بجا ہے ناز
چولی بہانہ سے مسکی پھر آنکھیں وہیں جھکیں

مسّی دو انگلی مل کر کھایا جو پان مارا سودا
منہ کی مسّی ریکھ کی لالی کے لب پان سمجھے ،،
جوں خوش جنھوں کے تن پر سکتی ہیں چولیاں ،،
نگاہِ سرمگیں کیا کہوں جادو کا سی ترکا ،،
اپنے ہونٹوں کو دیکھتا لال ،،
ان نے سوتے میں دوپٹے سے جو منہ کو ڈھانپا ،،
مار حسرت ہی کے ہم جان سے گئے میر
قبا اس کی ہے تنگ پوشی بہار اجی تو بند تنگ آیا ،،
کہنیاں پھنسے چولیاں چست ،،
دیکھی نہیں ہے ان نے تری چولی چست ہی ،،
جیب پیرہن گل بھی اس چولی سے چسپ جائے ،،

ناز و نیاز[1]

ہو جاؤں خون کیا تیرے پر کہیں گے نیک و بد
جو کہانیاں ہوں عاشقوں میں تیرے
لیتا ہے تو کسی کا تو دل لے سمجھ سمجھ
ہردم تو مجھے اپنے کوچہ سے نکالے ہے
دل سا تم چیز کو بے قدر کئے دیتے ہو
مول لیتے ہو جو اس دل کو تو یوں ہیں لیے
تم جس کی تمنا کرتے ہو کیا بات ہے اُن کی

بے وفائی اس سے کرنی تھی فلانے سے بعید سودا
بولا وہ مسکرا کے یہ نہ کہو ،،
با تمنا نہ جان اس کو بلکے سمجھ بوجھ ،،
جاؤں ہوں بھلا اب میں لا دل مرا دیدے ،،
کیا میں تم سے کہوں افسوس بتاں ہائے بتاں ،،
تم دیئے دام مجھے اور میں پھر پیسے بتا ،،
لیکن ٹک ادھر دیکھیو اے یار بھلا میں ،،

---

[1] غیر لکھنوی حضرات ناز و نیاز کو معاملہ بندی کہتے ہیں اہل لکھنؤ کے نزدیک یہ مکروہ لفظ ہے۔

تو وہ شب میں جو جاگے میں بجائے ہیں
یاں تک ستا نہ مجھ کو کہ رو رو کہے تو ہائے ،،
پوچھا کسی نے مارا تو سودا کو کس لیے ،،
راتوں پاس پاس گلے لگ سوئے ننگے ہو کر

اتنا بھول ہو مرے یار نہیں بھائے سودا
یار دنہ تم سنا کر فلانے نے کیا کیا ،،
بولا مجھے وہ گھورتے تھا ہر آن آن ،،
دن کو بے پردہ نہیں ملتے ہم شرماتے ہیں ہنوز میر

روزمرہ

چاہو تو گولی بھر کے اٹھا لو تمہیں ابھی
اتنا کہا نہ ہم سے تم نے کبھو کہ آؤ
بات کہو کیا چپکے بیٹھے ہو یہاں آکر !
ہاہا ہی کر رہا کہ اسکا غرور دیکھا کی
جو ہتک پڑی بہتی ہیں دیکھا میں گلستاں میں
لطف آنے کا ہے کیا بس نہیں اب تاب جفا
میں کہا ہو کر دل جو لیا کون ہے وہ
جب کہا میں کہ تو ہی ہے تو پھر کہنے لگا
چھن گیا سینہ بھی کلیجہ بھی !!
کیوں تری موت آئی ہے گی عزیز
جان کچھ چپ رہا جو میں بولا !
میں کہا میری جان بلب ہے شوخ
کہنے لگا کہ نہ واہی بک اتنا !
مرمت دشمنا غفلت بنا ہا !
ہیاں وہاں بھائی دل ادھر ہاں دل
خدا جانے ہے اس شوخ سے کیا

کیسے ہی بھاری ہو مرے گے تو بھلا ہو میر
کاہے کو یوں کھڑے ہو دھوپ سے بیٹھ جاؤ ،،
ایسے گونگے بیٹھے ہو تو بیٹھے اپنے گھر جاکر سودا
گھگھیائے سے اب کیا حاصل یوں نہیں تو نہیں کریں ہا آ !!
تجھ قد سے خجل ہو کر شمشاد بہت رویا ،،
اتنا عالم ہے بھرا جاوے کیا میں ہی ہوں !!
یک بیک بول اٹھا اس طرف آئینہ ہی ہو ،،
کیا کریگا تو مرا دیکھو تو جاسیں ہی ہوں ،،
یار کی تیرے جان نے جا بھی ،،
سامنے سے مرے ارے جا بھی ،،
کس کا قصہ تھا ہاں کہے جا بھی ،،
کر نہ کوئی خبر کو بھیجا بھی !!
کیوں ہوا بستری آپ سے جا بھی ،،
ادھر ٹک دیکھ لیجو مڑ کے آنا !
مجھے تو چھوڑ کے جاتا ہے کہاں دل ،،
اے میرے لال میرے بے زبان دل ،،

ہجر و فراق

جب رات سر پٹکنے نے تاثیر کچھ نہ کی
ناچار میرؔ منڈ کری مار سو رہا میرؔ

آشفتہ ہو جو اس کی پریشاں خراب حال
دیکھو مجھے تو خبطی دیوانہ سڑا کہو سوداؔ

ملا جو عشق کے جنگل میں خضر تو نے کہا
کہ خوف شیر ہے مخدوم یاں کدھر آیا!

جب غبار اپنے جی کا نکلے ہے
در پہ رہتی ہے اندھی کیسی دھوم "

خمریات

جب پیر مغاں سے میں جا دختر رز مانگی
بولا کہ سعادت ہے پر وہ ابھی بالی ہے

تقدیر ترک سے ہے مجھ کو روز دیتے لے زاہد
جو پکے سہو سے گاہے تو پی جاتا ہوں وہ کچھ

دختر رز سے ہمارا باندھ دے گر تو نکاح
خوب سا کھلونا پیش اے ملا تجھے شکرانہ ہم "

شیخ و واعظ

کیا پشم اکھاڑے گا بھلا شیخ تو دیکھیں
رندوں کو دھرا آتا ہے جو ریش اپنی پکڑ کر

تھا ڈاڑھی تیری واعظ مسجد ہی میں منڈوا آتا
یہ کیا کہ ساتھ اپنے جام نہیں رکھتا "

کچھ بھی نسبت نہ تھی جب پیر میں آیا تھا شیخ
ہم حرم میں بھی تو ترسے داماد رہے "

پہلے جو ہم مست آگئے سو بار مسجد سے اٹھا
واعظ کو مارے خوف کے کل لگ گیا جلاب

شیطنت سے نہیں ہے خالی شیخ
اس کی پیدائش احتلام سے ہے "

رقیب

دبکے ہے اس طرح تو مجھے دیکھ کر رقیب
چوہے کی بھانت جا ہے لکڑوں میں بلا

جو یوں نہ لکھی دکھاتا ہوں تو دا آتا ہے کو ہے
رقیب آگئے ترسے ہے مجھ سے ستی گھر کی "

اے غیر زہر تجھ کو گر جوتیاں نہ ماریے
سیدھا نہ ہوئے پھر تو کوئی چارہ ہے "

حیات و کائنات کے مسائل

انھیں طاقت و تلخ بجا ہے پر نہ سفلہ پرور
مسلے کرتا نہ کیجے بخشش فہم سے میر کی

خطرہ ہے تجھ سے مسند شاہی کو اے فلک
حاضر ہے پوستین مرا پشم تو اکھاڑ سوداؔ

یہ دست جاہ دنیا کا نہیں کم مال زادی سے
کہ اس پر رو رو دیے سیکڑوں جیسے از رہیں

محبت سے اس جہاں کی کوئی خلاص ہو گا
اس فاختہ پہ سب کے اساک ہو گیا ہے "

مال دنیا سے ہے کیا بہرہ ہمیں
پاس رنڈی ولے ہے ضعف باہ "

ان اشعار میں مضمون آفرینی ہے مگر کیا بات کہیں اور کس طرح کہیں کا شعور مفقود ہے الفاظ مضمون اور طرز ادا سب میں بھونڈا پن اور ابتذال ہے اور دو تہائی سے زیادہ کلام ان لوگوں کا ایسا ہی ہے اس پر مستزاد طولانی غزلیں بلکہ دو غزلہ سہ غزلہ قافیے بھونڈے ردیفیں لمبی جن سے زمین ناہموار اور سخت ہو جاتی تھی اور اسی میں شعر کہنا استادی سمجھا جاتا تھا کچھ ردیف و قافیے میر و سودا کے دیکھیے۔

جبیں میرے پر	کہیں میرے پر	بانداز فلک پر	گرد از فلک پر
مہمان بھی رات	جان بھی رات	آب در تہ آب	داب تہ آب
یاں دن دو چار میں	گزار دن دو چار	چھپا ہے آتش کا	سیماب آتش کا
رہ تنگ اور رنگ	رنگ اور رنگ	گل کی اشارت	بلبل کی اشارت
ننگ و ننگ شکستہ	رنگ و خشت شکست	گنہگار نہ سودہ ہو	تلوار نہ سودہ ہو
تکیہ تو کہو	بلبل میں بھی ہو تو کہو	چھپاتی ہے میاں	جاتی ہے میاں

دیہاتی اور گنواری لفظیں بے تکلف استعمال کرتے تھے۔

دل تو نے لگا کے آن میں جاتے ہیں تاؤ سے
دل داغ ہوا ہے پہ جس کے "سبھاؤ" سے

جو دیر تلک کہا کہتے تھے شیخ جی سرکش
پر اب عمامے نے گردن تنگ "نرائی" ہے

ہوئے تو جسے کیے میں وارد ہوا گھر اس کے
"پت" رہ گئی کہ ان آنکھوں ہی میں "دھرایا"

پھر اپنے جاکے جیب بھی رہتے یا نہیں!
"پھالے" میں پاؤں دیے کو لے کہاں سے تم

آیا ہے زیر زلف جو رخسار کا سطح ! / پان "سانجھ" کے تئیں بھی سحر کا سماں ہے آج
دل ہی کے غم میں گذرے وہ دن جو کہ رہتے / "ہیچ" ہے اس نگر سے جاتا نہیں دل اچھ
گو وہ ہر جائی اسے اپنی اور / ہر طرف کو گمان جاتا ہے

تذکیر و تانیث کا شعور نہ تھا

بود نقش و نگار سا ہے کچھ / صورت ایک اعتبار سا ہے کچھ — میر
شب اسی کوچہ میں جاتا ہوں اس توقع پر / کہ اک دوست ہے واں خواب پاسباں میرا
ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا / موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہ طور کا
جا ڈوب گئی اپنی اندوہ کے دریا میں / سے جوش کہاں اب ہم مدت ہوئی

ایک ہی لفظ کو مونث بھی باندھتے تھے اور مذکر بھی۔

جان اپنا جو ہم نے مارا تھا !! / کچھ اسی میں ہمارا وارا تھا — میر
پھرتے پھرتے تلاش میں اس کی / ایک میرا ہی کھویا نہ جان گیا
سیکڑوں جیسے کا جان گیا / پر نہ تیرا یہ امتحان گیا
ہر چند جانیں جاتی ہیں پر تیغ جور سے / تم کہاں سر کی سوں تم ہاتھ مت اٹھاؤ
اب جان جسم خاک سے تنگ آ گئی بہت / کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے
ظاہر کی بھی رہتی ہے پھر جان چمن ہی میں / گل نے آئے بہار وہ بھی جو آئی سال آیا

زنانی اور مردانی بولی میں فرق نہ تھا اللہ کی سوں وغیرہ باتوں میں اب بھی عورتیں بولتی ہیں محاورہ استعمال کرنے کا شوق لطف زبان کے بجائے بھونڈا پن پیدا کر دیتا تھا۔

ناصحا کچھ یہ نصیحت سے نہیں ضبط رشک / طفل تو دے نہ کبھی ہو سرکے قدم سے باہر — سودا
گر قصد ادھر کا ہے تو ٹک دیکھ کے آنا / یہ دیر ہے نہ یاد نہ ہو خانہ خدا
راحت پہنچی تم سے تو رنج اٹھایا برسوں تک / سر سہلائے ہو جو کبھی تو بھیجا بھی کھا جاؤ
کام میرا تیرے غم میں جب کہوں ہو جائے گا / میں یہ کہتا ہوں تو کہتا ہے کہ یوں ہو جائے گا

صنعتوں کے استعمال کا بھی سلیقہ نہ تھا

چوڑائی میں ملک اپنی عدو اور بھی جم لے / لمبا کروں ہوں دیکھ تو کیا تجھے دم لے — سودا
طائر فریب کیسا ہے وہ شکار پیشہ / مرغان باغ سارے گویا ہیں اس کے سارے — میر
دہقاں پسر وہ ہم سے یوں صلح کر گئے ہے / بوٹوں کے کھیت اوپر جیسے نہ جنگ ہووے
وہ تو بچے کا ہرگز لکھے نہ ہم کو نامہ / گدڑی میں جا کبوتر لیتا ہے مول گولے
تم نے دیکھا ہوگا بچپن میر کا / ہم کو تو آیا نظر وہ خام سہل
ترش رو بہت ہے وہ زرگر پسر / پڑے ہیں کھٹائی میں مدت سے ہم

ضروری علامتیں حذف کر دیتے تھے ؎

دن رات ہر پلک نے مری جھڑی لگائی / کیا جانے آنکھ تجھ سے میں کس گھڑی لگائی

فارسی الفاظ کے صرف کا بھی سلیقہ نہ تھا ؎

دل جو پر بیقرار رہتا ہے / آج کل مجھ کو مار رہتا ہے — میر

محاورے کا صرف بھی نہیں جانتے تھے ؎

پوچھ کے حال تو پھر سنتے نہیں / بس مجھے اور نہ بکوائیگا — میر

ان ناہمواریوں کے ساتھ امرد پرستی اس کا موضوع غزل بنا اور اس حد تک کہ زمانہ میں جن کے خرچے روپیہ ٹھانسا کرتے تھے ان کے آنوں پر میر ان سب پر مستزاد ہجو جس کی بنیاد فحش پر تھی مرزا مظہر جانجاناں جو عالم صوفی فقیہ سب کچھ تھے ابرو کو کہتے ہیں ؎ ابرو سب شاعروں کی جھانٹ ہے
ابرو کا جواب ؎ جانجاناں لیشم ہے
سودا ضاحک کی ہجو یوں کرتے ہیں۔
ضاحک نے تب کہا یوں چھپیاں کب ہیں گوڑے ہو تب شیخ سعدو بولا استغفر اللہ...
فدوی سودا کو کہتے ہیں ؎ بھڑوا ہے مسخرہ ہے سودا اسے ہوا ہے۔

مصحفی و انشا کا دور

اس دور میں زبان کچھ صاف ہوئی مگر مضمون کا بھونڈا پن بیہودگی ابتذال باقی رہا نیز غزل سے چونکہ تنگ کی نوبت آگئی ردیف قافیہ کی ناہمواری اور بڑھ گئی انشا کے دیوان سے صرف ردیف الف کے کچھ ردیف و قافیے دیکھئے

بچھایا بسترا ۔ بگایا بسترا — بنار نے غش کیا ۔ قرار نے غش کیا
چیٹ سے غش کیا ۔ غٹ سے غش کیا — تنگ میں کیڑا ۔ رنگ میں کیڑا
تھنوں کی ہوا ۔ بختوں کی ہوا — چراغ ٹھنڈا ۔ دماغ ٹھنڈا
سیماب کا گٹکا ۔ بیتاب کا گٹکا — قلقل کا منہ چڑھایا ۔ بلبل کا منہ چڑھایا
ہرآن یہ گالی دینا ۔ نقصان یہ گالی دینا — ادھیڑے جا ۔ چھیڑے جا

دس پانچ غزلیں ایسی ملیں گی جنکی ردیف و قافیے مناسب ہوں پورا دیوان اسی طرح کی ردیف و قافیوں سے بھرا پڑا ہے ان میں کوئی اچھا شعر کہنا ممکن ہی نہیں۔
مضمون اور انداز بیان کا بھونڈا پن اور ابتذال دیکھئے ؎

منظور ایک بات اگر ہو تو آئیے — گلشن میں اک کنارے ہے چینیا چھا خوب جا
کب چاہتا ہوں میں قصر ملاقات کی ٹھہرے — جب خوش ہو مرا دل کہ جب اس بات کی ٹھہرے
بھلا آپ ٹھہرائے کس واسطے — کبوتر کا باہم جو جوڑا لگا
اس ستمگر سے ہمارے جو کسی نے پوچھا — کوئی رنگین بھی ترے کوچہ میں یاں بستا ہے
کچھ تو اک تاؤ سا کھا چیں بجبیں ہو کے دیا — گالی دیکر یہ کہا ان نے کہ ہاں رہتا ہے
جب میں نے کہا کہ مجھ کو تم سے — ملنے کا ہے اشتیاق بے حد
یکبار وہ کھلکھلا کے رنگین — بولے کہ چہ خوش چرا نباشد
یاد کیا آتا ہے وہ میرا لگے چلنا اور آہ — پیچھے ہٹ کر اس کا یہ کہنا کہ لو آ جائیگا
یار کا در پر نکلنا اس دل بیتاب سے — کوئی گر جھوٹوں کہے گا تو یہ رنڈوا بگڑ جائیگا

مت یہ گھبرا کر کہو اب گھر کو پنڈہ جائیگا — کوئی مرجائیگا صاحب آپ کا کیا جائیگا
ڈوبے یوں بحر محبت میں کہ اب جیتے جی — اپنا دشوار ہے اوپر کو اچھل کر آنا
ورنہ ذل کہنا مرا شاید کہ اس نے سن لیا — ورنہ کیوں مجھ کو دھر آ کے ہے سمجھا کیا
کل جو تونے یہ سنے ٹک دھیان اس پر کیا — ہنس کے یوں کہنے لگا کیا آنکھ میں کچھ پڑ گیا
جان بلبل سن کسی سے وہ مجھے یوں بولا — میری بیزار سے میں نے دوپٹا جو کو کیا
شب گھر جو رہا گئے وہ مہماں — تھا صبح یہ کس ادا سے کہتا
طاقت نہ رہی بدن میں ہے ہے — قربان گیا یہاں کا رہنا
شب کیا وہ چپکے چپکے وہ شوخ و شنگ بولا — دیکھو نہ ہم رہیں گے گر پھر پلنگ بولا
تبھی سے ہم کو کہتا کہ چل بے والے ہو جا — معلم اس کو جن روز دن [illegible]
اپنے کوچہ میں مجھے دیکھا تو یہ کہنے لگا — تو جو یاں رہتا ہے جرأت تیرے گھر کو کیا ہوا
جب میں نے کہا ادب بد نام و رے آ — تب کہنے لگا چل بے ادب بد نام پرے جا
میں نے جو کہا ایک تو بوسہ مجھے دیدے — بولا کہ زباں اپنی کو تو تھام ارے ہاں
ہوں گے دم میں تہ و بالا کونین — آپ نتھنوں کو نہ پھیڑ کائیے گا
بیٹھیے پیچھے مرے چلنے سے رکو مت صاحب — کوئی پوچھے تو یہ کہیو کہ مرا نوکر ہے

ایسے سیکڑوں اشعار ان کے یہاں سے اور پیش کئے جا سکتے ہیں اس وقت شاعری یہی تھی اس کے یہ معنی نہیں کہ صاف اور سنجیدہ شعر بالکل نہیں ہیں مطلب یہ ہے کہ ایسے شعر بھی کہتے تھے ان کو شاعری سمجھتے تھے اور اپنے دیوان میں داخل کرتے تھے اس کے مقابلہ میں لکھنؤ کی شاعری میں زبان کی صحت روانی و سلاست فصاحت و بلاغت ہے۔ گنواری اور بازاری الفاظ نہیں ہیں ادائے مطلب میں جدت تشبیہ و استعارہ کی

؎ اسی مضمون کا ناسخ کا شعر ہے ؎
ہو گیا قرآن کا پڑھنا غضب — درد اسکو لن ترانی ہو گیا

کی ندرتیں ہیں اور یہ خوبیاں فتہ رفتہ نہیں بلکہ ایکا ایکی انقلابی صورت میں پیدا ہو گئیں اور یہ ناسخ کا بڑا کارنامہ ہے مولانا امداد امام اثر نے سچ کہا ہے کہ اگر ناسخ نہ ہوتے تو اردو زبان و شاعری آج اتنی شائستہ نہ ہوتی۔ یہ فرق ناسخ اور ان سے پہلے کی شاعری کے موازنہ سے واضح ہو جائیگا مگر میر و سودا کے بہت سے مضمون کا ناسخ کے یہاں وجود نہیں جیسے ؎

قدم کے چھونے سے اسناد گی مجھے سی ہوئی
کبھی وہ یوں تو مرے ہاتھ بھی لگا ہوتا — میر

شوخی تو دیکھو اپنی کہا آؤ بیٹھو میر
پوچھا کہاں تو بولے کہ میری فلاں پر — ،،

کیسا اب زہد و تقویٰ وارد ہے اور ہم ہیں
بنت العنب کی اپنا کچھ گیا شب گھر پڑ کر — ،،

نہ پوچھ کچھ لب ترسا بچہ کی کیفیت
کہوں تو دختر رز کی فلاں جل جائے — ،،

اثبات کر کے تم سے اک بات اب کہوں میں
لیکن نہ کہنے لگیو مجھ پہ یہ جو تیا ہے — سودا

سرین میں اتنی جھلکی لی بذکر جام زاہد نے
کہ جتنا شیخ کو مذکور ا نگلا تا ہے شیشہ کا — ،،

شیخ وہ رشتہ ہے زنار ہمارا جس نے
پھاڑ ڈالی تیری تسبیح کے ہر دانے کی — ،،

شیخ کو ذوق اچھلنے سے نہیں محفل میں
اس بہانے سے مٹکاتا ہے وہ اپنی چل کو — ،،

لے گھسے حجرہ میں خادم کو کہ ہم جا پہنچے
شیخ صاحب سے کرامات نہ ہونے پائی — ،،

عزلت محل شیخ کہ تیرنے لئے تیار
کوئی ہفتہ گزری میخ کوئی وہ دجبی ہے — ،،

ایسے مضامین ناسخ کے یہاں نہیں موازنہ کے لئے ایک موضوع کے اشعار دیکھئے۔

کلام ناسخ!

تغزل

چلائیں صور بد مست ٹھوکریں کھاتا
وہ یوں چلے کہ کوئی ساغر شراب چلے

خرام ناز تو اس کوچہ گرد کا دیکھو
نہ اس طرح کبھی صحن چمن میں آب چلے

دوڑتے ہیں دیکھنے والوں کے دل بے اختیار
ہے غضب انداز او ظالم تری رفتار کا

چلنے سے ٹھہر جاں اپنی ٹھہر جاتی ہے
جب ترا جلوۂ رفتار نظر آتا ہے

وہ چشم فتاں ہے غیر مل وہ زلف پیچاں رشک سنبل
عذار ہیں شباہت گل بدن ہیں عالم یاسمن کا

شاعری ہم کو کر دیتے ہیں بسمل کیونکر
تیر رکھتے ہیں پر نہ کمان رکھتے ہیں

لباس و سامان آرائش

منہ دیکھیں آفتاب پرست آفتاب کا
سرکا دے اپنے چہرہ سے کونا نقاب کا

رات گھٹتی ہے تو بڑھتا ہے فروغ آفتاب
حسن رخ چمکا تو اس نے زلف کو کم دیا

کرے تیرے مسی آلودہ ہونٹوں کی ثنا خوانی
خدا نے اس لئے اتنی زبانیں دی ہیں سوسن کو

بالے موتی کے ہیں تارے رخ تابان آفتاب
تیرے آنے سے ابھی بام آسماں ہو جائیگا

بندہ بالی میں نہیں تعویذ بازو میں نہیں
وہ ستارہ صبح کا ہے یہ ستارہ شام کا

سرخ پوشاک پہن کر وہ سہی قد جو گیا
جل اٹھے سرو چمن مثل چنار آپ سے آپ

نازونیاز

یاسمن دھوپ سے ہوئے گل تر
دیکھو آئنہ میں عذار اپنا!

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے نہ کوئی
دل ہی دل میں تمھیں ہم یاد کیا کرتے ہیں

اب تو جی کہوں کے دن رات کرو ظلم و ستم
ناتوانی سے مجھے طاقت فریاد نہیں

کہتے ہیں تیرے عارض و قامت کو دیکھ کر
بالائے سرو پھول کھلا ہے گلاب کا

آئینہ دل میں ہے ترا عکس
دن رات میں تجھ کو دیکھتا ہوں

خمریات

پیشتر نشۂ ایجاد سے مدہوش ہوں میں
خم گردوں بھی نہ تھا جب سے کہ مے نوش ہوں میں

کہتے تھے فاش نشہ میں بد مست سر غیب
اس واسطے حرام کیا ہے شراب کو

حاجت نہیں ساز کی مستی میں زاہدا
کیا مرتبہ خدا نے دیا ہے شراب کو

لالہ و گل کا جوش ہے بلبلوں کا خروش ہے
فصل وداع ہوش ہے موسم نائے و نوش ہے

حشر تک جی میں ہے بے ہوش رہوں اے ساقی
کاش مے بھر دے مری عمر کے پیمانے میں

حیات و کائنات کے مسائل

ہر کسی کام رکھتا ہے ادھورا انساں
گر ہمہ پا سر شوریدہ تو پتھر نہیں

رنگ عشرت باغ عالم میں نظر آتا نہیں
گل کو گل چیں کا خطر بلبل کو ڈر صیاد کا

دو روز ایک وضع پہ رنگ جہاں نہیں
وہ کون سا چمن ہے کہ جس میں خزاں نہیں

پژمردہ ایک ہے تو شگفتہ ہے دوسرا
باغ جہاں میں فصل بہار و خزاں نہیں

جدت ادا

اے پری مکھڑا ملا ہے کیا ہی پیارا چاند کو
رات میں نے تیرے دھوکے میں پکارا چاند کو

اس کی ہر دم کی نصیحت سے میں تنگ آیا ہوں
کاش صبح سے بھی آنکھ اس سے لڑائی ہوتی

تعبیر ہے کہ یار کی پڑجائیگی نگاہ
بجلی گری رات کو کل مجھ پہ خواب میں

بے خودی میں یہ کون یاد آیا!
خود بخود دل ہے بے قرار اپنا!

ہجر و فراق

میں نے یہ جانا کہ میری طرح ہے فرقت نصیب
آنکھ میں جس کی نظر آیا کوئی آنسو مجھے

مرگ اک سوتی تھی ورنہ یہ کراہا خوب کو
کہ جہاں کو ترے بیمار نے سونے نہ دیا

ناسخ غم فرقت میں یہ ہے حال ہمارا
جب کھینچتے ہیں آہ تو آتا ہے جگر ساتھ

پاس ہے نظارۂ رخسار آتشناک سے
آگ لگ اٹھی ہے دل میں شعلۂ ادراک سے

صنعتوں کا حسنِ استعمال

جس قدر ہم سے تم ہوئے نزدیک
اس قدر دور کر دیا ہم کو!

رہے وہ گل چمنستان دہر میں شاداب
دکھا کے سرو سا قامت کیا نہال مجھے

وحشیو کہتی ہے زنجیر باواز بلند
پستہ عقل ہے جو ہے غم سے وہ آزاد نہیں

زاہد و واعظ

نہ پائیں زاہد لے آبروئے شراب کہیں
نہ اپنے ساتھ کہیں کھوئیں آبروئے شراب

کسی نعمت سے میں واقف نہیں جز بادہ تلخ
زاہدا اب تو سمجھ تارک لذات مجھے

محو بھی دھڑکے عذاب حشر کے
زاہدا تیرا ہی یہ دل گردہ ہے

حسن بھی کیا چیز ہے زاہد ذرا انصاف کر
اپنے بندوں کو خدا دیتا ہے لالچ حور کا

فراق یار میں فرصت ہے مجھ کو بادہ خواری سے
کہیں زاہد نہ کردے متہم پرہیزگاری سے

دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کے تقابلی مطالعہ سے ظاہر ہوا کہ وہ ناہموار روش زبان کی ناہمواری طرز بیان کی ہمواری مضامین کی ناہمواری لب ولہجہ کی ناہمواری تہذیب و شائستگی کی ناہمواری ہے اس وقت تک ناز حسن اور نیاز عشق کی حکایتوں ہجر و وصل کی کیفیتوں کے بیان کا سلیقہ نہ تھا بھونڈاپن ناشائستگی اوباشانہ لہجہ بیہودہ باتیں بھونڈی زبان اور بھدی ترکیبیں عام تھیں ناسخ نے اس طوفان بے تمیزی کو روکا اور شاعری کا رخ تہذیب و شائستگی حسن بیان لطف زبان اور طرز ادا کی ندرتوں کی طرف موڑ دیا اور ایک ایسا راستہ بنا دیا جس پر وہ آگے بڑھتی رہی۔

لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا اسلوب

آتش کا طرز لکھنوی شاعری کا دوسرا اسلوب ہے

ناسخ نے زبان کی سلامت و روزانی تہذیب و شائستگی ضائع و بدائع تشبیہ و استعارہ کنایہ اور تمثیل مضمون آفرینی اور طرز ادا کی جدتوں سے شاعری میں جو فضا پیدا کر دی تھی اس سے نکلنا ممکن نہ تھا کیونکہ لطف زبان اور حسن بیان اسی پر منحصر تھا۔

آتش اس معاملہ میں غیر شعوری طور پر ناسخ کے متبع تھے لیکن ان کے یہاں ایک بات اور بھی ہے اور وہ عاشقانہ جذبات کا خلوص حسن و جمال کے تاثرات، والہانہ کیفیت ہے

آئینہ سامنے رکھتے تو غش آ جاتا
آنکھ اگر آئینہ سے تم نے لڑائی ہوتی
چمک چمک کے نکلنے کا حال کھل جاتا
کسی صورت سے نہیں جان کو قرار اے آتش
رات بھر کہیں دل بیتاب سے باتیں ہم نے
تصور سے کسی کے کی ہے میں نے گفتگو برسوں
یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
فراق یار میں دل پر نہیں معلوم کیا گزری
شباب تک نہیں پہنچا ہے عالم طفلی
ہم سا حسین ہو یا نہ تو کیونکر نہ آتش پھر
کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا

تم نے انداز نہیں اپنی ادا کا دیکھا
رات بھر میری طرح نیند نہ آئی ہوتی
کیسے دکھائیے وہ رخ چشم مہر و ماہ نہیں
طپش دل مجھے لاچار لیے پھرتی ہے
رنج فرقت کے گرفتار نے سونے نہ دیا
رہا ہے ایک تصویر خیالی روبرو برسوں
ہم اور بلبل ناشاد گفتگو کرتے
جو اشک آنکھوں میں آتا ہے سو بیتاب آتا ہے
ہنوز حسن جوانی یار راہ میں ہے !
ناز بجا و غمزہ بے جا اٹھائیے
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

ذہنی شاعری | ناسخ کی شاعری ذہنی ہے اس میں ان کا دل شریک نہیں جن لوگوں کو مضمون آفرینی میں لطف آتا ہے ان کا ذہن موجد و فلسفی کے ذہن سے مماثلت رکھتا ہے ان میں حسن کی کرشمہ سازیوں سے متاثر ہونے کی صلاحیت کم ہوتی ہے ایسے لوگ ناسخ کے دلدادہ ہیں۔

قلبی شاعری | تاثرات کا اظہار قلبی شاعری ہے ایسے شاعروں کا بھی ہر شعر ایسا نہیں ہوتا ان کے یہاں بھی ذہنی شاعری کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ مگر ان کی قلبی کیفیت ان کی زبان اور لہجہ میں اثر اور کیف پیدا کر دیتی ہے جن لوگوں میں جمالیاتی احساس پیدا ہوتا ہے وہ آتش کے گرویدہ ہیں اور ذہنی شاعری کو پسند کرنے والے بھی اس میں ایک کیفیت محسوس کرتے ہیں کیونکہ بہر حال ان کا دل بھی حسن کی کشش سے یکسر خالی نہیں ہوتا مگر قلبی شاعری کے دلدادہ ذہنی شاعری سے محظوظ نہیں ہوتے کیونکہ وہ دماغ سے ادراک کے نہیں بلکہ دل سے محسوس کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

لکھنؤ کی اصلی شاعری | یہ دونوں رنگ ناسخ و آتش اور ان کے تلامذہ تک الگ الگ نظر آتے ہیں مگر ان کے بعد کے شعراء میں دونوں رنگ سموئے ہوئے ہیں کیونکہ تاثرات عشق سے تو کوئی دل خالی نہیں ہوتا کم زیادہ کا فرق ہے بعد کے شعراء نے قلب و دماغ دونوں سے کام لیا ہے اور یہی لکھنؤ کی اصلی شاعری ہے۔

ناسخ کی تحریک | ناسخ زبان مضمون لہجہ انداز بیان اور تہذیب و شائستگی کا ایک سیلاب اپنے ساتھ لائے جو تمام خس و خاشاک کو بہا لے گیا پھر بھی دو غزلہ سہ غزلہ باقی رہا ردیف و قافیہ کا بھونڈا پن تو دور ہو گیا مگر مشکل ردیف و قافیہ رہ گئے میری بلا سے۔ جانی۔ پستان اور ساق باقی رہ گئی ناسخ کا مصرع ہے ے دکھوں میں ساق ساقی گلفام دوش پر

ان کے شاگردوں نے یہ ناہمواریاں کم کیں بہت سی لفظیں ترک کیں اور شائستگی میں ایک قدم اور آگے بڑھایا مگر مشکل ردیف و قافیے اور دو غزلہ سہ غزلہ باقی رہا حسن و عشق کے بیان میں کبھی کبھی متانت و شائستگی کی حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔

لکھنؤ کی شاعری کے دوسرے دور (جلال امیر مینائی) میں ردیف و قافیہ کی ناہمواری کم ہوئی تہذیب و شائستگی بڑھی پھر بھی ایسا مال رہ گیا جس کو الگ باندھ کے رکھا تھا اور اس سے تہذیب کی نگاہیں نیچی ہو جاتی تھیں۔

تیسرا دور جاوید عارف رشید مرزا رسوا اور نظم طباطبائی کا ہے اس میں زمینیں نہایت شگفتہ ہو گئیں ردیف قافیہ کی ناہمواری دور ہو گئی اور شاعری پہلے سے زیادہ مہذب و شائستہ ...... ہو گئی پھر بھی امیری جان۔ جانی سخنہ میں زبان ایسی باتیں باقی رہیں۔

چوتھا دور صفی عزیز محشر آرزو کا ہے اس میں زبان و شاعری کی تمام ناہمواریاں دور ہو گئیں زمینیں شگفتہ غزلیں مختصر اور شاعری مہذب ہو گئی۔ یہ دور دو سو برس کی شاعری کا جوہر اور ناسخ۔ آتش کی شاعری کی معراج ہے اسی دور سے بہتر شعرا اردو میں نہیں کہے گئے۔

پانچواں دور مرزا جعفر علی خاں اثر کا ہے جو ملک غزل کے تنہا فرمانروا تھے یہ شاعری کے خاتمہ کا دور ہے کیونکہ اس پایہ کے شاعر پھر نہیں پیدا ہوئے یہ ہے لکھنؤ کی شاعری کا مختصر جائزہ۔ اس میں ہر دور کے شعرا کا کلام تمام شعرائے ہندوستان کے لئے مشعل راہ رہا ہے اور آج بھی ہے جدید شاعری کے علمبردار اگر اس کا بغور مطالعہ کریں تو ان کو اپنے اشعار کے نقائص کا... اور شاعری کا فن معلوم ہو سکتا ہے۔

--:--

لکھنؤ کی شاعری

کیا ہے ناسخ نے آسماں سے بلند تر پایہ اس زمین کا

دورِ اول

ناسخ و آتش اور ان کے تلامذہ

ناسخ

مست ہے عالم مرے اشعار کی تاثیر سے
مثل مینا کے ٹپکتی ہے مری تقریر سے

پھر بہار آئی چمن میں داغِ دل آلے ہوئے
آنکھوں میں منتظر ہیں عبث یار آئے دل
خاکساروں سے ملا کرتے ہیں جھک کر سرنگوں
ہو گیا گورِ غریباں میں عیاں حالِ جہاں
ہر صبح وہی صبح ہے ہر شام وہی شام
رکھتا ہے چرخ اوج کسی کا کب ایک دن
ناسخ شراب پی شبِ تاریک ہے تو کیا
جلا نہ آتشِ سودائے عشق سے جو جیا
یہ رنگ عارض کا رنگ ہے کہ نام خدا
نگہ ٹھہرتی نہیں ایسے عکس پر اس کی
آپ میں دیوانہ چھوڑے ڈالتا ہوں بنا کر
خاک میں ملتی ہے غیرت روندتے ہیں ہم کو غیر
ازل سے عشق کی دولت ہے دیوانوں کی قسمت میں

پھر مرے زخمِ جگر آتش کے پرکالے ہوئے
آتا ہے ناوک نگہ ناز ادھر کہاں!
آسمان ہیٹھی زمیں ہر تو اضع خم ہوا
کاسہ سر جو نظر آیا وہ جام جم ہوا
انسان پر ہے زور فقط انقلاب کا
ہوتا ہے دوپہر میں زوال آفتاب کا
محتاج آفتاب نہیں ماہتاب کا
تو واجب اس پہ جہنم کا بس عذاب ہوا
پڑا جو عکس تراب میں شباب ہوا
شعاعِ حسن سے آئینہ آفتاب ہوا
دستِ نازک سے نہ مجھ پہ صنم خنجر اٹھا
اس گلی سے بس ہماری خاک اپنے سر اٹھا
ملی ہے عقل لیکن بخت برگشتہ ہے عاقل کا

عالم اسباب میں اسباب ہیں عزیز
خلق تک آنکھوں میں جا ہے دیکھنا تو قہر خواب

گیسوئے نکہت گلوں کی خاطر نازک کو توڑنا
گلشن میں عندلیب سے ہیں کیسے چھپائے داغ

عمر گذری اک بت کافر نظر آتا نہیں
حشر میں کیونکر خدا کا پا سکیں گے دیدار ہم

یاں تو دلی بھی سنبھل جاتی ہے گرتے گرتے
شمع کے اثر پر قدم کیا مرے دل نے ہیں

گر آنکھ ہے تو باطن انسان کی سیر کر
کیا کیا طلسم دفن ہیں مشت غبار میں

کیا بھلا شکوہ بتوں کا قصہ موسیٰ سے یاد
رنج دیتا ہے خدا بھی طالب دیدار کو

جو لطف کے پردے میں ہم دیکھتے ہیں خدا
کہتا دیکھنے کی اے کلیم تاب نہیں

ہو گئی نظروں سے غائب تیرے نظارے کی شکل
کاہ تھی ہستی ہماری شعلہ ادراک میں

بولے ہو سنی دیکھ کر اس عارض پر نور کو
کر دیا روشن اسی شعلہ نے شمع طور کو

منہ سب صال کیسے ہوتے ہیں ہم کہاں
ہے زہر ساقیا قدرشہ آفتاب میں

شب زیادہ صبح ہماری ہوئی سیاہ
جو شیب میں کیا نہ کیا تھا شباب میں

خاکسار الفت سے ہے ہر جا سرکشوں کی سرکشی
وہ زمیں ہے کون جس پر آسمان ہوتا نہیں

دم ہے جب جسم عاشق میں ہے خامی کی دلیل
خوب چل جاتی ہے جو شے پھر ہوا ہوتی نہیں

عمر بھر وحشت میں گر صحرا نوردی کی تو کیا
سیر کے قابل جو تھا دل کا بیاباں ہو گیا

ہمارے نالہ بے اثر کی فرو ازالی ہے
گر دیا خاک ہو گی کانہ کیوں بلبل کھنچتے پھرے

مری آنکھوں سے کیا نسبت کہ قطرہ ... کا
قطرہ بیشہ ہو سکتا ہے آنسو ہو نہیں سکتا

اٹھنے لگا ہے کیوں مرے زخم کہن سے
آئی ہے شاید آج ہوا کوئے یار سے

وہ بے نقاب ہوا ہے تو یہ تماشا ہے
دو چار ہونے کی آنکھوں کو اپنی تاب نہیں

انداز کے مہ کہ یہ وحشت غبار لیتا جا
مجھے رکھا ہے میں او شہسوار لیتا جا

دل میں پوشیدہ غم عشق بنا رکھتے ہیں
آگ ہم سنگ کے اندر نہاں رکھتے ہیں

ہماری جامہ دری میں گلوں کی کیا تقلید
یہ وہ جنوں ہے جو وابستہ بہار نہیں

آئی قیامت اس نے لگایا ہے منہ سے جام
ہے اتصال ماہ میں اور آفتاب میں

عشق جب کامل ہوا ہے عین حسن
آگ میں پڑ جائے جو شے آگ ہے

ایک عادت کبھی زمانہ میں ہوا ہم کو نہ اوج
آسمان پر کیا ہمارے بخت کا اختر نہیں

نکہت گل کہتی جاتی ہے زبان موج سے
قابل نظارہ رنگ گلشن عالم نہیں

صدمے اٹھانے والے ہیں روز فراق کے
کیا لائیں ہم شمار میں روز شمار کو

ندے لے جوش بدمستی بہت ترغیب گستاخی
خجالت یار سے ہو گی کبھی تو ہوش آتا ہے

تنگ آ کر جب کہا میں نے کہ مر جاؤں کہیں
بدگماں سمجھا کہ اس کو اشتیاق وصل ہے

ہمارا ہر نفس اک بادباں ہے
روانہ کشتی عمر رواں ہے

مر جاؤں بستر میں الہی وصال کے
فرقت میں زیست کی ہو تمنا اگر مجھے

ایک چھوٹا تو ملی دوسرے کو قید حیات
کبھی ہوتا نہیں یہ خانہ زنداں خالی

نام خدا لیا جو منکرین کے حضور
مر کر بھی اے صنم مجھے اخفائے راز ہے

ڈر تھا اثر کا اس کو سو وہ بھی نکل گیا
نادم ہوا ہوں منہ سے میں لا نکال کے

آب و گل میں اڑ گیا ہے توسن عمر رواں
توڑ کر تار نفس کو تازیانہ کیجیے

اندازہ کر اسر دشمن زے گیسوئے سنبل غبا
کون ہے اک مشت گل میں جو چمن آرا ہوا

اپنا کوئی تو کہاں سگ بھی لڑا کوئی نہیں
سر سودا زدہ بیکار نظر آتا ہے

جانتا ہوں انھیں آنکھوں کو یہ میکدہ آیا ہے
مست جب دم کوئی میخوار نظر آتا ہے

کام کچھ بھی دیدۂ بیدار سے ہوتا نہیں
دولت بیدار ملتی ہے دل بیدار سے

رنج غربت دشمن وحشت کیسی دشمن ہجر دوست
کس طرح ہو شادمانی خاطر ناشاد کی

اس سے پہلے اُردو میں ایسے شعر نہیں کہے گئے۔ ان میں زبان کا لطف، ادا کی خوبی، زندگی کے پیچ و خم، تمثیلات، استعارات اپنی مثال آپ ہیں۔ اس طرز فکر و انداز بیان نے غالب و اقبال کو پیدا کیا۔ غالب نے اس کا احترام کیا۔

خواجہ محمد وزیر وزیر

نشین

تعارف:۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی کی اولاد میں متوکل اور گوشہ نشین آدمی تھے عربی فارسی کی معمولی استعداد تھی شاعری میں ناسخ کے ایسے شاگرد تھے کہ استاد کو ان پر ناز تھا اور ان کی زندگی میں ان کی استادی مسلم ہو گئی تھی استاد نے اپنے اکثر شاگرد ان کے حوالے کر دیئے تھے ۲۲ ذی قعدہ سنہ ۱۲۷۰ھ ۱۸۵۳ء میں انتقال ہوا سنہ ولادت نہیں معلوم انتقال کے بعد ان کے اعزہ و احباب نے دیوان جمع کر کے سنہ ۱۲۷۲ھ میں شائع کیا

گردش سے چشم مست کی دل میں گیا ہے تیر
ٹوٹا ہے دور جام سے شیشہ شراب کا

تھام لو دل کو ذرا ہاتھوں سے
ابھی پہلو سے نہ اٹھ جائے گا

ہو گیا ہے عین دل دشمن کی بھی فریاد ہے
دل نے جب نالا کیا ٹکڑے جگر ہو گیا

مر گئی بلبل جو کیا یاد چمن
غربت میں خدا یاد دلائے نہ وطن کی

قفس تن میں نہ گھبرائیو اے طائر روح
جو گرفتار ہے اک روز رہا ہوتا ہے

ہم اسیران قفس کو بھی ذرا چین نہیں
دھڑ دھڑ کا ہے کہ اب کون رہا ہوتا ہے

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ
اب توقع نہیں رہائی کی

بگڑے ہوئے ہمارے گریباں صبر کے
انگڑائی میں جو یار کی چولی مسک گئی

جب جفا ہوتا ہے تو یوں دل کو سمجھاتا ہوں میں
آج ہے نامہرباں کل مہرباں ہو جائے گا

بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا ہو گا
اٹھ کے چلے حشر بپا ہو گیا

آج مجھ سے بات اگر کرتے نہیں
دیں گے یہ بت کل خدا کو کیا جواب

افزوں کہیں ہیں حسن میں شمس و قمر سے آپ
آئینہ لے کے دیکھئے میری نظر سے آپ

شکر ہے ان بتوں کے کوچہ میں
پہنچے ہیں ہم خدا خدا کر کے

قدر نعمت ہوتی ہے بعد از زوال
پوچھئے لطف جوانی پیر سے

یوسف جو کہنا تھا نہیں تو بدلے
کیا آپ نے مول لے لیا ہے

پہنچی نہ اس کے کان تلک آہ نارسا
کیا فائدہ زمیں سے اگر تا فلک گئی

کچھ حال اپنی زلف کے دیوانے کا نہ پوچھ
بس مختصر یہ ہے کہ یہ قصہ دراز ہے

سر پٹکتا ہوں پلا دے سر جوش مجھے
ساقیا دوڑ کے پھر آنے لگا ہوش مجھے

آ گئی لغزش مستانہ کسی مست کی یاد
دور ساغر نے کیا بزم میں بے ہوش مجھے

اس در پہ ہو کیوں آئے چرخ جفا جو کو اضطراب
دل کو مرے قرار کہیں آ گیا نہ ہو

ساغر عمر کو اللہ نے لبریز کیا
جام تو نے نہ دیا اے بت مے نوش مجھے

با نور ہیں نگاہوں کا غزالان ختن
آنکھوں سے تری سیکھا طرز سخن کو

تصویر کھنچ چکی تو لکھا حشر زیر پا!
مانی سے جب کھنچا نہ وہ انداز چال کا

غنچے چمن میں چٹکے چلی ناز سے نسیم!
انداز اڑایا سب نے تری بول چال کا

راز دل کتنا چھپایا کھل گیا
حال اس دولت سری کا کھل گیا

اگر زمیں کی پوچھی فلک کی اس نے کہی
یہ ان کا آدمی اچھا فرشتہ خو آیا

وہ حال پوچھتے ہیں نزع میں خموشی ہوئی
زبان بند ہوئی وقت گفتگو آیا

کب خبر تھی انقلاب ایسا ہو جائے گا
دوست کا ملنا نصیب دشمناں ہو جائے گا

جلایا طور کو جس نے وہی گرمی تجلی
کہ ہر سے شعلہ آواز گفتگو آیا!

جی ڈھونڈ رہا ہے دل جو کیا دلربا کے ساتھ
نا آشنا کو ہم نے کیا آشنا کے ساتھ

کیا کیا نہ ہم کو اپنی عبادت پہ ناز تھا
بس دم نکل گیا جو سنا بے نیاز ہے

یہ دل بدگماں نہ دیکھ سکے
اگر رہیں بت کے ہو خدا ہمراہ

بہت کچھ کھو کے پائی اس نے راہ خود فراموشی
دل گم گشتہ آپ خضر ہے اپنے بیاباں کا

کسی کی جستجو میں لخت دل آنکھوں میں آتے ہیں
تلاش یوسف گم گشتہ میں ہے قافلہ دل کا

کبھی خورشید نہ افلاک پہ پنہاں ہو گا
لاکھ پردوں میں جو تو ہو گا نمایاں ہو گا

اپنے گناہ آ نہیں سکتے حساب میں
زاہد کو خوف چاہیے روز حساب کا

لہ دیکھ بہتر ہے۔

اپنے جامہ سے ہوا وہ باہر !
ہم بھی آنکلیں گے مسجد میں وزیر
اس کو طاعت پہ غرور اس کو ہے آمرزش پر
ہمیشہ گریہ وزاری رہی کو خونباری
چھپایا جام جو ساقی نے گر گئے پرے اشک
پلا ہوں دامن صحرا سے بیقراری میں
ستم ایجاد جفا کرتے ھیں
بند ھیں وہ ہاتھ حنا سے کیا ہے جن ہشید
نہ دیکھا نقش قدم کا صدمۂ بار بھی
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
نقشہ موئے کمر کھینچا تو بھولا تھا لچک
پھول جب جھڑنے لگے رنگین بیانی سے مری
مثل سایہ سرو سے پامال دیکھو تو خرام
اندھا ہے وہ جس نے ترا دیدار نہ دیکھا
بلبل کی بھلا پوچھتا کاہے کو کوئی بات
بت کہتے ہیں کیا کیا مجھے اس بیدہنی پر
پائے مجنوں جب کھچے زنجیر سی اک بن گئی
یاد جب کرتا ہوں لطف سایہ دیوار کو
مبارک ہو وہ دل کہ جو درد آشنا نہ ہو
کھنچی کبھی تبلیغیر نہ نزاکت سے کھنچ سکی
وسل خجالت نے ابد تک مجھے اٹھنے نہ دیا

جس نے تجھ کو کبھی عریاں دیکھا
خشت خم لے گئے جو ہو آئیے گا
کبر زاہد سے جدا کبر گنہگار جدا
جو اشک ختم ہوگئے تو آنکھ سے لہو آیا
ستارے آئے نکل آفتاب ڈوب گیا
ہوا ہوں طائر بسمل کے زیر پر پیدا
ستم ایجاد کیا کرتے ھیں
کچھ عدو یار سے منظور انتقام نہیں
سمند عمر سا کوئی سبک خرام نہیں
کھینچے تیر انداز ہو سیدھا تو کر دو تیر کو
ہو گئی لغزش یکایک خامہ بہزاد کو
رہ گئی حسرت سے بلبل کھول کر منقار کو
پھول منہ سے جھڑتے ہیں سنیو ذرا گفتار کو
بہرا ہے وہ جس نے نہ سنا تیرے سخن کو
صد شکر دیا نطق نہ غنچے کے دہن کو
اللہ نے صد شکر بنایا نہ دہن کو
خود بخود لغزش ہوئی یہ خامہ بہزاد کو
ڈھونڈھتا پھرتا ہوں جنت میں میں کوئے یار کو
پھوٹے وہ آنکھ جس سے کہ آنسو گرا نہ ہو
قاتل کا کیا قصور جو مری قضا نہ ہو
ہجر میں لگ گئی تھی ایک گھڑی سی تجھ

جیتے جی لیں وہ بت رہا ہمراہ !
دل دیا اس کو پر یہ ڈرتا ہوں
تجھے دیکھا جدھر نگاہ گئی
رنج تنہائی لحد نہ رہا
اس نے تنہا مجھے نہ جلنے دیا !
ناتواں ہے بہت غبار مرا
رہی پائمال گردش اور جامہ داری
لکھ سکا خط میں نہ صفت و صفائے عارض یار
چاہیے اگر فدا تو ہر اک عیب ہو ہنر
آئینے کی وہیں کھل جاتی ہے ساری قلعی
سختیاں حاصل ہوں نہ مرد کا شب فرقت میں ذیر
ایک ذرے تو نہیں ہوتی ہے جنبش بے حکم
قصہ فرہاد کے دھوکے میں حال اس نے سنا
آنکھوں کو کب ہے تاب اسے دیکھیں بے نقاب
جنت میں جائیں یا کہیں دوزخ نصیب ہو
برق باراں جس کو کہتے ہیں مرا افسانہ ہے
دیکھ لیتے ہیں وہ دل میں جو نہیں دیکھا کبھی
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں عجب خواب ناز ہے
حجاب آتا ہے جراحوں کو دل دکھانے سے
دن ہو گیا نمود شب وصل کو یا آگئی !
مجنوں سے کہہ دو کہتے ہیں جوش جنوں سے
گر پڑے پھولوں کے خرمن پہ یکایک بجلی

اب تو بندے کے ہے خدا ہمراہ
دشمن اک دوست کے کیا ہمراہ
تھا تصور زبس ترا ہمراہ
یار کے غم کو لے لیا ہمراہ
غم فرقت کو کر دیا ہمراہ
تو ذرا رہیو اے صبا ہمراہ
کاش لاتے نہ دست و پا ہمراہ
دیدیا آخر کو دست نامہ بر میں آئینہ
موسیٰ کو دید یار یہ بیضا جلا کے ہاتھ
تیرے چہرے کے مقابل جو ذرا ہوتا ہے
سیکڑوں بار جل آئے تو کیا ہوتا ہے
تو جو پھر جاتا ہے تو اللہ پھرا ہوتا ہے
سرگذشت اپنی کبھی ہم نے بھی کس تدبیر سے
گویا کہ ہے حجاب جو وہ بے حجاب ہے
یہ پرستش عمل تو ہمیں اک عذاب ہے
کچھ حقیقت رونے کی کچھ حال بتایا نہ ہے
جام جم کہتے ہیں جس کو کیا یہی پیمانہ ہے
فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے
بھی تیر نگیں سے تیر کس نے دل بہلاتا ہے
اٹھی نقاب کیا مری قسمت الٹ گئی
آتے ہی فصل گل مری تصویر پھٹ گئی
ناز سے ہنس کے جو تو جانب گلشن دیکھے !

محمد رضا برق

تعارف: ناسخ کے شاگرد تھے، واجد علی شاہ کے استاد اور مصاحب خاص تھے۔ بخشی الملک خطاب تھا۔ واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج چلے گئے تھے وہیں ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ میں انتقال ہوا۔ ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑا جو شائع ہو گیا ہے۔

نہ کوئی ان کے سوا اور جہاں جان دیکھا
وہی وہی نظر آئے جہاں جہاں دیکھا

کہیں نہاں نظر آئے کہیں عیاں دیکھا
نئے لباس میں دیکھا انھیں جہاں دیکھا

وہ چند اور محبت ہوئی محبت سے
غضب ہوا جو کبھی ان کو مہرباں دیکھا

دیدار کو ترستے ہیں عاشق جمال کے
پر جل رہے ہیں طائر وہم و خیال کے

عاشق زار کہاں کو وہ غم عشق کہاں
جو فرشتوں سے نہ اٹھے وہ اٹھا لیتے ہیں

بتوں سے جلوہ حق کا ظہور ہوتا ہے
عجیب خاک کے پتلوں میں نور ہوتا ہے

اذان دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

لن ترانی تمھیں زیبا ہے کسے تاب نظر
غش پہ غش آتے ہیں پردہ جو اٹھا دیتے تم

اے صنم وصل کی تدبیروں سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

شکوہ میں نے جو کیا جائے شکایت یہ نہیں
جس سے ہوتی ہے امید اس سے گلا ہوتا ہے

بے اثر نالہ نہیں آپ کا ڈر ہے مجھ کو
ابھی کہہ دیجیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

کب تلک جور و جفا ہم بھی ہیں انسان آخر
حال دل منہ سے کہیں کچھ تو گلا ہوتا ہے

وصل کی رات تو دو پہر کے میں کٹی فرقت کے
آپ کے جانے کے دن دیکھیے کیا ہوتا ہے

بلاؤں میں وہ دل مبتلا ہو گیا
مجھے عشق گیسو بلا ہو گیا

خوش ہو کے ساری رات تو فرقت میں کٹ گئی
لیکن امید آج نہیں ہم کو شام کی

مضطرب سن سن کے وہ رشک قمر ہونے لگا
رفتہ رفتہ نالۂ دل میں اثر ہونے لگا

حسرت موت میں مرتے ہیں ہجر تک عاشق
ہم سے پوچھو کہ شب ہجر میں کیا ہوتا ہے

دیکھ لیجے گا جو لے مالقا ہوتا ہے
کیا کہیں تم سے شب ہجر میں کیا ہوتا ہے

فصل گل آتے ہی عالم میں قیامت آئی
پھر جنوں تازہ ہوا پھر وہی آفت ہوئی

پھر وہی آئی مصیبت وہی آفت آئی
روز ہر مر کے کٹا پھر شب فرقت آئی

خوف کیجے دل مظلوم کی بربادی سے
حشر ہو گا اثر نالہ و فریادی سے

خدا غریب کی سنتا ہے غیب سے فریاد
اثر عجیب دل دردمند رکھتا ہے

شہرت بجا جہاں میں اس خودنمائی ہے
ایسے بشر بھی ہوتے ہیں قدرت خدا کی ہے

ساقی بہار ہے باغ ہے ابر سیاہ ہے
اس وقت میں شراب نہ پینا گناہ ہے

کوکیں ہیں کوئلوں کی پپیہوں کے شور ہیں
طاؤس رقص کرتے ہیں دن ہیں بہار کے

زلفوں میں دل الجھ کے سفر تن سے کر گیا
اچھا ہوا طالع چھٹے وہ دم سفر کیا

ناسخ میں لاکھ بار جیا اور مر گیا
کیا کیا فراق یار میں مجھ پر گزر گیا

کیا شوخیاں ہیں ابلق لیل و نہار کی
جمتی نہیں ہے ران کسی شہسوار کی

راحت بھی کم از غم نہیں وہ بھی جبکہ غافل ہو
سرسر مجھے تجھ لگا ہے نسیم سحری کا

بحر عالم میں ہے کشتی امید تباہ
دمبدم موج حوادث نے تھپیڑا مارا

خاکساری کا جہاں میں سبب عالی رتبہ
یہ زمیں وہ ہے کہ جس سے آسماں ہوتا نہیں

سبزہ باغ دہر میں برگ خزاں ہوتا نہیں
پیر ہو کر پھر بشر کوئی جواں ہوتا نہیں

غیروں کا حال دیکھ کے روتا ہوں زار زار
مت پوچھو حال میرے دل پر ضعف کا

غم اتنے اور بڑھے جس قدر وقار رہا
کٹ رہے کتنے لو سنگ مزار ہوا

عیاں ہوتا ہے راز عشق سینہ میں نہاں ہو کر
بیاں کرتی ہیں آنکھیں حال دل ترجماں ہو کر

ڈر غریق عشق کو موج حوادث کا نہیں
مچھلیوں کو خوف کیا ہے مد سیلاب کا

قوت بازو مصیبت میں غلط آتا ہے
سر کی آفت اٹھانے کو جہاں میں دو قدم

تکلیف کیوں اٹھائیے بن بن کے ہوشیار
مرتا ہوں میں تو اہل جنوں کے شعور پر

چور زمانہ کیا ہے جفائے فلک نے کیا
اٹھا کے آئینہ دکھلا دیا اسے میں نے
ربوط باہم شیشہ و ساغر ہیں ازل سے
درد فرقت میں زہر لازم ہے
شب فرقت بھی کاٹ دیتے ہیں ہم
ہجر میں اور بڑھی تشنگی عشق سے
حشر تک کوچہ محبوب میں چارہ نہ ہوا
چاند سورج کو ترستا ہوں بیٹھے میں
محال ہے کہ ... غلط ... جانے
بے قرار رہ سکا بے قراری ہے
جیسی شعلہ رو کو دیکھ لیا دل ...
گذر بھی ہے جو دل پر وہ ہم نہیں کہتے
میسر ہوا ہے جو دن سر پیٹتا اٹھا
وعدہ فردا قیامت ہے کیسے امید صبح
پیر مغاں سے پوچھئے مری خرابیاں
غضب کیا کہ جوانی میں ہے برق تمک
زاہد ڈرا رہا ہے حشر سے بڑھتی ہے اپنی
روز حور سے بہت وصف کیا کرتا ہے
اب دیتے ہیں سزا ہم کو خطا سے پہلے
آیا وہ غبار ... ویرانے میں وحشت میں
برق زلفوں کے تصور میں رواں ہیں ...

خو کر دہ ہوں قدم میں خیمے یار کا
نہ سر بھی عارض گلوں کی جبیں سال مجھے
آنکھیں نہ پھیرا دل مضطر نہ ملے گا
آدمی کب تلک دوا نہ کرے
کیا کریں عمر اگر وفا نہ کرے
پھر نظر آئے نہ اس طرح کی صورت آئی
کس کو ملتا ہے قرار و ... ایسے بیٹھے
گھر ما کو پھر کیجئے شب غم میں ... مشتاق
جو در پر آپ کے جاتا ہے پھر نہیں آتا
نہ جئیں گے اگر یہ ... رہنا
جو سمجھ آگئے آگئی پرداہ ... چھن گیا
کسی کو سنتر درد جگر نہیں ہوتا
دم میں سو بار جگر تھام کے بیٹھا تھا
شام ہی سے آج تو درد جگر تھمنے لگا
سو بار توبہ توڑ چکا ہوں شباب میں
اگر یہ سچ ہے تو پھر عمر بھر خراب رہا
دانستہ ہم تصور کریں گے تصویر پر
ہم بھی زاہد کو دکھائیں گے تماشہ اتنا
بات تک آپ کرتے تھے حیا سے پہلے
دار پر چڑھتے ہیں شہرت بڑھ گئی منصور کی
... رہتا ہے ... حیا طرف تھا ... یہ

دل کے ٹکڑوں سے نہ خالی کبھی پلکیں رکھیں
دیتا ہوں جان جان کئے اس نوجوان پر
کاوش دہر سے ہیں اہل بصیرت محفوظ
ناطاقت اس قدر بدن دراز ہو گیا
جہان دیتا ہوں میسر مجھے ذرہ ہوتا
پہاڑ سے عجب ... عیب کر دیا ہم کو
ضد سے اس رشک پری کا کوئی شے خالی نہیں
ولولہ غبار جوش جنوں کے کمال کے
ہر ایک نفس عشق میں ہے زندگی خضر
حسن رفتار جو اعجاز نما ہوتا ہے
چال وہ ہے کہ فلک بنتی ہے چلنے سے زمیں
مختصر طول شب ہجر بیاں کرتا ہوں
جو بلا آئی وہ لی دانستہ اپنی جان پر
فرقت نے بنایا ہے مجھے طالع بیدار
بھیج کر قاصد کو بچتا ہوں ایسا رشک ہے
اے صنم حسن ایسے کہتے ہیں اللہ اللہ
جب خلق یہ اس طرح سے بیدار کرو گے
بیتاب نقابیں ہیں رخ پہ ہیں رخسار
کس طرح کہوں نالوں میں تاثیر نہیں ہے
زور لذت ہے مجھے بادیہ پیمائی کی
جوش وحشت یہی کہتا ہے نہایت کم ہے

لکھے گئے سیکڑوں مضمون یہاں ... پر
دنیا بھی ہے ایک کھیل جو کھیلا ہو جائے
آج تک یار نظر میں نہیں ... لگا
دم توڑنا فراق میں دشوار ہو گیا
سر نہ رکھتا مرے سر پر اگر احسان ہوتا
یہی ہنر ہے کہ کوئی ہنر نہیں آتا
سحر ہے گفتار میں ہی زہر ہے رفتار میں
صحرا نے بنائیں گے گرد ملال کے
جینے کے لئے مرتے ہیں بیمار محبت
ہر ہر ذرہ خاک کف پا ہوتا ہے
چہرۂ ماہ کا نقش کف پا ہوتا ہے
کہتے ہیں ایک گھڑی حشر کی ہے سارے دن کو
میں نے جس فتنہ کو دیکھا آج مغلوب تھا
کس طرح ملوں خواب میں جانا نہیں آتا
وہم میرا دیکھئے کیا کیا گماں ہوتا نہیں!
ایسی صورت کا بھی دنیا میں بشر ہوتا ہے
ایجاد نیا گلشن ایجاد کرو گے!
کس طرح نہاں حسن خداداد کرو گے
تدبیر مطابق ہو یہ تقدیر نہیں ہے
ہر قدم پر یہی کہتا ہوں کہ صحرا بڑھ جائے
دو جہاں سے بھی اگر وسعت صحرا بڑھ جائے

میر علی اوسط رشک

تعارف:۔ ناسخ کے شاگردوں میں بڑا درجہ رکھتے ہیں ان کے بنائے ہوئے قاعدوں پر عمل کیا اور ان قاعدوں کی روشنی میں نئے قاعدے وضع کئے ناسخ کے زمانے کی بعض بھونڈی لفظوں اور ترکیبوں کو ترک کیا اور ان کے جانشین کی حیثیت سے مسلم درجہ رکھتے تھے آخر عمر میں کربلائے معلیٰ چلے گئے تھے وہیں سنہ ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں انتقال ہوا۔

نہ ہوا وقت خزاں ضبط فغاں و نالہ — بات کچھ جو صدمۂ مرغ چمن سے باہر
ہم تجھ میں محو قدرت پروردگار ہیں — اک مشت خاک کو مہ انور بنا دیا
جو ساغر و مینا نظر آیا مجھے خالی — یاد آ گیا ساقی دل مایوس بھر آیا
محفل میں شمع چاند فلک پر زمیں میں ہو — تصویر روئے انور جاناں کہاں نہیں
یارب دہان و چشم و دل زار کیا کروں — فریاد و اشک و آہ کسی میں اثر نہیں!
دل نہ قابو میں ہے نہ دلبر ہے — موت اس زندگی سے بہتر ہے
ایذائے دل بیان کروں کس زبان سے — یارب کبھی کسی کو یہ درد نہاں نہ ہو
موت آئے مجھ کو اجل مجھے اپنے ہمسفر اگر — ساقی نہ ہو بہار نہ ہو جان جاں نہ ہو
بتوں کو دل مبتلا چاہتا ہے — کوئی کہ وہ آفت گرا چاہتا ہے
ہجر جاناں میں کہیں جینے سے مرنا بہتر — زندگانی کے مزے کو ہمیں کھلتے دیکھا
بیڑیاں ہاتھ میں اور اطفال سنگ انداز گرد — لوگ کہتے ہیں میرا آنا غل جدھر ہونے لگا
کس کو تاب نظارہ باقی ہے — رکھتے ہو چہرے پر نقاب عبث
غم دل سوز جگر داغ فراق! — میرے مرنے کے تھے کیا کیا باعث
ناصحو عشق میں نہ رکھو معذور — جانتا ہوں کہ برا کرتا ہوں
شیخ بگڑے کہ برہمن بگڑے — میں ترا نام لیا کرتا ہوں

پتھر کسی کا ہے لب [illegible] کا دل آئینہ — ششدر رہوں کارخانۂ پر درد جاں میں

ہجر میں ابلق ایام بھی کاوش میں رہا — بارہا میری سواری میں یہ گھوڑا الٹا
کرتی ہے غریق یم غم آرزوئے دل — ملتا ہی نہیں بحر تمنا کا کنارہ
ہاتھ آیا لطف جس نے سراپا اٹھا لیا — دنیا سے جس نے دست تمنا اٹھا لیا
ترک دنیا کرتے ہی کھلنے لگے اسرار غیب — باخبر ہونے لگا جو بے خبر ہونے لگا
دل بستۂ لطافت باغ جہاں نہیں — پروا نہیں جو رنگ بہار و خزاں نہیں
نخل امید کسی روز نہ پایا سرسبز — گلشن دہر میں پیوستہ خزاں رہتی ہے
عیش ممکن نہیں مجھ کو چمن ہستی میں — جب بہار آتی ہے تشویش خزاں رہتی ہے
دمبدم وادی الفت میں جنوں کہتا ہے — فہم کہتے ہیں جسے عقل کہاں رہتی ہے
جو کہ خالی ہو علائق سے اسے غم کس کا — نے سے پوچھے کوئی کیوں گرم فغاں رہتی ہے
ہوں وہ خود رفتۂ الفت کہ یہ معلوم نہیں — زندگی کہتے ہیں کیا موت کہاں رہتی ہے
دوست جاناں جسے وہ دشمن تھا — بس اسی اشتباہ نے مارا
چمن دہر میں وہ طائر خوش قسمت ہوں — کہ ہوا دام مصیبت سے دم چند جدا
بحر غم میں ڈبو دیا ہم کو — دل نے بیڑا ہے خوب پار کیا
مال جو صرف ہوا پھر کے کہاں آتا ہے — کبھی دیکھا نہیں بہتے ہوئے دریا آتا
محو اپنا اسے دیکھیے جس کو — حق پرستی کا ہوش ہے کس کو

ہوگا ہم چہرہ روئے دلبر کا — منہ کبھی دیکھیے ماہ انور کا
روتے ہیں ہجر یار میں کرتے ہیں انتظار — اب دل بیقرار میں نام نہیں قرار کا
جس کی آبادی اجاڑی آپ نے — نام دل تھا اس خراب آباد کا
حلق سے نکلی خلق تک پہنچی — ہم سے سو بار آزمائی بات
مطلب یہ ہے جلد لے شکست حباب کا — دیکھا بنائے ہستی ناپائیدار کو
صحن چمن ہو خیمۂ دور سحاب ہو — ساقی ہو یار ہو قدح پر شراب ہو

شکوہ ہو ایک خانہ دل ہو اگر خراب
اس عشق فتنہ گر نے کیے گھر کے گھر تباہ

ہجر میں تاب و تواں ہوش و حواس
سب گئے دھیان تمہارا نہ گیا

مجھے تھا کام آئینہ سے یا زلفیں بنا رہے
تم اپنے حال شگفتہ میں حیران و پریشاں تھا

سنا رہا ہوں نکیرین کو فسانۂ ہجر
سوال ان کے جدا ہیں مرے جواب جدا

وہ کوٹھے پر چڑھے دنیا میں چاندنی چھٹکی
سر ڈھلتے ہی باغ میں آیا وہ مژدہ بہار آیا

دل و دیدہ پہ کیا اجارہ ہمارا
نہ صحرا ہمارا نہ دریا ہمارا

تم نے کیوں عشق میں چھپائی بات
آخر اے رشک مہ بر آئی بات

قسم لو تو تیرے عارض تاباں میں ہے
اس سے کم سمجھ میں آئی اس رخ کے چاند میں

بعد شب ہجراں کی درازی حد بیاں سے باہر
بات آئی تو صبح ہے غنچہ دہن لایا تو شام

گھر کا دروازہ اسی جا کھلا رکھتا ہوں میں
جس طرف سنتا ہوں شہرہ آمد سیلاب کا

ارباب فنا ڈوبے کا غم نہیں کرتے
دریا میں پھرا کرتی ہے بے خوف خطر موج

عمل ٹھیک ہے اک روز ثمرہ آتا ہے
ذبح ہونے میں نہیں دیکھتے سینہ الٹا

اپنی پہچان ہے انسان کو صانع کی شناخت
آپ تک جو کوئی پہنچا وہ خدا تک پہنچا

جلوہ یار سے روشن ہے زمانہ دن رات
کہیں خورشید کہیں شمع شبستاں نکلا

تو نظر آئے دیکھئے جس کو
احد توحید کہتے ہیں کس کو

یاد آیا میکدہ میلان مزاج یار تھا
یاس میں امید تھی اقرار میں انکار تھا

بیچ دریا پہنچ کر کو تم قسمت کی
پھر غم سے پار اتر جاتے تو بیڑا پار تھا

کیوں نہ مرتا عاشق چشم و لب و زلف و کمر
زار تھا آشفتہ تھا خاموش تھا بیمار تھا

اے خدا کوئی نہ دیکھے مرض الفت چشم
دم اس آزار میں آنکھوں سے نکلتے دیکھا

اسے ہیجان شام و سحر ہے بیمار غم زلف و رخ
شام ہوئی تو صبح لائے صبح ہوئی تو شام نہیں

کیا قصۂ الست و بلا کی خبر نہیں
حاضر جواب ہم تو ازل سے بلا کے ہیں

بعد مردن خاک کا انبار یا لوح مزار
اے اجل اس سے ہوا کیا خاک پتھر چاہیے

ہے مائل عیادت اگر یار کا مزاج
بہلے گا سیر باغ سے بیمار کا مزاج

نہ کرے باغ میں خزاں جو کچھ
مجھ سے تو نے وہ آئے بہار کیا

ہوں اسیران بلا میں وہ گنہگار قدیم
کبھی کھلتا نہیں دیکھا در زنداں جس کے

مجھ کو بدنام کیا رخ کا ہو جائے برا
کہ لب پیکر تصویر میں فریاد نہیں

اور آمد شد جاناں کے مشابہ کیا ہے
دم کو آتے کبھی دیکھا نہ نکلتے دیکھا

مرنے دل کے ہے داغ ہجراں بھی
عمران دو دلوں کی برابر سے ہے

دیکھا جو چشم غور سے دونوں کا حال ایک ہے
گردش چشم یار کا گردش روزگار کا

تصور تھا جو اس آئینہ رو کا قید خانے میں
خلا تھا رتبہ آئینہ ہر دیوار زنداں کو

کرے نگاہ بصارت کی کیا حقیقت ہے
وہ لب ہے قدرت پروردگار کی صورت

کہاں مشاطۂ خیالی مانی و بہزاد
کہاں وہ خامہ قدرت نگار کی صورت

سمجھوں جو مدعا تو لکھوں کچھ جواب کیا
تقریر سے زیادہ ہے تحریر لاجواب

مشتاق سیر لالہ دل داغدار ہے
ہنگام آمد آمد فصل بہار ہے

قتل کرنے کو خوش اندازی کا جوہر چاہیے
کون کہتا ہے کہ تیغ و تیر و نشتر چاہیے

کمال تنگ ہوا ہوں جہان فانی سے
دیا خدا نے عجب خانہ خراب مجھے

راستہ صبح سے اے رشک قمر دیکھیں گے
آج ہم شام سے آہوں کا اثر دیکھیں گے

جب تک عوض صبح نہ ہو صبح قیامت
لطف اثر نالہ شبگیر نہیں ہے

شمع میں نور نہ سوز دل پروانہ رہا
کچھ کہیں بھی نہ رہا جب ترا جلوہ نہ رہا

صبح سے ہیں قائل تاثیر وحشت اہل ہوش
بکتے بکتے مجھ سے ناصح ہو گیا دیوانہ آج

تمہیں خدا نے کیا آب و تاب غنچہ و گل
چمن کی سیر کرو ڈال دو بہار میں آگ

ہوا ہے تنگ جہاں اب کی وحشت دل میں
کدھر میں جاؤں زمیں آسماں سے باہر

باتیں وہ کمر رہا کر ہیں سے زخموں کے لب
یہ ساز میں صدا ہے یہ لطف راگ میں

امداد علی بحرؔ

تعارف | امام بخش کے بیٹے اور امام بخش ناسخ کے شاگرد۔ علمی استعداد کا حال معلوم نہیں۔ تحقیق الفاظ و محاورات عروض و قافیہ میں مستند سمجھے جاتے تھے۔ چھوٹی شہزادی کے یہاں سے وظیفہ ملتا تھا اور انہی کی ڈیوڑھی کے نقلی کمرہ میں قیام تھا۔ انہوں نے حمادی تھے۔

کچھ دنوں کے لئے رامپور بھی گئے تھے مگر پھر لکھنؤ واپس آ گئے۔ ۱۳۰۸ھ میں ۸۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔ ایک دیوان ان کی یادگار ہے۔

ہر تلک نگیں مظہر انوار خدا ہے
یہ کہہ دو کوچۂ جاناں کے جانے والوں سے
عذاب ہوتا ہے قاصد کا انتظار مجھے
جیسے جی عاشق بیتاب کا کب دل ٹھہرا
یہ راز عشق رہے دل ہی میں تو بہتر ہے
عشاق کی تقدیر میں آرام نہیں ہے
گو وہ چپ بیٹھا ہے پر شوخی کی باتیں ہو رہی ہیں
کہاں وہ نغمے اب بلبل چمن فریاد کیسی ہے
ہمارے حق میں یہ وہ بری بلا کے آسماں ہے
کسے کہا کہ دیا آج اپنا قصہ نصیب کوئی کسی
کوئی سجدہ تری درگاہ کے قابل ہوا
آدمی گردش ایام سے غافل رہے ہے
۔ ۔ وہ تادرا ہے اسلام و کفر سے

ہر دانہ ذرات میں خورشید نظر آیا
اُدھر جو کوئی گیا پھر ادھر نہیں آیا
اجل ہی آئے اگر نامہ بر نہیں آیا
روح تب کر گئی پرواز تو تسکین ٹھہرا
ادھر زبان سے نکلا اُدھر فسانہ ہوا
کیا سمجھ شب وصل کو دھڑکا سحر کا
ہے لب خاموش پر عالم لب تصویر کا
ہمارا دل سبق بھی لے ورق التاکس کا
شب ملت کا جانا اور آنا روز محشر کا
جہاں لیکر ہزار ڈھونڈھا مزاج پایا نہیں کا
لے چلا تیغ جبیں رنگیں جبیں ساقی ہوا
شام کیا ہوگا خدا جانے سحر کیا ہوگا
زاہد ادھر خراب اُدھر برہمن خراب

روئے کوئی غریب تو ہنسنا نہ چاہیے
اے دل نہ پھیر بہار میں گم ہو ترے ہوش
ہے خواب نسیم سحری ہونٹوں کی جنبش
بروز وعدہ کہاں اڑ گئے یہ فرماؤ
یہ بات سچ ہے کہ دنیا مقام عبرت ہے
رونے دھونے سے فائدہ بحرؔ
کوئی آداب محبت کو بھلا کیا جانے
جو میری عرض ہے وہ نہیں یار کو قبول
عشق کیا درد ہے خدا و ندا
کیا بُرا درد ہے جُدائی کا
بے تابیاں یہی ہیں تو دیکھو نجات ہے
میں قسم کھا کے یہ کہتا ہوں کہ بے ترس نہیں
شانہ کا محتاج نہیں حسن خداداد
معاف کیجئے ایسی خطا نہ ہوگی کبھی
یاد آئی ہے کہہ دو یہ ہمصفیر دل سے
ترے ملاپ میں دونوں جہاں کی عشرت ہے
اللہ ہی بچائے اجل کا ہے سامنا
قبلہ ہے کس طرف میں دو وہ نہ ادا نزد
صاحب ہنر کو آج کوئی پوچھتا نہیں
کچھ نہ سمجھے آئینہ کی شکل حیرت میں ہے
کیوں نہ بند آنکھیں کیے دنیا سے جائے بشر
عاشق زار ہوں میں مجھ کو نصیحت ہی خبر

واقف نہیں کسی کی فغاں اثر سے آپ
سینہ میں حسرتوں کا نہ اتنا ہجوم کیجئے
ہنستے ہو تو ہو جاتا ہے غنچہ سا دہن بھی
مکان میں دہیں اے یار با مزار ہیں ہم
کہ خواب دیکھتے ہیں جب خیال کرتے ہیں
کب سینے کے داغ چھوٹتے ہیں
دلنشیں جتنی ہیں عاشق کی وہ تقریریں ہیں
بندے کی جو خوشی وہ خدا نہیں
کوئی دارو کوئی دوا مفید نہیں
کسی کروٹ مجھے قرار نہیں
صیاد ما تو نہیں ہی نہیں یا قفس نہیں
آنکھ دیکھی وہ نظیلی کہ مجھے ہوش نہیں
تم چاند نظر آتے ہو بے ساختہ ہو میں
برا کیا تمہیں چاہا گناہگار ہوں میں
چمن کا ذکر اسیروں کے روبرو نہ کرو
جو تم ملے تو کسی شے کی آرزو نہ کرو
فرقت کی شب کہاں میں جینے سحر کیا
صاحب تو ہم تمہارے کہاں سر اٹھا کے کیا
یارب تلاش رزق کرے بے ہنر کہاں
ایک ہے دیکھا نہ دیکھا عالم ایجاد کو
اس پری کو دیکھ کر کیا دیکھے کوئی حور کو
ذبح کرتے ہیں جو لوگ آتے ہیں بہلانے کو

دیکھنے دیتے نہیں کان رخِ زیبا کو
مار ڈالے گا مجھے عشق یہ معلوم نہ تھا
بسمل کو سنبھالے سے سنبھلتے نہیں دیکھا
کب مجھ کو سکوں لگ گو جو تقدیر میں ہر داغ
دل کو لگی ہے تو انسان سمجھتا نہیں کچھ
ہوا بدل گئی پیری میں نوجوانی کی
گلے شکوے نہ کر ارض و سما کے
ہم نے ڈھونڈھا نہیں ہستی سی عدم تک کیا کیا
شراب مانگے گی خضر سے بھی طلبِ آبِ بقا رنگے
اب ان میں اپنا نہیں گنا بتوں سے دل کی ٹوٹی سنوارا
جو ہر اس حسن پرستی میں وہ پیدا کرتے
رونق تقسیم ہیں کچھ نہ بن آئی آپ سے تجر
نیرنگیٔ دنیا کا تماشا ہے نمایاں
ہم خزاں کی اگر خبر رکھتے
یار کی دونوں آنکھیں قاتل ہیں
پار اتریئے مددِ غیر سے کیا لطف اے تجر
جنوں کے جوش میں نکلے جو گھر سے
چرخ کے ہاتھوں تہ و بالا ہیں اہلِ حیات کے
ہوئی تفریح مجھ کو پھاڑ کر پوشاک وحشت میں
عجب یہ رسم محبت ہے جس نے ظلم کیا
ناقوس کی آواز سے جو نکلا نہ اذاں سے
دیکھوں انجام مرے عشق کا کیا ہوتا ہے

بجلیاں کوندتی ہیں تاب نظر کیوں کر ہو
ناگہانی ہو جو شے اس کی خبر کیوں کر ہو
میرے دل بیتاب کی کیا چارہ گری ہو
جب فصلِ چمن آئے تو بے بالی و پری ہو
نالے کرنے سے مجھے کام اثر ہو کہ نہ ہو
بہار دیکھ چکے باغِ زندگانی کی
خدا کو یاد کر بندے خدا کے
نہ ادھر ہاتھ لگے تم نہ ادھر ہاتھ لگے
سرور لطفِ زندگی ہے خمار میں جی کیا کریں گے
کریں گے بت خانے سے کنارا حرم میں یادِ خدا کریں گے
دل کو آئینہ بنا کے تجھے دیکھا کرتے
بیکسے بگڑی ہوئی تقدیر کو ہم کیا کرتے
غفلت اسے کہتے ہیں کہ عبرت نہیں ہوتی
آشیانے میں پھول بکھیر رکھتے
اک نظر ہم کدھر کدھر رکھتے
ڈوب بیٹے یہ نہ کشتی کا سہارا کیجیے
ادھر سے ہم چلے پتھر ادھر سے
اس ہنڈولے میں کوئی بیٹھا نہیں آرام سے
در جنت نظر آیا مجھے چاکِ گریباں سے
اسی کی خدمتِ عالی میں دادخواہ چلے
کس نیند سلایا ہے مجھے بے خبری نے
بت خفا ہوتے ہیں ناراض خدا ہوتا ہے

پھول مرجھائے ہوئے دید کے قابل کب ہیں
شوقِ دیدار جو منظور نظر اس کا ہے
بت کدہ میں سر بسجود کعبہ میں غریدست
بیمار محبت کا خدا حافظ و ناصر
روز اک تازہ بلا در پئے جان رہتی ہے
آنکھیں نہ جینے دیں گی تری بے وفا مجھے
بتلائے کون کعبۂ مقصود کا پتہ
سیر کو اٹھے تو ہیں وحشی مزاج
توڑ کر دیکھ لے آئینہ کے ٹکڑے ناصح
کیا اعتبار تیری قسم کا تو وہ ہے یار
دل بھی ہے ایسی چیز کہ تم کو نہ دیجیے
بنی ہے جان پہ ایسی کہ اب نہیں امید
خدا پرست ہوئے ہم نہ بت پرست ہوئے
اپنے اعمال سے پیری میں خبردار ہوئے
ہر طرف لوگ تماشے کو کھڑے رہتے ہیں
پتلیوں کو اور ہی صورت نظر آنے لگی
کچھ اعتبار نہیں قول و فعل کا ان کے
ہیں کلام سے کہہ دوں اے یار کس کس آن کا
اس چمن میں پہنچ کر کیسے نہیں پہنچا مجھے
آغازِ جوانی ہی میں پیرانہ سر تھے
کون دنیا میں بٹاتا ہے کسی کا دکھ و غم
میں ڈھونڈھتا پھرتا ہوں وہ قاتل نہیں ملتا

آنکھ پڑتی ہے اسی پر جو کھلا ہوتا ہے
ہم جدھر دیکھتے ہیں جلوہ ادھر ہوتا ہے
سحر اپنے خوابِ غفلت کی ہی تعبیر ہے
تشخیص یہ ٹھہری ہے کہ تدبیر یہی ہے
نہیں معلوم مری موت کہاں رہتی ہے
ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے
اپنا ہی دل جو قبلہ نما ہو تو جانیے
باغ جاتے ہیں کہ صحرا دیکھنے
کیا چھپے طرزِ حسن پرستی کہ جیسے خو ہو جائے
فردا کا وعدہ کر کے قیامت پہ ٹال دے
الفت یہ کہہ رہی ہے کلیجہ نکال دے
کوئی گھڑی کوئی ساعت کوئی پہر گزرے
کسی طرح نہ جھکا سر ہم ایسے مست خودی ہوئے
سوتے رہے سر پہ جو دھوپ آئی تو بیدار ہوئے
ہم جو دیوانے ہوئے رونقِ بازار گئے
جب ہوا دل آئینہ آنکھوں کو حیرانی ہوئی
کبھی ہمارے ہوئے اور کبھی پرائے ہوئے
یہ کہانی دن کی ہو جائے نہ قصہ رات کا
شکوہ گلچیں کا کروں میں یا کہ صیاد کا
وہ شام ہماری ہے کہ عالم ہے سحر کا
کون سر پہ بوجھ لیتا ہے کسی مزدور کا
گھر بھول گئی ہے مری تقدیر اجل کا

اماں علی سحر !

تعارف:۔ ولادت و وفات معلوم نہیں ناسخ و برق کے شاگرد اپنی شہرت کی بدولت واجد علی شاہ کے دربار میں طلب ہوئے اور وظیفہ پایا بڑے جامہ زیب اور کبر طبیعت کے شوقین تھے غدر کے بعد وفات ہوئی۔

ہر خشک و تر میں تو ہے سب پہ ظہور تیرا
گو ہم کبھی خفا ہیں ہو گی تو بس ایسی ہو گی
گل اندامیوں کے نقشے نقش دل پر ہو جاتے ہیں
وصال یار سے مرنے پہ موقوف
قید دل لے اہل شرع کی دیوانہ کر دیا
جیتے جی انساں آتے ہیں فرشتے بعد کے
ایک معشوق وہ ہیں اور زمانہ عاشق
کوہ پر فرہاد پہنچا دشت کو مجنوں گیا
بعد از فنا کبھی جبیں ملے یہ یقین نہیں
خوش قطع کس قدر ہے قبائے برہنگی
دل دیا اللہ نے صدمے اٹھانے کے لئے
راحت کی خوشی رنج کا کچھ غم نہیں رکھتے
چلے تھے تو مڑ کر ادھر دیکھ لیتے
نہیں کیا ہو زیست پر میسیلے لیے
گو زندہ و ناتواں تھے لیکن نہیں گئے ہی تھے
دعا کہ جیتے جیتے ہیں کو جو ہیں آپ کے
گردش چرخ سے تنگ آیا ہو دم گھٹتا ہے

دل میں جگہ ہے تیری آنکھوں میں نور تیرا
آج ان پریوں میں دیکھا ہے اک انساں
ابھی صورتیں اس ویرانہ کو آباد ہونا تھا
جو یہ سچ ہے تو کچھ مشکل نہ ٹھہرا
کیسے گنہگار ہیں بے قصور ہم
پھر یہ کیا ہے گور میں بھی کنج تنہائی نہیں
کیا کریں وعدہ فردا اے قیامت نہ کریں
ہم کہاں ہیں کچھ ہمیں اپنی خبر ملتی نہیں
کیا گردش آسماں کی زیر زمیں نہیں
دامن نہیں ہے جیب نہیں آستیں نہیں
ہم فقط پیدا کئے تھے آزمانے کے لئے
لب ہو کشتی شیشہ کا وہ دل ہم نہیں رکھتے
کہ ہم اور اک نظر دیکھ لیتے !
نہ تھے ہم تو اکیلے رہتے
اک مشت استخواں تھے اور لاکھ امتحاں تھے
اگر کبھی تو سیر لب بام کیجئے
آخر اس گنبد بے در کی کہیں ملتی بھی ہے

ہم بے بلائے تو ہیں آئے خدا کے گھر
شب فرقت میں اٹھائی ہے وہ ایذا ہم نے
زندگی ہے تو بہر طور گزر جائے گی
حشر میں حشر قیامت میں قیامت ہو گی
کچھ زمانے سے طبیعت بھی ہٹی جاتی ہے
ہیں جو تازیانہ تار نفس سے لگے !
راہ دکھلائی خوب وقت اخیر
پاس آ بیٹھے تو دل اٹھ گیا اک عالم سے
بہت پچھتائے تم کو پیار کر کے
میں پیرو تختہ نرگس کو دیکھتا ہوں سحر
فقط مقسوم سے اپنے گلا ہے
دل کا آئینہ اگر ہم نہ دکھاتے تم کو
کوہ و صحرا کے کبھی وحشت میں نہیں کچھ پابند
آج جو کچھ کہ ہوا کل بھی وہی ہونا ہے
غریبوں کا کیسا مزاج مبارک
صدمے فرقت کے نہ اٹھتے ہیں نہ اٹھیں گے سحر
ہے سامنے مرقع یاراں رفتگاں
عجب لطف تھا کچھ ابتدائے وحشت میں
دل نے پھر دل سے راہ پیدا کی
آنکھیں دی ہیں دیکھنے کے واسطے
کسی کی گور میں سونا نہیں ہے

جانا نہیں بغیر طلب کیا ضرور ہے
شکر کرتے ہیں تو ہوتی ہے شکایت تیری
کٹ چکی ہجر کی شب صبح بھی ہو جائے گی
فیصلہ اپنا اسی دن پہ اٹھا رکھا ہے
زندگی موت کے دھڑکے میں کٹی جاتی ہے
کوسوں سمند عمر گریزاں نکل گیا
آنکھوں کی راہ دم مرا نکلا !
اب جو اٹھ جاؤ گے لے رشک قمر کیا ہو گا
گناہ عشق کی پائی سزا خوب
بندھی ہوتی ہے عجب انتظار کی صورت
کسی سے کچھ نہیں شکوہ شکایت
آنکھ ہوتی نہ محبت کی نظر سے وا
کر دیا عشق نے ہر قید سے آزاد ہمیں
کب یہاں اتنا ہے وعدہ فردا کوئی
یہ پوچھو کہ بگڑی طبیعت تمہاری
صبح کے ہوتے ہی اپنا خاتمہ بالخیر ہے
روؤں بھلا سحر میں کس کس کو یاد کر کے
وہ ولولہ وہ جنوں اب کی سا بھی نہ
چھپ کے جانے کا راستہ نکلا !!
دیکھیں گے جو کچھ خدا دکھلائے گا
ہمیں کیا یار کے مذہب سے مطلب

آتش اور ان کے تلامذہ

آتش

پھیرا کیا مرقع عالم کے حسن پر — ہر روز عشق اک نئی تصویر پہ ہوا!

جوش جنوں میں دیکھے پیچھے نہ مڑ کے پھر — منہ جس طرف کو صورت دریا اٹھا گئے

ہم کو در پردہ محبت غائبانہ عشق ہے — لن ترانی ان سے ہو سائل جو ہوں دیدار کے

کیجئے آرائش جو دیکھی اس صنم نے اپنی شکل — بند آنکھیں ہو گئیں آئینہ حیراں ہو گیا

بیان خواب کی طرح جو کر رہا ہے — یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

اس بلا جان سے آتش دیکھئے کیونکر بنے — دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خو ہے دوست

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے — موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا!

فصل بہار آئی پیو صوفیو شراب — بس ہو چکی نماز مصلیٰ اٹھائیے

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی — قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر — دل سے دشمن کی جفاؤں کا گلہ جاتا رہا

کوئی زمانہ جاتا ہے کوئی آتا ہے — کسی کو کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

وہی سر کا ٹپکنا ہے وہی رونا دن بھر کا — وہی راتوں کی بیداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

کیا کہوں وعدہ خلافی سے تری احوال شب — کھول کر دروازہ کو کرتا ہوں سو سو بار بند

تمام رات ہوئی کر گیا کنارا چاند — اتریئے بام سے تم جیسے اتر رہا چاند

ان انکھڑیوں میں اگر نشۂ شراب آیا — سلام جھک کے کروں گا جو پھر حجاب آیا

شیشہ میں جو ہے روشنی بادۂ گلگوں — فانوس میں یہ شمع کا عالم نہیں ہوتا

موسم گل کی ہوا نے کئے ساغر بیکار — بط مے اڑ کے لب جست کو چھو آتی ہے

سبوئے غنچہ ہے معمور و جام گل لبریز — ٹپک رہی ہے شراب ابر نو بہاری سے

ہر شب شب برات ہے ہر روز روز عید — سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کے

آئینہ میں پری سے جو چہرہ کو دیکھتے تو — کیونکر بھلا محبت تم سے بشر نہ کرتا

منہ نہ دیکھا ہو ترا اس رشک سے مہتاب نے — اے صنم جب لوٹتے ہیں گیسو ترسا آفتاب

ایک گل ایسا نہیں ہوگا نہ خزاں جس کی بہار — کون سے وقت ہوا تھا یہ گلستاں پیدا

زمیں چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا! — بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

نہ قبر سکندر ہے نہ ہے گور دارا — مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی — گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

باغ جہاں کو یاد کریں گے عدم میں کیا — کنج قفس سے تنگ رہے آشیاں میں ہم

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے — سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغ بسمل کی تڑپ — ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

کام کرتی رہی وہ چشم فسوں ساز اپنا — لب جاں بخش دکھایا کئے اعجاز اپنا

رنگ بدلا نظر آتا ہے ہوا کا مجھ کو — گل تازہ کوئی اس باغ میں خنداں ہوگا

کیسی کیسی صورتوں کے اپنے دل میں داغ ہیں — اس مرقع میں بھی ہے کیا کیا ورق تصویر کا

طلب دنیا کی کر کے زن مریدی ہو نہیں سکتی — خیال آبروئے ہمت مردانہ آتا ہے

تماشا گاہ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو — کسے اس انجمن میں یاد خلوت خانہ آتا ہے

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر — دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال — ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے — ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش — گل مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

سوائے نام کے باقی اثر نشاں کے نہ تھے — زمیں سے دب گئے جھکتے جو آسماں سے رہے

کسی لاحاصل مداوا اسے مریضِ عشق ہے
ناگفتنی ہے حالِ بہار و خزاں باغ
صورتِ شمع ہوں ہر چند فروغِ محفل
موسمِ گل کر دیا ان کی قبائے سرخ نے
تم اندھیری رات میں اٹھو جو چہرے سے نقاب
وہ آب و رنگ کہاں تیرے یار کا گل پر
وہ رخسارے جو ہوتے ہیں مقابل
آئینہ نے کیا ہے جو صورت سے آشنا
کر کے آرائش جو دیکھی اس صنم نے اپنی شکل
شوق ہے دیکھیں تو آنکھوں میں تصور اسکا
آئینہ خیال کو منظور تو رہا !
ہر لحظہ دگرگوں ہے مرا حالِ پریشاں
ہو گیا عشق حسن سے آگاہ !
کون سے دن ہاتھ میں آیا مرے دامانِ یار
کارواں تک روز واماندہ دل کو پہنچا گیا
اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں
خدا بھی خوبصورت کو نہایت دوست رکھتا ہے
غنیمت جانئے لرزش ابروئے قاتل کو
دمِ آخر بھی بالیں پر مرے ہمراہ یار آئے
تری تقلید سے کبکِ دری نے ٹھوکریں کھائیں
نہ چھوٹے گا چھڑائے سے ارے قاتل تن مرا کا

تھامنا ممکن نہیں گرتی ہوئی دیوار کا
اک زخم ہے کہ خشک ہوا اور نم ہوا
بات کرنے نہیں پاتا کہ زباں کٹتی ہے
چاک تا دامن ہزاروں ہی گریباں ہو گئے
روئے رشکِ مہ ذروں کو جگا دو خواب سے
ہزار آنکھ ہو نرگس کی وہ نگاہ نہیں
نکل جاتے ہیں دب کر چاند سورج
گردن میں ان کی ہاتھ ہیں ان کے پڑے ہوئے
بند آنکھیں ہو گئیں آئینہ حیران ہو گیا
منزلیں جلوۂ محبوب کی آباد ہیں سب
جب سامنا ہوا تری تصویر سے ہوا
صورت نہیں ملتی مری تصویر میں میری
پوچھئے کیا ہو ناگہانی کی
کب زمین و آسماں کا فاصلہ جاتا رہا
اے جرس شاہد ہوں تیرے نالہ کی تاثیر کا
اس بت کے آستانے کا پتھر رگڑ گیا
ارادہ کون سے در پر کروں میں دادخواہی کا
بڑی معراج ہے تلوار سے مرنا سپاہی کا
رقیبوں نے محل باقی نہ رکھا عذر خواہی کا
چلا جب جانور انساں کی چال اس کا چلن بگڑا
وفادار دل کے خوں کا داغ کیا دھبا ہے کیچڑ کا

میرے مرنے کی دعا مانگے وہ بت پڑھ کے نماز
بتوں کے قہر و غضب کا کسے ہے اندیشہ
نہ تجھے دماغِ نگاہ ہے نہ کسی کو تابِ جمال ہے
شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں
نام سنتا ہوں جو میں گور کی اندھیاری کا
ترکِ الفت کا ارادہ نہ کر آتش زنہار
خون ہوا جاتا ہے دل کیا دیدۂ تر خشک ہو
ذاتِ باری کو کیا ظلمِ بتاں نے ثابت
ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
گور میں بھاگ اہلِ دنیا سے
ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
ہوا میسر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
کچھ نظر آیا نہ پھر جب تو نظر آیا مجھے
کرتا ہوں جو میں حسرتِ پرواز میں نالے
شرطِ وفا کی کسی بے وفا سے کی
نہ کسی کو کڑی کہی قسم نے
موسمِ گل میں جو ہوتا ہے زیادہ سودا
آتش آغازِ محبت کا ہوا انجام بخیر
نہ روزِ حشر بھی فریاد ہو سکی مجھ سے
آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
رفیقِ حال برے وقت میں نہیں کوئی

کس طرف جا کر کروں میں سجدۂ شکرانہ آج
خدا نہیں یہ پیغمبر نہیں امام نہیں !
انہیں کس طرح سے دکھاؤں میں وہ جو کہتے ہیں کہ سحر نہیں
لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں
دل دھڑکتا ہے جدائی کی شبِ تار نہ ہو
دل سے بیزار تو ہے جاں سے بیزار نہ ہو
روز ٹانکے ٹوٹتے ہیں زخم کو مگر خشک ہو
عدل کرتے یہ اگر ان کی خدائی ہوتی
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے
خلوت اس انجمن سے بہتر ہے
تمام عمر رفو گر رہے رفو کرتے
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے
جس طرف دیکھا مقامِ ہو نظر آیا مجھے
صیاد کو غم ہے مری بے بال و پری کا
آتش سا عارف آگاہ ہو لا
نہ کسی کی کڑی اٹھائی بات
دوڑتے پھرتے ہیں ہم باغ کی دیوار پہ
خاک پر تیری قدم رنجہ گل اندام کریں
جفائے یار کے آڑے مری وفا آئی
میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا
شریکِ جنگ ہیں شمشیر کا نیام نہیں

نواب سید محمد خان رند

نبیرۂ نواب نجف خان وزیر اعظم ہند

۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے ۱۸۵۷ء میں انتقال ہوا آتش کے شاگرد تھے
ان کے بہت سے شعر اور مصرعے ضرب المثل بن گئے ہیں۔

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

بیٹھے تجھ سے بھی لگا کر نہ کبھی اس دن سے
ہم فقیروں نے لیا جب سے سہارا تیرا

دید لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

آنکھ لا سکتی نہیں تاب تجلائے جمال
عالم نور ہے لے دور سراپا تیرا !

چشم و ابرو بھی اگر تیر سے ہوتے اس کے
ہو چکا تھا اثر رخ ذرہ پہ یہ دھوکا تیرا

اختیاری ہی نہیں ہر بار بنے ایسی شکل
کھنچ گیا صانع ایجاد سے نقشہ تیرا

آفت شب تنہائی کی ٹل جائے تو اچھا
گھبرا کے یہ دم آج نکل جائے تو اچھا

کہے جو نالے تو نکلا بخار سینے کا
بھرا ہوا تھا ہمارے دل میں یہ دھواں کب کا

غرض نہ دیر سے مقصد نہ کعبہ سے اے دوست
تجھی کو ڈھونڈھ رہا ہوں کہاں کہاں کب کا

جنوں اب اور بتا کوئی شغل بیکاری
اڑا چکا ہوں گریباں کی دھجیاں کب کا

جو جس کے حق میں تھا وہ بہتر بنا دیا
مجھ کو فقیر تجھ کو تونگر بنا دیا

غافل مقام رشک نہیں جائے شکر ہے
سو سے برا تو ایک سے بہتر بنا دیا

جام کو منہ سے لگانے کی نہ پہنچی نوبت
چشم مخمور نے ساقی کی یہ بیہوش کیا

پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر
اور دو روز ہوا باغ کی کھالے بلبل

کیا ملا عرض مدعا کر کے
بات بھی کھوئی التجا کر کے

سانس دیکھی تن بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے

بیٹھنے کند ہو نگاہیں ابھی جیب کے پہلو اپنا
تم پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

وعدے پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے
کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

بہے کب تلک شبنم تر جائے گی
یہ ندی چڑھی ہے اتر جائے گی

طبیعت کو ہوگا قلق چند روز
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

نہ تڑپے ترا دل یہ ممکن نہیں
محبت ہے کام اپنا کر جائے گی

ہجر میں کٹتی کسے امید سحر
رات کاٹی خدا خدا کر کے !

بت کریں آرزو خدائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

یکساں ہے دم کی آمد و شد بحر یار میں
آیا تو کیا ہوا جو نہ آیا تو کیا ہوا

نہ کھلواؤ میری زباں چپ رہو
کوئی بات منہ سے نکل جائے گی

بلبل کو رنگ رنگین اپنا دکھا کے آئے
لو باغ کو گئے تھے یہ گل کھلا کے آئے

طبیعت کو تسکین دم بھر نہیں
الٰہی یہ کیونکر سنبھل جائے گی

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد

دکھایا کنج قفس مجھ کو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد

اجاڑا ہے ستم گر نے آشیاں تیرا
الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد

خبر نہیں کسے کہتے ہیں گل چمن کیا ہے
قفس کو جانتے ہیں ہم تو آشیاں صیاد

اداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے
کئی برس میں ہوا ہے مزاج داں صیاد

قفس کو شام سے رکھ کے فرش خواب پہ میں
سنا کیا میری تا صبح داستاں صیاد

پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے
قفس کو لے کے میں اڑ جاؤں گا کہاں صیاد

ہو نہ مایوس ریاضت کا صلہ ملتا ہے
بندگی کرنے سے کہتے ہیں خدا ملتا ہے

کس طرح ڈھونڈھ نکالیں تجھے جویائے ترے
نہ نشاں ملتا ہے تیرا نہ پتا ملتا ہے

پڑتی ہے آ کے جان پر آخر بلائے دل
یارب کسی بشر کا کسی پر نہ آئے دل

دل ہدف تیر نگہ پھر کیا تو نے
ہر آبلہ ہے سوز جدائی سے بھر آیا
دل سینہ میں بیتاب ہے جان آگئی ہے لب تک
دو چار گام یاں سے ہے دولت سرائے دوست
پائی خبر جو آمد فصل بہار کی
شب فراق میں ہم سے تو نالہ کر نہ سکا
پوچھو نہ جلن کا دل کے احوال!
سنا کہ آتش گل نے جلا دیا گلشن
گلشن بغیر یار ہے کنج قفس سے تنگ
ناز و انداز و حسن و خوبی میں
خود بخود دل مرا افسردہ ہوا جاتا ہے
دل کو کس کس طرح بہلاتا ہوں میں
ہجر کی شب کروٹیں کیونکر نہ لوں
آشیاں کنج قفس میں نہ کبھی یاد آیا
پھر بھی بادیہ پیمائی کی پاؤں کو حسرت باقی ہے
مجنوں ہے کہیں کہیں ہے فرہاد
ناداں ہیں جو رکھتے ہیں امید کسی سے
کبھی خوف خزاں ہے اور کبھی صیاد کا دھڑکا
درد و غم و یاس و داغ حرماں
دو دن کی حیات میں ملا ہے
لب خشک ہیں ہمارے منہ زرد ہو گیا ہے۔

اگلے ہی میرے زخم جگر تھے ابھی آئے !!
دیکھیے تو کلیجے کے دکھاؤں تجھے چھالے
اب جان کو رو کے کوئی یا دل کو سنبھالے
لوٹیں یہ پاؤں کھو تو آ کر کہاں تھکے
کیا پھڑپھڑا کے مرغ گرفتار رہ گئے
وہ کون لوگ ہیں جو ضبط آہ کرتے ہیں
اک آگ پڑی دھک رہی ہے !
جلا کر خاک ہوا آشیاں نہیں معلوم
ہم تو بڑے عذاب میں اے ہمصفیر ہیں
کون ہے تم سا اس کا نام تو لو
کچھ سمجھ میں نہیں آتا مرا کیا حال ہے آج
پر تصور یار کا جاتا نہیں
کوئی پہلو دل کو چین آتا نہیں
بند آنکھیں کیں جو لیکن مجھے نیند آتا
جنگل جنگل پھر آیا پھر بھی حسرت باقی ہے
الفت کی عجیب صورتیں ہیں
جز ذات خدا کوئی کسی کا نہیں ہوتا
بناؤں کیا سمجھ کر آشیانہ اس گلستاں میں
اک دل ہے ہزار آفتیں ہیں
کیا کیا شکوے شکایتیں ہیں۔
اب دل نہیں سراپا اک درد ہو گیا ہے

میری طرف سے کوئی صانع ازل سے کہے
کھلکھلا کر نہ ہنسو میں نے کہا تھا تم سے
کیا جانیے کیا کیا دل عاشق سے گزر گئی
خیال یار میں کچھ بسی نہیں پلک تا صبح
مست کیا جانیں کہاں دیر ہے کعبہ ہے کہاں
آج تک ٹھہرا سرا نقشا نہیں تجھ سا کھینچا
لطف پرواز گلستاں ہے مجھے یاد ابھی
المدد جوش جنوں وقت مددگاری ہے
ہر ذرہ ایک وادی تو سیرگاہ ہے
نہ خوشی دین سے نہ دنیا سے سروکار مجھے
رقص کے معنی کھلے اس بت کو نچا کر دیکھ
کیے ہیں آپ نے بھی پیدا خواص شیشہ کے
نہ کھینچے چل کے ذرا عالم وحشت کی بھی سیر
دن تو مر مر کے کرا ہجر میں اس کے لیے ہمدم
روئے رنگیں عرق فشاں ہے

فصل گل ہے کہ جو چلا ہے بیں مے فروش
پوچھتے رند سے کیا ہو سبب مدہوشی
رند حاضر ہے شیشہ و ساغر
گل کھلے بادے چھلکنے لگے پیمانوں سے
تو نے کیا آتش حل کردہ پلا دی ساقی
درد دل دور کیے ساغر مے کی تاثیر

بگاڑتا ہے جو مجھ کو بنائے گا پھر کیا
قہقہہ سیکھ لیا کبک دری نے دیکھو
ہر بار کی شوخی ترے بے ساختہ پن کی
تمام رات میں جاگا ہوں خواب کیجیے نے
عمر ساری تری بھٹی پہ گزاری ساقی
خوبصورت ہے ترا صانع ایجاد ابھی
دل قفس میں نہیں لگتا مرا صیاد ابھی
سلسلہ چھٹتا ہے زنجیر کا دیوانوں سے
وحشت دکھا رہی ہے بیاباں نئے نئے
یاد میں تیری دو عالم کو فراموش کیا
ناز کی رفتار کا رکھا ہے اس نے نام رقص
ذرا سی ٹھیس میں بس چور چور ہوتا ہے
بیڑی کٹ جائے اگر پاؤں سے دیوانی کی
جھیلنا ہے ابھی آفت شب تنہائی کی
شبنم گل سے ٹپک رہی ہے
بادۂ رنگیں پیا دساقی کوثر نوش
چشم مخمور نے اک مست کو بیہوش کیا
مے کو نہ سمجھ اگر حرام تو لو !!
مست پھر نکلے بہکتے ہوئے میخانوں سے
پھونک ڈالا ہے جگر آگ لگا دی مری ساقی
تیرے ہی ہاتھ سے اللہ شفا دے ساقی

میر وزیر علی صبا

تعارف :- ولادت معلوم نہیں ۱۲۷۰ھ میں گھوڑے سے گر کے انتقال ہوا آتش کے مشہور شاگرد تھے۔ واجد علی شاہ کی سرکار سے دو سو اور محسن الدولہ کے یہاں سے تیس روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا ایک دیوان (غنچہ آرزو) یادگار چھوڑا صنعتوں کے استعمال کو اچھا نہیں سمجھتے تھے خود کہتے ہیں ؎ اے صبا آپ رعایت نہ کریں لفظوں کی۔ زر گل پایا جو گلچیں نے تو کیا ما ہوا

دلمیں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے — بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

اللہ رے ان کا غصہ اتنا نہیں سمجھتے — کیونکر کوئی جئے گا جب یوں عتاب ہوگا

جائے عبرت ہے جہاں بے ثبات — دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا!

بلبل کہاں بہار کہاں باغباں کہاں — وہ دن گذر گئے وہ زمانہ گذر گیا

نہ کہیئے نالہ عاشق میں کچھ نہیں تاثیر — سنی ہے تم نے کسی کی ابھی کہاں فریاد

آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں — ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

آئے ہیں دم نزع وہ اغیار کو لیکر — کیا کہیئے کہ کچھ کہنے کا ہنگام نہیں ہے

اک رشتہ جاں سیکڑوں پھندوں میں پھنسا ہے — دنیا کے بکھیڑوں سے فراغت نہیں ہوتی

آئی بہار ہوتے ہیں دیوانے سنگسار — لڑکوں کی جھولیوں میں ہیں پتھر بھرے ہوئے

وہ زمیں پر قدم نہیں رکھتے — حسن کا کیا غرور ہوتا ہے

اے صبا جب بہار آتی ہے — ہم کو سودا ضرور ہوتا ہے

آغاز عشق میں بجا ہے ہمیں موت آئی — آگاہ بھی نہ حال سے وہ بے خبر ہوا

یہ جوانی تو عجب سر پہ قیامت لائی — یاد ایام کہ گذرا ہے لڑکپن کیسا

لے اڑا تجھ کو ترا حسن شباب — اب تو عالم ہی نرالا ہو گیا

عازم دشت جنوں ہو کے میں گھر سے نکلا — پھر بہار آئی قدم پھر نے سے سر پہ اٹھا

نادان ہیں وہ جو کہتے ہیں امید کسی سے — جز ذات خدا کوئی کسی کا نہیں ہوتا

اٹھ کے پہلو سے کدھر آپ ہیں جانے والے — جگر و دل ہیں تڑپ کر نکل آنے والے

آپ اپنی بے وفائی دیکھیے — ہم سے اور اتنی برائی دیکھیے!

ذکر رقیب عاشق شیدا کے سامنے — اچھی نہیں یہ آپ کی تقریر دیکھیے

دیکھا نہیں ہے طور نگاہ حضور کا — ہو جائیگا کوئی ہدف تیر دیکھیے

پیادہ پا میں رواں ہوئے لالہ زار ہوا — بہار آتے ہی سر پر جنوں سوار ہوا

مثل حباب بحر جہاں میں نہ دم لیا — اک موج تھا کہ میں ادھر آیا ادھر گیا

کسی کے وعدے کا دھیان آتا ہے — اٹک اٹک کے نکلتی ہے انتظار میں روح

سو بار مجھ پہ ہجر میں صدمہ گذر گیا — اب تک نہ آیا خیر مرا نامہ بر گیا

نو عنبر بکھر گئی ہیں نگاہ میں نقشہ جہاں کا — اب آئی عدم کی سمت سے آنا اگر ہوا

نہ روز حشر بھی جب اپنی داد کو پہنچا — خدا کے سامنے اس بت سے شرمسار ہوا

جنوں کا دلی لو ہو فرقت ہے سیر بیاباں پہ — ابھی کہیں ٹوٹ پڑے یہ سقف فلک دیوار زندان پر

رہ وہ حال دل کا ہے جو صبا ہم بیاں کریں — اللہ جانتا ہے بتوں کو یقیں نہ ہو

کبھی خزاں کبھی فصل بہار میں گذری — کب ایک سی چمن روزگار میں گذری

بتوں کے عشق میں مجھ کو ہلاک کر ڈالا — یہ کیا مشیت پروردگار میں گذری

جنوں کا داغ لگا گھر چھٹا اسیر ہوئے — ہزار طرح کی آفت بہار میں گذری

مثال دیر بھری ہیں بتوں کی تصویریں — الٰہی قصر دل خانماں خراب گرے

تا روز حشر یاد رہے گا یہ سانحہ — کٹی ہے جان ہجر کی شب کس عذاب سے

کبھی رسائی آہ جگر نہیں ہوتی — ہمارے دل کی اکھیں کچھ خبر نہیں ہوتی

درازی شب تار لحد معاذ اللہ — بغیر صبح قیامت سحر نہیں ہوتی

فراق یار میں دیکھو جسے وہ ناچ ہے — تسلی دل غمگیں مگر نہیں ہوتی

عجب نہیں مرے مرنے پہ آپ کا ہنسنا — کسی کے دل کی کسی کو خبر نہیں ہوتی

ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے — امتحاں ہیں ایک مشت خاک کے

آدمی دعوے انا الحق کا کرے — دلولے دیکھو تو مشت خاک کے
توڑ زاہد رشتۂ تسبیح کو — کھول دے پر طائر ادراک کے
مساجد سے زیادہ صف جنت کا جو واعظ — اٹھے مسجد سے اور کوئی بت بے پیر میں آئے

نہ جیب کا ہے نہ دامن کا تار باقی ہے — جنوں کا جوش ہے فصل بہار باقی ہے
شب فراق سے بچ جائینگے تو جانیں گے — کچھ اور زندگی مستعار باقی ہے
ہزار بار قیامت گذر گئی ہم پہ — مگر ہنوز شب انتظار باقی ہے
شب فراق ہیں تا صبح دیکھئے کیا ہو — ابھی تو رات دل بیقرار باقی ہے
کسی کو دیکھ کے قالب میں جی نہیں رہتا — یہ روگ آج تک اے جان زار باقی ہے

ہرگز نہ کوئی ملک عدم سے پھر آئے گا — عالم اگر یہی ہے بیان خراب کا

داغ جبکا چلی نسیم بہار ! — یہ ہوا میں چراغ کس کا ہے

کہتے ہیں سب ترے رخ پر نور کیلئے — زیبا تھا یہ چراغ سر طور کے لئے
ہلتا ہے عرش نالہ سے بے اختیار سے — اتنی تو بات ہے دل رنجور کیلئے
بنت العنب پری تھی تو جوبن کی مگر — زاہد پہ جن سوار رہا حور کیلئے

ہم عاشقوں کی خوبی تقدیر دیکھئے — آپ اپنے آئینہ میں تو تصویر دیکھئے
تیرے شب چہار دہم کے بناؤ سے — دو دن میں ماہتاب کا چہرہ اتر گیا

فکر رکھتے نہیں ہیں دیوانے — باعث غم شعور ہوتا ہے
ہم نہیں مجبور آپ ہیں مختار — کہئے کس سے قصور ہوتا ہے

گر محبت کا دل میں داغ نہیں — خانہ کعبہ میں چراغ نہیں !

کس دن شب غم جان کو آفت نہیں ہوتی — کب شام سے یاں صبح قیامت نہیں ہوتی
اللہ ہمیں عشق کے پھندے سے نکالے — دم توڑتے ہیں قطع محبت نہیں ہوتی

خدا کا قہر بتوں کا عتاب رہتا ہے — اس ایک جان پہ کیا کیا عذاب رہتا ہے

نہیں ہے اہل ہوس کیلئے حلاوت عشق — نصیب مور و مگس نیشکر نہیں ہوتی

کس طرح ہجر صنم میں کوئی دل کو سمجھائے — یہ کہاں سے کوئی پتھر کا کلیجہ لائے

دل لگانا عذاب ہوتا ہے — آدمی کیا خراب ہوتا ہے

میخانہ عالم میں غنیمت ہے مرا دم — اتنا بھی کوئی رند مے آشام نہیں ہے

جو دیکھے گا اس کو وہ اسی کا ہی کہے گا — تیرا کوئی لے دل نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے

ملا دی خاک میں میری جوانی ! — خدا سمجھے بت بیداد گر سے

شوق دیدار میں طاقت نہیں گویائی کی — حالت دل کا اشارہ نہیں بیاں ہوتا ہے
مجرم عشق ترحم کا سزاوار نہیں — ہائے کس پاس سے ہر سو نگراں ہوتا ہے

اس آفتاب کا جو کبھی سامنا ہوا — مہتاب چھٹ گئی رخ ماہ تمام پر

دم آخر جنوں طوق گلو گیر ہوا — عشق مچانے بھی نہ پائے تھے کہ صیاد آیا

باغباں بلبل کشتہ کو کفن کیا دیتا — پیرہن گل کا نہ اترا ابھی میلا ہو کر

قد قیامت کا ملا چال بلا کی پائی — آفتیں ڈھائیں نہ یہ فتنہ دوراں کیونکر
ہم کو تو ملک کے حسینوں سے بہت بچ کے ہوئے — خوش رہا کرتے تھے پریوں میں سلیمان کیونکر
جا کے مسجد کیطرف اس بت غارتگر نے — لوٹ لی زاہد کی دولت ایماں کیونکر

حسین کوئی نظر آیا ہوا میں آپ سے باہر — دل بیتاب ہے سینہ میں یا پارہ ہے معدن میں

یہ نشاں ہے مزار عاشق کا ! — چادر گل نہیں چراغ نہیں

اٹھے خرام ناز کو وہ دھوم پڑ گئی — فتنہ بپا ہوا ہے قیامت کہیں نہ ہو

پھاہا رکھیے کسطرح مرہم لگائے کس طرح — کیا کرے وہ جس کے دلمیں عشق کا ناسور ہو

کچھ اثر آہ میں جو پیدا ہو ! — پھر ہو جائے حشر برپا ہو

خاموشی میں دل سے وہ رہا کرتی ہیں باتیں — گویا کہ زبان ہے ہمیں کچھ کام نہیں ہے
واعظوں سے کوئی تعریف سنے حور و پری — مسجدوں میں تو قیامت کا بیاں ہوتا ہے

تربر قدرت آنکھیں ادم فنا کی کی روشن ہیں
جانا ہم سوچو جو چشم بینا ہو!
ایک ہی نور کا زمانے میں
انتہی تو دیکھ عشق کی تاثیر دیکھئے
دل کی صدا سے سو لیں بزم یقین ہے
اک ہی حال زمانے کا نظر آئے گا
تو چہ دیر و حرم گبر و مسلماں سمجھے
تازہ دماغ جاں کا فقر سے ہوا
کعبہ کی سمت سجدہ کیا دل کو چھوڑ کر
کہیں معشوق کہیں عاشق کہیں […] کیا
طائر عقل کو منفرد کیا زاہد نے
صبح محشر ترے عشاق تجھے دیکھیں گے
جامہ یار کی بو پائی تو صبا نے خوشبو
ساقی کی چشم مست نے ایسے جھوٹی لا کے لبہ
ہمیشہ کوشش دنیا میں مضطرب رہا
خوف کی جا ہے نہ چھیڑو دل سوزاں کو مرے
خود رہ تجھ سے ہیں حقیقت جو واجبی
بچ کر کہاں ہیں آنکھ نظر سے نکل گیا
تو جہاں رہ گئے ہم کچھ خبر نہیں
بعد مرنے کے پھر یار کی تسکین ہوتی
سمجھی دہر سے کیا خوف دل عاشق کو
رکھتے ہم مرے […] نیند شراب سے

شعاع مہر سے ہے نور ہر اک چشم روزن میں
آئینہ ہے جو دل مصفا ہو
سو طرح سے ظہور ہوتا ہے!
جس سمت دیکھئے تری تصویر دیکھئے
آئینہ جمال نیاز آفرین رہے
آگہی کر تو ذرا فقر و غنا سے پیدا
منزلت الٰہی نہ کی ذہن اسی سے جدا
سامان کیا کیا کہ بڑا درد سر گیا
تو کس طرف تھا وہاں یہاں کو نظر […] گیا
تجھ کو ہر بزم میں لے دل نے تخیل دیکھا
پر پرواز میں تسبیح کا ڈورا باندھا
ذرے سے خورشید سے ہیں آنکھ لڑانے والے
لیتے غنچہ و گل باغ میں کھولا باندھا
شعلہ سا ایک آتش تر سے نکل گیا
بہت تماشا کی خانماں خراب رہا
آگ سینے میں کسی نے کہیں جگر توڑا
دروازہ کھل گیا تو میں گھر سے نکل گیا
اک تیر تھا کہ صاف جگر سے نکل گیا
آیا کہ ہم سے یار کہ جس سے نکل گیا
دل کا بخار دیدہ تر سے نکل گیا
یہ وہ شیشہ ہے جو لڑھکا تو پتھر […]
انگلیاں چھوٹ گئے […]

میر دوست علی خلیل

تعارف: میر سید جمال علی کے بیٹے دوست علی نام خلیل تخلص۔ واجد علی شاہ کے عہد میں چکلہ دار تھے بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے غدر میں باغیوں کی فوج کے ایک حصہ کے کمانڈر تھے اور بڑی بہادری سے لڑے حضرت محل اور برجیس قدر کے ساتھ نیپال کی ترائی تک گئے کہ انگریزوں کی طرف سے عام معافی کا اعلان سنا بارہ ہزار عالینے کرنے والے جوانوں کو ساتھ لے کے معافی کے لئے آئے کہ اگر اس اعلان میں دغا ہو تو بہادروں کی طرح لڑ کے جان دیں۔ مگر انگریزوں نے معاف کر دیا۔ ۱۲۷۹ھ میں نواب نادر مرزا کے ساتھ کلکتہ بھی گئے تھے۔

شاعری میں خواجہ آتش کے رشید شاگرد تھے اور ان کی خیر گیری میں پیش پیش رہتے تھے۔

ایک دیوان گلزار خلیل یادگار چھوڑا ولادت اور وفات کا کوئی علم نہیں ہوا غالب خیال یہ ہے کہ جس سال غالب کی وفات ہوئی اسی سال خلیل نے بھی رحلت کی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

حیلہ ہی چاہئے ہے وہ عفو قصور کا
یہ تو مرے چراغ […] شمع طور کا
صورت قبلہ نما لاکھ تجھے گھر ملت
شمع کی روشنی جا مرجود پروانہ ہوا
کیا سمجھا تھا خون یوں ہر دم جائے گا
بہار آتے ہی گل عقل کا چراغ ہوا
چراغ طور سے روشن مرا چراغ ہوا

پھر کرم سے جوش میں رب غفور کا
جلوہ ہے داغ دل میں کسی ماہ نور کا
ہیں وہ آوارہ کہ منزل ہی کبھی رستی گرد
لاکھ پردوں میں بھی ہو جاتا ہے وصل حسن و عشق
کس لئے ہیں جوشش وحشت جوں سراز نہاں
جنوں کا زور ہوا شوق سیر باغ ہوا
خیال چہرہ روشن سے داغ دل چمکا

نہ زندگی میں مزا ہے نہ چین صورت بسمل | چھٹی جو روح بدن سے تو پھر قرار آیا
رواروی میں جوانی کا کچھ مزا نہ ملا | مثال فرمل کی طرح چار دن شباب رہا
بیدرنگ میں اس شوخ کا جلوہ نظر آیا | خورشید کے مانند وہ ہر جا نظر آیا
جب یار کو دیکھا نگہ دیدۂ دل سے | قطرہ نظر آیا تو وہ دریا نظر آیا
پرتو سے ترے دیکھتا ہوں نور عالم | تو روشنی دیدۂ بینا نظر آیا
وہ رنگ ہے تیرا کہ ترے رنگ کے آگے | جس رنگ کو دیکھا وہ پھیکا نظر آیا
آنسو بھرے ہیں آنکھ میں گرتے نہیں مگر | آخر چھلک چھلک کے یہ پیمانہ رہ گیا
اس درجہ ہوش اڑا دیے جلوے نے یار کے | اٹھا جو بزم یار سے وہ بے خبر اٹھا
میرے مرنے کا سبب پھر بھی کیا پوچھے ہو | غم ہوا درد ہوا درد کا درماں نہ ہوا
منہ تو محشر میں بھی دکھلائے گا | پھیر میں اور بھی شرمائے گا
فرقت میں اجل کا سامنا ہے | یہ وقت ہے سخت بے کسی کا!
سہے داغ سے آپ روئے عاشق | تمغہ ہے یہ عشق و عاشقی کا
چین دم بھر نہ مجھے صورت بسمل آیا | آ گیا منہ کو کلیجہ جو کہیں دل آیا
دل نہ قابو میں رہا متصل پہلو سے رہا | ناؤ ڈوبی مرے نزدیک جو ساحل آیا
دل گزرگاہ خیال بت ترسا نکلا | کعبہ سمجھے تھے جسے ہم وہ کلیسا نکلا
نہ مجھ سا بلبل شیدا دیدہ سرخ اپید | نہ تجھ سا گل چمن روزگار میں آیا
راز دل کیا کہوں کہ ڈھیلے یہ فرشتے ہیں ساد | کہیں عدم میں مجھے ملتا نہیں تنہائی کا
خط تقدیر کا شکوہ ہے عبث | اس نوشتہ کا ہے بیکار جواب
بسر کی عصیاں میں ہوتے گرد دل ہی | الٰہی توبہ الٰہی توبہ گنہ کئے ہیں چھپا چھپا کر
اللہ رے اضطراب دل بیقرار کا | مر مر کے صبح کی ہے شب انتظار میں
کیا کشمکش میں عشق نے ڈالا ہے کیا کروں | یار اختیار میں نہ اجل اختیار میں

بزم بتاں میں چھوڑ دیا دل کو بے خطر | شیشہ کو ہم نے پھینک دیا کوہسار میں
زندگانی کا سبب عاشق کی ہجر یار ہے | ذلت پروانے کی وصل شمع محفل میں نہیں
ہو نہیں سکتا ہے محسوس نظر نور نگاہ | گر باطن میں ہو ترے طالب دیدار ہیں
جوانی میں بڑھاپے میں دل بے غم نہیں ملتا | بہار زندگی کا لطف ملتا ہے لڑکپن میں

ہوں بندۂ عشق بتاں کچھ دیر و حرم سے کام نہیں
مذہب ہی جدا ہے الفت کا یاں کفر نہیں اسلام نہیں

فصل گل میں بھی معشوق سے توبہ کی ہے | دس خطا پر بھی خجل ہوتا ہوں کیا کیا دل میں
چشم دل سے جو یار کو دیکھے | پھر کوئی بیچ میں حجاب نہیں!
خاکسار دل ہی سے منزل کا پتہ ملتا ہے | نقش پا رہبر دل کو راہ نما ہوتے ہیں
ہر موسم گل میں طوق و زنجیر | توبہ کی طرح سے ٹوٹتے ہیں
زباں وہاں محبت بزم عالم میں نہیں کوئی | سناتا درد حسن و عشق کی داستاں برسوں
ہجر میں موت ہی عبادت کے دن | نظر آتے نہیں نجات کے دن
ہم سخن چپکے رہے طور پہ تجلی کی داستاں | لے بت نقاب رخ نہ اٹھانا جلال میں
روز الست سے ہے وہ میرے خیال تک | اللہ کب سے ہوں شوق وصال میں
عقدۂ نیاز و ناز کا ہرگز نہ حل ہوا | آیا نہ حسن و عشق کا قصہ خیال میں
پھر وہی طول شب ہجر نظر آتا ہے | پھر وہی ہے مجھے دھڑکا کہ سحر ہو کہ نہ ہو
تم سنو یا نہ سنو نالے کئے جاؤں گا | درد دل کہنے سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہ ہو
جمال جوہر کا مٹی کی مورتوں کو دیا | کمال صنعت پروردگار کو دیکھو
جگر بس ہو گیا داغ جگر سے | یہ ٹہنی پھٹ پڑی بار ثمر سے
نہ دیکھا ایک دن بھی پھر کے دن کو | رہا دکھ سہا اپنی بھی نظر سے
الٰہی روز کا رونا کہاں تک | کلیجہ منہ کو آیا چشم تر سے

نہ موافق کبھی طبع بت بے پیر ہوئی ۔ یہ کبھی ہم سے لئے گویا مری تقدیر ہوئی

شب تو مر مر کے سحر کی غم تنہائی سے ۔ دیکھئے ہجر کا دن کیا ہمیں دکھلاتا ہے

اپنے نالوں سے گلستاں میں ہوا یا بندھے ہم ۔ ایک دن تو صلہ مرغ چمن دیکھیں گے

دیں گے ہم عشق جوانی کو بڑھاپے میں فروغ ۔ جوہر تشنہ ہمیائے کہن دیکھیں گے

ہوتے ہیں ہشیار جو حیراں ہیں ازل سے ۔ آئینہ کی حیرت کسی صورت میں نہیں جاتی

بدلے یہ گلستاں جہاں رنگ ہزار ہوں ۔ خوشبوئے گل داغ محبت نہیں جاتی

معلوم ہوا جامہ صد چاک سے گل کے ۔ کپڑے بھی پھٹے ہوں تو شرافت نہیں جاتی

پیدا ہزار رنگ ہیں نیرنگ حسن سے ۔ گلدستہ بہار ہے تصویر یار کی

کچھ رنگ ڈھنگ جوش جنوں کہیں فرح ۔ گذرے الٰہی خیر سے مدت بہار کی

ڈر سے کہہ سکتے نہیں جس شب تک آتی ہے بہار ۔ منہ کو تکتے ہیں اسیران قفس صیاد کے

ہو اشباب مرا شیب کیا قیامت ہے ۔ تری بہار کو دیکھیں مری خزاں دیکھیں

یہ رہائی سے گرفتاری میں پایا ہے مزا ۔ پڑھتے ہیں کلمہ اسیران قفس صیاد کا

رہائی محبس گردوں سے پائی قبر میں جا کر ۔ نکالا ہے زمیں کو کھود کے دروازہ زنداں کا

کیا بتاؤں میں تجلی گاہ کو میں شوخ کی ۔ ہوش آئے کس طرح سے بے خبر کیوں ہو

کیجئے نہ پوچھو بتا نہیں سکتا ۔ کس سے چھوٹا ہوں کیا نہیں ملتا

آسماں و زمیں شکنجہ ہے ۔ چین اس میں ذرا نہیں ملتا

دل ہی دل میں گفتگو رہتی ہے باہم روز و شب ۔ میرے اس کے درمیاں تقریر کی حاجت نہیں

جوانی میں بڑھاپے میں دل ہے غم نہیں ملتا ۔ بہار زندگی کا لطف ملتا ہی لڑکپن میں

مسلماں جانتے ہیں شمع قندیل حرم تجھ کو ۔ چراغ دیر ہے تو اے صنم چشم برہمن میں

ایڑیاں ہجر کی ایذا میں کہاں تک رگڑوں ۔ یا الٰہی مری مشکل کبھی ہو آساں کہیں

زاہد اس ڈر سے نہیں دیکھتے اس کی جانب ۔ کہ تلاوت منت میں ہو جائے نہ نقصاں کہیں

میر سیادت حسین عرف آغا بچو شرف

آتش کے شاگرد واجد علی شاہ کے مصاحب اور ہمدم ان پڑھ تھے مگر کلام اغلاط سے پاک اور پختہ ہے ان کا ایک خاص رنگ ہے دیر و بتکدہ صنم و برہمن ناقوس و قشقہ زنار و تسبیح زاہد و مصلی نمود ذن و واعظ و شیخ میخانہ و شیشہ و ساغر ساقی و پیر مغاں جام و صراحی کا ذکر نہیں آنے پاتا تھا کہتے تھے کہ جن شعروں میں ایسے الفاظ ہوتے ہیں ان سے مجھے نفرت ہو جاتی ہے راجہ امیر حسن خاں صاحب محمود آباد نے ان کا دیوان چھپوا دیا ہے مجھے دیوان نہیں ملا تذکروں سے اشعار نقل کئے ہیں اگر دیوان مل جاتا تو انتخاب کچھ اور ہوتا۔

جھٹپٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا ۔ صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

منزل عشق کا حال آپ میں آؤں تو کہوں ۔ دم ذرا لینے دو میں دل کو سنبھالوں تو کہوں

کون ہے جس سے فسانہ کہوں دل تیرا ۔ سننے والا کوئی پہلو میں بٹھالوں تو کہوں

پوچھتے کیا ہو حقیقت مری بیتابی کی ۔ آؤ میں تم کو کلیجہ سے لگالوں تو کہوں

پھڑک کے جان نہ دیتا تو وہ کیا کرتا ۔ قفس سے اور نکلنے کی راہ کیا کرتا

چار سمت مجھے تو ہی تو نظر آیا ۔ اٹھا کے آنکھ جدھر انتظار میں دیکھا

اے شہر داغ حسن پرستی کا مزا اتنا مجھ کو ۔ دل دیا اس کو جسے پیار کے قابل سمجھا

شاخ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی ۔ پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا

ہائے تقدیر ہم جب پہنچے بزم یار میں ۔ شمعیں سب گل ہو چکی تھیں ہم ہیں پروانوں میں

دیدہ گا خاک میں اک دن تماشہ دنیا کا ۔ یہ کارخانہ ہے مشت غبار سے پیدا

ہے نیازی یہ انھیں ناز مرے دم تک تھا ۔ لن ترانی کی نہ پھر آئی صدا میرے بعد

داغ پھر ان جگر و دل میں ہم رکھتے ہیں ۔ آپ کا تحفہ نہیں ہے جو چھپا ہی دیکھیں

کام عمر نہ بیٹھے کہیں ٹھکانے سے ۔ لے پھری ہیں دن رات جستجو تری

ٹپک ٹپک کے کہیں گل بنا کہیں لالہ
چمن میں رنگ نے لایا مرا لہو کیا کیا

اندیشۂ اجل سے نہ مہلت کبھی ملی
جو لطفِ زندگی تھا وہ حاصل نہ کر سکا

کمال ربط دلِ بے قرار میں دیکھا
کہ عمر بھر اسے پہلوئے یار میں دیکھا

دو روزہ ہے بہارِ عمرِ انساں یاں عالم میں
غرض یہ چلتی پھرتی چھاؤں ہے عالم جوانی کا

گلوں کی شکل بھی ہم نے نہ آنکھ سے دیکھی
بہار آتے ہی ہم کو اسیر ہونا تھا

دل کو بچا تو نہ یار کی تیر نظر سے کیا
پہلو تہی کمند میں قضا و قدر سے کیا

پانی ہو جانے کو وہ ہے پر لہو ہوئے کو
نہ بھروسا ہے جگر کا نہ بھروسا دل کا

کچھ بس نہ میری گردشِ قسمت سے چل سکا
چکر میں لاکھ طرح آسماں رہا

لی راہ جب مجھے دریا نے ہم ہی یاس سے
نہ کوئی آشنا نکلا نہ کوئی ناخدا نکلا

موجود جو نقش کا ہے وہ میرا اختراع ہے
پروانہ ہوں میں انجمنِ کائنات کا

روح رخصت ہے جگر خون ہے دل زیر و زبر
آج شیرازۂ ہستی ہے پریشاں اپنا

تن بیمار سمجھا یہ گیا ہوا سے بھی سنبھلتا جاتا ہوں
بیمارِ دل نے اللہ دیا ہے گا کہ قفس کا ہے آشیانہ

اک بات میں پائی جو شوخیِ یار کی
ہم نے بھی اپنی جان لڑا دی قضا کے ساتھ

شمار کون کرے گا تمہارے کشتوں کا
یہ بے شمار ہیں ان کا شمار کیا ہوگا!

زلف الجھے گی تو شانے سے سلجھ جائے گی
دل جب الجھے گا تو کوئی نہیں سلجھانے کا

سمجھا تھا جو گرد کے مجھے بے نشاں کیا
کیا جلے اس نے میری طرف کیا گماں کیا

ستے ہیں بند پھر سے آئے پھر ہر طرف
محشر میں اس کو ڈھونڈھنے کی راہ کیا کرو

جہاں تک جیتے عالم ہو اس پر جس قدر کم ہے
دیکھے کسی نے ہاتھ اس کے دستِ قدرت میں

سینوں کو ڈھالنے حسن کے سانچے میں ڈھالا ہے
حقیقت میں یہ سب آئینہ و تصویر تکتے ہیں

کسی کے عشق میں یارب آنکھ ہو نیچی
کلیم طور پہ جائیں میں عرش پر جاؤں

اس کو حیرت ہے ادھر مجھ کو ادھر سکتا ہے
یار تصویر ہے آئینہ دیوار ہوں میں

اس کے بھوٹے کا تو دنیا میں ٹھکانا ہی نہیں
حیات کا کام ہے جو ہے ہیں کھڑے روئیں ہو

پنڈت دیا شنکر نسیم!

تعارف:۔ لکھنؤ کے کشمیری برہمن علم و فضل میں مشہور ہیں۔ بڑے بڑے شاعر اور انشا پرداز ان میں پیدا ہوئے۔ کول۔ چکبست۔ شرر ان کے مشہور خاندان میں نسیم کو لکھنؤ ۱۲۲۷ھ میں پیدا ہوئے۔ بیس برس کی عمر میں آتش کے شاگرد ہوئے۔ ۱۲۵۴ھ میں مثنوی گلزارِ نسیم لکھی ہے اس سے ایکا ایکی ان کی شہرت ہو گئی۔

۱۲۶۰ھ میں یعنی تصنیف کے چار برس بعد یہ مثنوی چھپا اسی سال ہیضہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۲ سال کی تھی۔

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

جب ہوئی شراب تو میں مست مر گیا
شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

سمجھا ہے حق کو اپنی ہی جانب ہر ایک شخص
یہ چاند اس کے ساتھ چلا جو جدھر گیا

جنوں کی چاک زنی نے اثر کیا دل پر بھی
جو خط میں حال لکھا تھا وہ خط کا حال ہوا

بہار رفتہ پھری اب تیرے تماشا کو
چمن کو کس قدم نے ترے نہال کیا

اشک ٹپکے حال دل کا کھل گیا
دیدۂ گریاں سے پردہ کھل گیا

کوچۂ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ
بند کیں آنکھیں تو رستہ مل گیا

بجز گورِ غریباں نقش پا ملتے نہیں آگے
یہیں تک ہر مسافر نے پتہ پایا ہے منزل کا

بت خانہ کا پابند نہ کعبہ سے تعلق
آزاد ہے قیدوں سے گرفتار تمہارا

شب فراق میں آنکھیں لگی ہیں یا لب دم
لبوں پہ آہ ہے دل میں خیال آہٹ کا

دل بدلا آئینہ ہے دیر و حرم!
حق جو پوچھا یک در ہے دو طرف

بے حجابی پردہ در پردہ جو آ جاتے ہیں
شرم رکھ لیتی ہے آنکھوں پہ نظر کا پاس

تجھے دل دیکے میں نے آزمایا !
وہ دیکھا جس سے کچھ کھویا ہے پایا ہے

جنبش ہوئی مژہ کو تو برہم ہوئے دو کون
آہو سے چشم یار کی یہ ایک جست ہے

کہتے ہیں تجھ کو زلف دیدہ تر دل بھی آئینہ
پیمانہ کو کیا خبر تھی کہ پانی میں شرارت ہے

شاگرد خواجہ آتش ہندی جو ہے نسیم
کہتے ہیں پارسی کہ یہ آتش پرست ہے

جوہر تیغ نگہ کھل جائے گا
منہ نہ میرے زخم کا کھلوائیے

جیا نہ جیتے جی مرے کام آئے گی
کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا
شاخ گل ایک دن جھونکا کھائے گی

کچھ تو ہوگا ہجر میں انجام کار
بیقراری دل کچھ نہ کچھ ٹھہرائے گی

دل سے ہر دم ہوتی ہے آواز کہ یا علی
بیت اللہ کو بھی گریہ کی صدا آتی ہے

دوزخ و جنت ہے اب مری نظر کے سامنے
گھر رقیبوں نے بنایا اس کے گھر کے سامنے

خواب میں شب کو خیال آیا تھا جنت کا ہمیں
صبح دیکھا تو پڑے ہیں تیرے در کے سامنے

نظارہ بازی سر آنکھیں ہیں یا نکیں تسکین
تسلی دل امیدوار باقی ہے !

نام پر حسرت نہ آنے دیجیے
جان اگر جائے تو جانے دیجیے

کیوں خفا رشک حور ہوتا ہے
آدمی سے قصور ہوتا ہے

ایک اقلیم میں دو شاہ نہیں رہ سکتے
عشق جب آیا تو آرام کہاں رہتا ہے

جو جیب ہوا تو جنوں ان پہ خوش کھاتا ہے
دنیا کروں تو گریباں گلا دباتا ہے

سیر بیاباں چاک گریباں !
وہ پائے خردی یہ دسترس ہے

صبر رخصت ہے تو جانے دیجیے
بیقراری آئے تو ٹھہرائیے !

نام پر حسرت نہ آنے دیجیے
جان اگر جائے تو جانے دیجیے

ٹکڑے جگر کے آنکھ سے باہر نکل گئے
ارمان آج دل کے ہمارے نکل گئے

بیدار ہیں بخت خفتہ ہجر
یارب آنکھوں کو خواب دیدے

مجھ سے پہلے کوئی اس شوخ پہ کب مرتا تھا
ملک الموت ہوا میری قضا سے پیدا

بتوں کی گلی چھوڑ کر کون جائے
یہیں سے ہے کعبہ کو سجدہ ہمارا

شب جو آیا بزم میں وہ شعلہ رو
شمع گل کرنے کو پروانہ جلا

صہبا کشوں کی خاک ہے ہر اک مقام پر
ساقی لنڈھا شراب کہ مستوں کے نام پر

دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند
واللہ ہوشیار ہے وہ جو کہ مست ہے

کچھ خبر ہے شب دراز فراق
چاک پیراہن سحر کیوں ہے

عشق کے زینہ کے آگے آسمان بھی پست ہے
سر جھکایا ہے فرشتوں نے بشر کے سامنے

خم نہ بن کر خود غرض بن جائیے
مثل ساغر اور کے کام آئیے

ابر رحمت سنتے ہیں نام آپ کا
خاکساروں پر کرم فرمائیے

اب آہوئے چشم میں آہو نہیں
ہم سے وحشت کی نہ کیجیے آئیے

دل لگا کر اس نے ٹھانی ہے یہ دشمنی
بڑھ کے ہو جاتی ہے آخر دل لگی میں دشمنی

طوفان نوح اس میں ہو یا شور حشر ہو
ہونا جو ہے وہ ہوگا جو گزرا گزر گیا

بے دل جو مجھ کو پایا تو بولا خیال یار
مہماں بلا کے صاحب خانہ کدھر گیا

کس سوچ میں ہو نسیم بولو !
آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

زنجیر جنوں کڑی پڑے لو !
دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے

آتا ہو تو اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجیے
جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجیے

گل ہو گئے چراغ سحری اے بلبل
ہاتھ ملتی ہوئی پتوں سے صدا آتی ہے

آغا حسن امانت
شاگرد دلگیر

تعارف:- سنہ ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۲۷۵ھ میں انتقال ہوا۔ لفظی رعایت میں مشہور ہیں اور اکثر بے ڈھنگا پن پیدا ہو گیا لوگ اسی کو انکا امتیاز سمجھتے ہیں اور ایسے ہی اشعار پیش کرتے ہیں حالانکہ ان کے یہاں اچھے شعر بھی ہیں آج ہم آپ کو ان کے اچھے شعر سناتے ہیں ؎

روح کو راہِ عدم میں مرا تن یاد آیا
دشتِ غربت میں مسافر کو وطن یاد آیا

جیسے پھولے گئے رنج و محن یاد آیا
رو دیا میں نے قفس میں جو چمن یاد آیا

برگِ گل دیکھ کے آنکھوں میں ترے بھر گئے لب
غنچہ چٹکا تو ترا لطفِ سخن یاد آیا

آہ کیوں کھینچ کے آنکھوں میں بھر آئے آنسو
کیا قفس میں تجھے اے مرغِ چمن یاد آیا

بتوں کے عشق میں کیا جی کو اضطراب دیا
یہ دل دیا کہ خدا نے مجھے عذاب دیا

گلشنِ دہر میں آئی برس دن میں بہار
اس سبکروح کو بھاری ہوئی منزل کیسی

وہ بت مجھ سے ناحق خفا ہو گیا
خداوندِ عالم یہ کیسا ہو گیا!

نکالی غنچہ نے بات اس کے مسکرانے کی
ہنسی ہنسی میں یہ مجھ کو رلائے گا پھر کیا

ہے فصلِ بہاری میں یہ صیاد کا دھڑکا
دل اڑ گیا بلبل کا جو پتہ کہیں کھڑکا

روشن دلوں کو بادِ حوادث سے کیا گزند
صرصر سے گل ہوا نہ چراغ آفتاب کا

کون تھا بارِ غمِ عشق اٹھانے والا
مجھ کو پیدا جو نہ کرتا تو خدا کیا کرتا

لطف اب زیست کا اے گردشِ ایام نہیں
مے نہیں یار نہیں شیشہ نہیں جام نہیں

فریاد ہجر میں نہ کبھی عمر بھر کریں
مر جائیں بھی تو ہم نہ کسی کو خبر کریں

فصلِ گل میں رات دن بس ہم ہوں اور میخانہ ہو
ساقیِ مہوش ہو مے ہو شیشہ ہو پیمانہ ہو

بزمِ عالم کے حسینوں میں عجب اندھیر ہے
جان یوں پروانہ دے اور شمع کو پروا نہ ہو

یک بیک شب کو جو وہ رشکِ قمر آ نکلا
چاندنی کھل گئی فوراً مرے سارے گھر میں

کر سبک تن کو مرے مثلِ حباب اے غمِ یار
روح کہتی ہے کہ پوشاک بہت بھاری ہے

بچا لیجئے گا بات مری مان لیجئے
میں جان دوں گا آپ پہ یہ جان لیجئے

لب خشک چشم تر ہے زباں لال چہرہ زرد
عاشق کو شکل دیکھ کے پہچان لیجئے

ہرگز لگائیے نہ امانت بتوں سے دل
کہنا مرا خدا کے لئے مان لیجئے

کس کے نالوں نے کیا بزم کو روشن مطرب
آج کیوں شعلۂ آواز ترا مدھم ہے

دورِ ساغر میں نظر آتی ہے ساری دنیا
جم گیا جام کا جب رنگ تو ساقی جم ہے

بہار آئی ہے گلشن میں گھٹا جاتا ہے دم اپنا
قفس کے در کو وا کرتا نہیں صیاد کیا کیجے

دل مرا اسیرِ چمن سے نہ ہوا شاد کبھی
لے گیا باغ میں پنجرے سے نہ صیاد کبھی

بلبلو کس کو دکھاتی ہو عروجِ پرواز
ہم بھی اس باغ میں تھے قید سے آزاد کبھی

وہ دم حسینوں کا بھرتا ہے ہو گئی مری زیست
جو خود مریگا کسی کو جلائیگا پھر کیا

خطِ حسن اُن کا دیکھئے مجھ کو نامہ بر دے بیٹھا اک گالی
کہا میں نے یہ کیا بولا کہ پیغام زبانی ہے

تارے بنا کے سر پہ رکھے آسماں نے
ذرے ترے جو آ گئے جوتی کے نقشِ پا کے ساتھ

آئی بہار ساقیا جام شراب دے پلا
پھول کھلے شجر ابر اٹھا چلی ہوا

اگلی بہار کے لئے رکھ لئے اے جنوں
دو چار تار ہم نے گریباں میں رکھ لئے

جو غرق ہوا پھر نہ لگا اس کا ٹھکانا
ساحل کا پتہ عشق کے دریا میں نہیں ہے

مرتا ہوں ترے ہجر میں اے یار خبر لے
اب جان سے جاتا ہے یہ بیمار خبر لے

کس غم کو ہم اس دل پہ گوارا نہیں کرتے
شکوا ترا پر اے ستم آرا نہیں کرتے

لطفِ یار ایک گھڑی ہجر کا برسوں ستم ہے
فرصتِ خوشی زمانے میں نہایت کم ہے

اللہ رے ہجومِ گل و جوشِ بہار
ملتا نہیں چمن میں مرا آشیاں مجھے

تیری بھوؤں میں بل پڑا قتل ہوا میں تیغ سے
تری ادھر پلک جھپی مجھ پہ ادھر چلی چھری

عریاں رہا جنوں میں مرا ہر طرح بدن
دامن رفو ہوا تو گریباں نکل گیا

ڈھونڈھتا ہے رخِ جاناں کو مرا دل کیا کیا
داغ دیتا ہے فروغِ مہِ کامل کیا کیا

کسی کے غم نے رلایا مگر امانت کو
کہ آج گھر سے بچشمِ پُر آب نکلا ہے

جو غرق ہوا پھر نہ نکلا اس کا ٹھکانا
ساحل کا پتہ عشق کے دریا میں نہیں ہے

کہدو ظالم سے کہ عاشق کو گوارا ہے ستم
غیر سے ہوتے نہ کسی اور یہ بیداد کیجے

جس نے نظارہ کیا اصل علی یاد آیا
تیرے حلقہ میں صنم حسنِ خداداد آیا

چمن میں جو آیا وہ رشکِ بہار
تو رنگِ رخِ گل ہوا ہو گیا

مزا وصالِ صنم کا اٹھائیگا پھر کیا
ذرا جو تجربہ سے وہ دل لگا کے پھر گیا

رخِ جاناں پہ نظر کر کے بڑھا گل کا نیا
قد کو دیکھا تو مجھے سروِ چمن یاد آیا

نرگس کی زباں پہ بدل شاد آیا
منہ نہ کھولا تھا کہ پر باندھنے صیاد آیا

ہو گئی قطع اسیری میں امیدِ پرواز
اڑ گئے ہوش جو پر باندھنے صیاد آیا

چھپائے محتسب کی جو شمع حیا تھی
میخانہ میں چراغ جلاؤں شراب کا

شعلہ ہے یا شرر ہے چھلاوہ ہے یار کا
بجلی چمک گئی وہ جدھر سے نکلے

دل حشر بپا کرتا ہے سر پر مرے کیا کیا
جو تیر کی شدت سے قیامت کی گھڑی ہے

ہوا قفس میں یہ صیاد آشنائے مزاج
کہ عندلیب کو پانی کی جا گلاب دیا

فصلِ گل آئی چمن میں کہ قیامت آئی
عندلیبوں نے اٹھایا ہے گلستاں سر پر

دم خفا ہوتا ہے کیا کیا قفس ہی میں
دیکھیں اس قید سے کس روز رہا ہوتے ہیں

پھر نہ دل پہ امڈتا ہے وہ غم کا دریا
شب کو نالے مرے سوتوں کو جگا دیتے ہیں

رنگ جمتا نہیں لالے کا پھرانے غیرتِ گل
ہوا چمن میں جو تجھ سے منہ قبا ہوتے ہیں

وطن آوارہ کی آنکھوں میں بھر آئے آنسو
دیکھ کسی یاس سے خیمہ وقتِ سفر کی

سید مظفر علی اسیر

تعارف:۔ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۲ء میں انتقال ہوا۔ مصحفی کے شاگرد تھے مگر ۲۴ برس کا سن تھا کہ مصحفی کا انتقال ہو گیا اس عمر میں انہوں نے کیا حاصل کیا ہو گا۔ ان کے کلام میں جو پختگی ہے وہ ان کی ذاتی صلاحیت کا نتیجہ ہے ان کا کلام ناسخ سے متاثر ہے۔

نبض بیمار ہو نے رشکِ مسیحا دیکھی
آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

مسجد سے نکل کر ہیں رہِ دیر کو بھولا
تقدیر نے میری مجھے رکھا نہ کہیں کا

اٹھنا انھیں منظور ہے پہلو سے ہمارے
حیلہ ہے کہ دیکھی نہیں جاتی تپشِ دل

ہیں اور زیست بھر میں قدرت خدا کی ہے
انسان کے اختیار میں اپنی اجل تھی

باقی رہی ہے ترکِ تمنا کی آرزو
کیونکر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں مجھے

وہ نہ آیا تھا اگر موت ہی آتی شبِ ہجر
اے فلک کوئی تو امید بر آئی ہوتی

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز ہے دنیا
ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

دیکھے اسیل بدل کان پھیر نہ ملے گا الیا
قدم آگے نہ بڑھا سا مرا ویرانے سے

وہ صنم تو ہے کہ نکلا جو کبھی جانبِ دیر
تربت نکل آئے تماشے کو صنم خانے سے

نہ پیالے ہیں نہ وہاں لوٹتے ساغر کوئی
کون ہشیار ہے بیٹھ کر تمنے دیوانے سے

شباب تھا کہ الٰہی نسیم کا جھونکا
کہ دفعتاً ادھر آیا ادھر روانہ ہوا

سن کے باتیں اس کی کہتے ہیں سبھی جوش آ گیا
شعلہ آواز برق لن ترانی ہو گیا

کچھ تو الفت کی ترے کوچے سے بو آتی ہے
گرد اٹھ کر مرے دامن سے لپٹ جاتی ہے

ٹوٹ ہوئے نہ دیا نہ کہیں تو یہ ہے
موجیں اٹھتی ہیں طبیعت مری لہراتی ہے

نشہ ٹلکے وقت عزیزوں کو صحبت کبھی
ہو چکی ختم کہانی مجھے نیند آتی ہے

ہر خاکسار صاحب توقیر ہو گیا !
پارہ ہوا جو خاک تو اکسیر ہو گیا

سیر چمن نہ کی تھی کہ نخچیر ہو گیا
نکلے جو بال و پر، ہدف تیر ہو گیا

حیرت ہوئی یہ اس کے نظارے سے خلق کو
عالم تمام عالم تصویر ہو گیا

رہا ہے یاد ابرو میں مجھے شغل فغاں برسوں
وہ موسم ہو کہ دیکھے ہیں [illegible]

صبا واقف ہوئیں کبھی پتے پتے بوٹے بوٹے سے
ہمارا بھی رہا ہے اس چمن میں آشیاں برسوں

مزا عشق جوانی کا کوئی جانتا ہے پیری میں
جو زخم اچھا کبھی ہوتا ہے تو رہتا ہے [illegible]

نہ کعبہ کا نہ ہم سے دیر کا ہے حال پوشیدہ
پھرا ہم نے بھی عمر کاٹی ہے [illegible] برسوں

تدبیر جب کوئی نہ چلی وصل یار کی
انجام کار قائل تقدیر ہو گیا

کی یار نے جو غیر کی جانب نگاہ لطف
اپنے جگر سے پار [illegible] تیر ہو گیا

قصد لٹنے کا تو تھا اس کو ہمارے پاس سے
چار آنکھیں ہوتے ہی [illegible] ہو گیا

کیسے کیسے گل خزاں کے جور سے مرجھا گئے
پتہ پتہ اس چمن کا ہاتھ مل کر رہ گیا

نہ کیوں کر [illegible] طبیب نفس الدہ
لباس دوستاں [illegible] مشکل ہے [illegible]

اللہ رے شوق خط بھی نہ ہم نے کیا تمام
قاصد کمر کو باندھ کے تیار ہو گیا

الٰہی دل سے شوق ملاقات رہ گیا
موت آ گئی جب قریب ہمارا وطن رہا

ہوا ہے شوق سو کعبے [illegible] مجھے
یہی جو ہیچ ہے تو حال [illegible] ہوگا

گھڑی گھڑی کی خبر ہم کو دل کی ملتی تھی
جو خط کا وہ نہ لکھیں گے تو جانے کیا ہوگا

شب مہلت [illegible] نہ دل کو سخت ایذا ہے
یہ بڑھ جائے [illegible] کوتاہ ہو جائے

گھٹا کے بدر کو ہر ماہ میں ہلال کیا
تمہارے چاند سے چہرے نے بھی کمال کیا

گدا ہوئے تو گدائے در کریم ہوئے
کیا سوال تو اللہ سے سوال کیا

سجدہ بھی [illegible]
ہے جیسے داغ ترے در پہ جبین سائی کا

ہوں وہ عاشق مجھے سوز غم [illegible] پسند
دل ہے پروانہ چراغ شب تنہائی کا

دل مضطر کہیں عاشق کا ٹھہر سکتا ہے
ماہی نام ہے بس صبر و شکیبائی کا

واہ رے دور فلک خانہ احسان آباد
چتر بخشا سر مخمور کو انگڑائی کا

کب ملی فرصت تڑپنے کی ترے بیمار کو
کچھ کمی درد جگر نے کی تو درد دل اٹھا

جب تک جئے جہاں میں مر مر کے ہم جئے
جس خوبرو پہ آنکھ پڑی دم نکل گیا

وصل معشوق میں پھر ہستی عاشق کیسی
قطرہ مل جائے گا دریا میں تو دریا ہوگا

بتکدے کی میں سیر کر آیا !
واں خدا ہی خدا نظر آیا

ہوں وہ بسمل کہ ہوں میں عاشق درد
دل بھر آیا جو کوئی زخم جگر بھر آیا

ذرا سی بات میں ہوتے ہیں اپنے بیگانے
بڑا کمال کسی کو ہے اپنا کر لینا

گردش بخت زبوں جور فلک رنجش یار
درد لاکھوں ہیں کس کس کا مداوا کرتا

مطلب دل بے طلب ہو جائے گا
جب خدا چاہے گا سب ہو جائے گا

تو جو خورشید ہے تو میں شبنم
میں کہاں جب ترا ظہور ہوا

طائر بے بال و پر ہوں کیسی پرواز چمن
نام ہے بے تابی دل شوخی پرواز کا

بخشا مجھے خالق نے فرشتوں سے یہ کہہ کر
جرم اس نے کئے ہیں مجھے غفار سمجھ کر

مرتبہ حسن کا تکلیف میں گھٹتا ہے کہیں
خوشنما لگتی وہ زلفیں ہیں پریشانی پر

روشن اسی سے محفل آفاق ہے تمام
رکھتا ہے مثل شمع جو سوز و گداز عشق

مزاج وہ نہ رہا وصل یار کے نزدیک
جنوں ہوا جو دوانہ ہے یار کے نزدیک

ابھی ہے اتنی محبت کہ راہ چلتے ہیں
ٹھہر ٹھہر کے ہمارے مزار کے نزدیک

فرقت میں شوق وصل تو وصلت میں خوف ہجر
راحت فراق میں ہے نہ ہم کو وصال میں

تمام سال ہو دشوار ترک مے ہے اسیر
ہر ایک ماہ کو رمضاں کریں قیام کریں

گھبرا کے کہتے ہیں گل نام ہے کس کا
صیاد بہار ہم آ گئی آنکھ قفس میں

پوچھا ہو کسی نے نہ ہمیں روز قیامت
دوزخ بھی گئی ہاتھ سے جنت کی ہوس میں

نظر آتا ہے ترا چہرۂ زیبا کس کو — حسن بے پردہ ہے پر تاب تماشا کس کو
ہو نہیں بیمار محبت مگر اتنا نہیں ہوش — درد کیا چیز ہے کہتے ہیں مداوا کس کو

وہ دل ہی کیا کہ جو ہو داغ عشق سے خالی — اسیر خانۂ دشمن بھی بے چراغ نہ ہو

حال دل قابل تماشا ہے ! — تم جو دیکھو نیا تماشا ہو

عشاق اور تاب تماشائے روئے یار — چمکی جو برق طور غش آیا کلیم کو

کہتی ہے قیامت میں حسرت دل مجھ سے — دوزخ میں چلو جب تک آراستہ جنت ہو

چھپتی نہیں ہے اس سے کبھی پیار کی نگاہ — پہچانتا ہے طالب دیدار کی نگاہ

حسن کے طالب نہیں کچھ تمیز کفر و دیں — ایک پروانہ کو شمع کعبہ و میخانہ ہے

دیکھتی ہے وقت زیب اپنی سی اور شکل — آئینہ کی طرف نظر اشتیاق سے ہے

کعبہ چلتا ہوں پر اتنا تو بتا — میکدہ ہے کوئی زاہد کہ نہیں
بکتا رہا ہے تو میں بیٹھا ہوں خموش — تجھ کو اے ناصح ہے یا سودا مجھے
موجود ہم ہیں خاک میں ملنے کو اے اجل — لیکن یہ شرط ہے کہ وہاں آسماں نہ ہو

ثابت اپنا نہ ہوا خون کسی پر دم حشر — ناز نے غمزے پہ غمزے نے ادا پر رکھا

بیٹھے ہیں جا کے پہلوئے قاضی میں ترے مست — مسجد کے پاس میکدہ تعمیر ہو گیا

پھولتا پھلتا مرا نخل تمنا کس طرح — بچ رہا بجلی سے تو پانی جل کر رہ گیا

پیام مرگ تماشائے روئے یار ہوا — چمک کے برق چراغ سر مزار ہوا

تھوڑی سی عمر اور سو ناز تجھے عطا — رہ جائے آسماں کو نہ بیداد کی ہوس

محشر میں کریں گے دعوے کہ عفو — تحریر خط جبیں سند ہے

جوانی دی اگر تو نے تو یہ بھی لے خدا اپنی — شباب اتنا ہو جائے کہ دل کا حوصلہ نکلے

دھوم محشر میں ہوئی جب مری آمد کی — بے گنہ مل گئے چھپ چھپ کے گنہگار وہیں
بے ہوش ہی آیا تھا گیا دہر سے بے ہوش — آنے کی خبر جسکو نہ جانے کی خبر ہے !

لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا دور

اس دور کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آتش کے تلامذہ کا سلسلہ ختم ہو گیا جس کی وجہ یہ ہے کہ خود آتش عروض و قافیہ سے گہری واقفیت نہیں رکھتے زبان کے بارے میں بھی کچھ ایسے ہی تھے اس وجہ سے ان کا کلام مستند نہیں سمجھا جاتا تھا مگر طرز پسندیدہ تھا۔

ان کے شاگرد بھی ایسے ہی تھے جو عروض و قافیہ سے ربط نہیں رکھتے تھے سوائے نواب سید محمد خان رند کے اور اس زمانہ میں شاعری کے لئے عروض و قافیہ میں مہارت ضروری سمجھی جاتی تھی اس وجہ سے پڑھے لکھے لوگوں نے ناسخ کے سلسلہ کو اختیار کیا جس میں کا ہر ایک عروض و قافیہ معانی بیان اور تحقیق زبان میں مسلم تھا۔

آتش زبان اور حسن بیان میں ناسخ سے متاثر تھے مگر اپنا رنگ الگ بھی رکھتے تھے۔ اس دور کے شعراء آتش سے بھی متاثر تھے اس وجہ سے لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا دور ناسخ و آتش کے رنگ کا گہرا امتزاج ہے۔

یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اسیر کی وجہ سے مصحفی کا سلسلہ قائم رہا مگر یہ صحیح نہیں اول تو خود مصحفی ناسخ سے متاثر تھے دوسرے اسیر نے گو ذاتی مصحفی سے فیض حاصل کیا اس لئے مصحفی کا سلسلہ بھی ناسخ ہی کا سلسلہ سمجھنا چاہیے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ مصحفی کا خود کوئی رنگ نہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری کہیں کی بھی ہو ناسخ سے متاثر ہے اور اب تک انھیں کی تقلید پاکیزگی کلام کی ضمانت ہے۔

سیّد مرزا تعشق

تعارف:- سیّد محمد مرزا اُنس شاگرد ناسخ کے بیٹے میر عشق کے چھوٹے بھائی اور شاگرد سنہ ۱۲۲۹ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۳۰۹ھ میں انتقال ہوا۔

شعلۂ حسن سے تھا دودِ دل اپنا اوّل — آگ دنیا میں نہ آئی تھی کہ سوزاں ہم تھے

برق رہ رہ کے چمکتی ہے تو میں کہتا ہوں — ہو غنیمت اگر اتنا بھی مرا دل ٹھہرے

دلِ حزیں پہ خدا جانے کیا بلا آئی — عجیب درد سے روتا ہے کوئے دلبر میں
وہ چشمِ مست ہے ایسی خمار آلودہ — بھری ہو جیسے لبالب شراب ساغر میں

دوستو میں نگہِ ناز کے روزن دل میں — ورنہ برچھی سے ہیں زخمی نہ کسی تیر سے ہم

وہ تڑپنا دیکھتا ہے کس طرح بسمل ہو سر — رشتۂ نظارہ قاتل رگِ جاں ہو گیا

خوشا دلِ منعکس ہے جس میں صورت عرش اکبر کی — مرے گھر سے فضا معلوم ہوتی ہے ترے گھر کی

پڑھا جو نزع میں قرآں ذمی نہ جسم میں روح — زباں بند ہوئی سن کے گفتگو تیری
عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا — کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری
یہ اتفاق کبھی دنیا میں کم سنا ہوگا — ہمارے ساتھ ہوئی دفن آرزو تیری
مری لحد کو نہیں احتیاج چادرِ گل — دماغِ جاں میں ابھی تک بسی ہے بو تیری
بہ کس نے وعدہ کیا ہے تعشق آنے کا — ہر ایک وقت جو آنکھیں ہیں چار سو تیری

عشق کی وہ شورشیں وہ ولولے جاتا رہا — اک جوانی کیا گئی سب حوصلہ جاتا رہا
خاک ہو کر بھی پروانہ ہوئے ہم سے ایک — عشقِ کامل کے سبب سے فاصلہ جاتا رہا

حال تغیر کیا زلف کے سودائی کا — اب خدا منہ نہ دکھائے شبِ تنہائی کا
ہوں تو حرفِ غلط تقدیر نہیں مٹنے کا — آپ کے سر پہ ارادہ ہے جبیں سائی کا
دلِ پُرداغ کا کیا حال کہیں ہم تم سے — پھول دیکھا ہے کہیں لالۂ صحرائی کا
دل جو مرجائے ہمارا تو کرے کون آہیں — سو گیا جاگنے والا شبِ تنہائی کا

خموشی ہو گئی طوقِ گلو آج — کسی کی یاد آئی گفتگو آج
سرِ محفل بھر آئے ہوتے آنسو — گئی ہوتی ہماری آبرو آج
ہوا ترکِ محبت پر نہ راضی — رہی تا دیر دل سے گفتگو آج

یہ میرے نالوں سے تھی تنگ ہجرِ یار میں روح — کہ بعدِ مرگ نہ آئی مرے مزار میں روح
ہم اس چمن میں وہ بلبل ہیں جب سے ہوا الفت — وداع تن سے ہوئی فصلِ بہار میں روح
قدم قدم پہ جنازہ نہ کیوں ٹھہر جائے — کہ میرے جسم سے نکلی ہے انتظار میں روح
ہے احتضار مجھے دوستو تڑپنے دو — اسی طرح سے نکلتی ہے انتظار میں روح
نہ ترک ہوتی ہے الفت تری نہ مرتا ہوں — نہ اختیار میں دل ہے نہ اختیار میں روح
حیات کا ہے تعشق بھلا بھروسہ کیا — ہوا حباب میں ہے یا ہے جسمِ زار میں روح

ہر طرف شور ہے جھنکار ہے زنجیروں کی — ان کی زلفوں کے گرفتار چلے آتے ہیں
پڑ گئی کیا نگۂ مست تری اے ساقی — لڑکھڑاتے ہوئے میخوار چلے آتے ہیں

کبھی نہ ہوش میں ہم اے خیالِ یار آئے — کسی کے در پہ گئے جب اسے پکار آئے
ہماری خاک پڑی ہے تمہارے کوچہ میں — ذرا نسیم سے کہدو نہ بار بار آئے
ہمارے بعد یہ ہے حال ہمسفروں کا — اس آشیاں میں صدا دی اسے پکار آئے

میں باغ میں ہوں طالبِ دیدار کسی کا — گل پر ہے نظر دھیان ہے رخسار کسی کا

گر پڑے آنسو عروجِ ماہِ کامل دیکھ کر — میری نظروں میں ترا عہدِ جوانی پھر گیا

دل ہے مردہ خلد میں جانے سے کیا ہو جائیگا — ہم جہاں ہوں گے وہ گھر ماتم سرا ہو جائیگا

تجربہ ہے جراحتِ دلِ نازک مزاج کا — موقوف ہے حضور کے تارِ نگاہ پر

تلاشِ شبِ وصل میں پھر رہا ہوں — مرا آپ دیوانہ پن دیکھئے جی

یاد تم دل سے کبھی جاتی نہیں — اب تو بھولے سے ہنسی آتی نہیں
کچھ خبر ملتی نہیں دل کی مجھے — آج نالوں کی صدا آتی نہیں

نہیں تسکین ہوتی ایک جا پر کوئے جاناں میں سحر سے شام تک ہم سو جگہ بستر لگاتے ہیں
عجب اندھیر کر رکھا ہے آج ان کی نگاہوں نے جو کل کہتے تھے سرمہ آنکھ میں کیونکر لگاتے ہیں
جراحتوں کو ملے ہیں وہ مرے اعضا جو بے حس ہیں دل بیتاب کا دیکھوں یہ کیونکر لگاتے ہیں

یہ باغ کیا جہاں میں راحت کہیں نہیں دل مضطرب ہے اس کا ٹھکانا کہیں نہیں
میں زاہدوں کے سامنے ہوں تارک الصلوٰۃ کس سے کہوں کہ لائق سجدہ جبیں نہیں
مشق تصور دل صد بارہ دیکھیے اتنے حسیں ایک جگہ پر کہیں نہیں

بھرے ہیں آنکھوں میں آنسو دامن بھیگی ہو یہ کس غریب کی تربت کے پاس بیٹھی ہو

طوق منت کے گلے میں تھے وہ دن یاد کرو تم پر اس عہد میں بھی چاک گریباں ہم تھے

سنہ جو فرقت میں زرد رہتا ہے کچھ کلیجے میں درد رہتا ہے

نجد سے جانب لیلیٰ جو ہوا آتی ہے دل مجنوں کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
ہم کو مل جاتی ہے اپنے دل وحشی کی خبر ٹوٹتا ہے کوئی ٹانکا تو صدا آتی ہے

یاد آیا میکہ تھا زور و نہ جذب حسن و عشق وہ میرے دل کا تڑپنا بے قراری آپ کی

لیجیے روح بھی تڑپنے لگی دل تو مدت سے اضطراب میں ہے

بیٹھے بیٹھے اپنے دل کی غیر حالت ہو گئی دوستو جلدی خبر لینا قیامت ہو گئی
اب اگر تخفیف ہوتی ہے تو گھبراتا ہوں میں درد دل اتنے دنوں سے ہے کہ عادت ہو گئی

کرتے کرتے آہیں روتے روتے آخر مر گیا آج مجھ کو آپ کے کاموں سے فرصت ہو گئی

پوچھتے کیا ہو شب فرقت کی بیداری کا حال آنکھ کیونکر بند ہوتی ہے یہ حسرت لے گئے

جب اسیران گزشتہ کی حکایت یاد کی رات بھر بیٹھا رہا نیند اڑ گئی صیاد کی
باغ سے حسن گزشتہ کا بہیروں سے ذکر یا الٰہی بند ہو جائے زباں صیاد کی
دیر تک روئی خوشی حسرت سے مجھ کو دیکھ کر جب بنا ڈالی گئی میرے دل ناشاد کی
وحشیوں میں آمد فصل بہاری کی ہے دھوم بیڑیاں آواز دیتی ہیں مبارکباد کی

دم نکلنا کوئے جاناں سے نکلنا یاد ہے ہم یہ دو باتیں نہ بھولے عالم ایجاد کی

ہم خون آرزو کا جو محضر بنائیں گے تجھ کو گواہ اے دل مضطر بنائیں گے
غلغل ان کے پاؤں کی زرگر بنائیں گے طوق گلو سے فتنۂ محشر بنائیں گے
افتادہ رہنے دی تھی زمیں دل کی اسلئے امید تھی کہ آپ یہاں گھر بنائیں گے
بنتی ہے روز زلف مشوش کے سامنے دیوانہ آپ اس کو مقرر بنائیں گے

کیسی ہے دشت نوردی کی وجہ کیا کہیے شکایت دل خانہ خراب ہوتی ہے
نہ گھر میں اور نہ آتا ہے دل گلی میں قرار عجیب مشکل دم اضطراب ہوتی ہے
ایسی دلدوز حسینوں کی پلک ہوتی ہے سانس لینے سے کلیجے میں کھٹک ہوتی ہے
ہے یہ نزدیک قدم رنجہ کرے فصل بہار سر آمادۂ سودا میں دھمک ہوتی ہے

بجھے لیتے ہیں داغ دل تربت میں جانے کیلئے روشنی کم ہو رہی ہے نیند آنے کیلئے

گیا شباب مگر رہ گیا تعلق عشق دل و جگر میں چمک گاہ گاہ ہوتی ہے

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری
یہ اتفاق بھی دنیا میں کم سنا ہوگا ہمارے ساتھ ہوئی دفن آرزو تیری
طبیعت سے یہ کہتا ہے جنوں کی فصل آپہنچی کئی دن سے رگ جاں میں کھٹک ہوتی ہے نشتر کی

بے وفائی آپ کی غفلت شعاری آپ کی میرے دل نے عادتیں سیکھیں ہیں ساری آپ کی

یاد رخ دیدۂ پر آب میں ہے بوئے گل جامۂ حباب میں ہے
پاؤں آہستہ سے رکھ اے غافل دیکھ تو کون کون خواب میں ہے
ہاں اترتا ہے داغ سے سیماب تھر تھری جسم آفتاب میں ہے

جب جھلا کیا باغباں نے مجھے ذبح تو کیا اب رو رہا ہے منہ کو قفس پر دھرے دھرے
سمجھا دل وحشی جو قیامت ہوئی برپا اٹھا کوئی دیوانہ رفتار کسی کا
دیکھ آؤ کہ بیمار تمہارا تو نہیں ہے رکھا ہے جنازہ پس دیوار کسی کا

حکیم ضامن علی جلال

تعارف :۔ سنہ ۱۲۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں انتقال ہوا آبائی پیشہ طبابت اور داستان گوئی تھا شاعری میں نام پیدا کیا۔ رشک و برق کے شاگرد تھے۔ انداز بیان کی ندرت میں ان کا جواب نہیں۔ ساری عمر تحقیق زبان میں صرف کی۔

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا ملا وہ غمکدہ جس کو چراغ بھی نہ ملا

ہم اور جاتے نہ پیر مغاں کی صحبت میں بہت اچھالنے والے تھے اک قبا نہ تھا
کسی نے دیئے تسلی نہیں قیامت کی کہ آج ہے جو تڑپ کل یہ اضطراب نہ تھا

تغافل سے بگڑے سن کر جو بالیں ہم نے کیا آہ کھینچ میرے شرمندہ کرنے کو ذرا بے باک ہونا تھا
تڑپ دل کی دکھانا تھا جلال ان شوخ چشموں کو وہیں کی بخت نے سستی جہاں چالاک ہونا تھا

کوئی ان سے کہے قصہ شب تنہائی کا ! شمع خاموش کو یارا نہیں گویائی کا

تمہارا یہ ہم خدا سے کریں بھی تو کیا کریں ! مارے ہوئے تغافلِ جور بتاں کے ہیں

آنسو کے تو کیا نہیں چھپنے کا رازِ عشق حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے

عشقِ بتاں کا جرم نہ بخشا خدا نے بھی ! ان کا گنہگار گنہگار ہی رہا

اہلِ دل کے لئے راحت نہیں اس سے بڑھ کر جس کو سمجھا ہے وہ بے درد دکھاتا دل

میری قبر کے فرشتے یہ نہ پوچھیں کیونکر ہو چکے کہ جواب ہی نہ سنتے جو بجا سوال ہوتا

نجات مل گئی ناصح سے عمر بھر کے لئے ! اسی کو بھیجد یا یار کی خبر کے لئے

لٹک کے زلفیں جو آپڑی ہیں کسی کی لچک رہی ہے کمر بلا کی آئی ہیں دو گھٹائیں غضب کی بجلی چمک رہی ہے

مجھے ہے کے جان اتنی بخدا خوشی نہ ہوتی مرنے کرنے کا ذرا بھی جو تمہیں ملال ہوتا
دل کسی کے عشق میں اچھا ہوا جاتا رہا داغ تھا اک مٹ گیا اک درد تھا جاتا رہا
دل ہمارا اور ہیں ہو جائے ہم سے منحرف آج اتنی کج ادائی کا گلا جاتا رہا

دل ہو وہ چشم مست ہو دورِ شراب ہو کوئی خراب ہو تو بلا سے خراب ہو
تم تسلی میں نہ کرنا اپنی جانب سے کمی گو تڑپ اس سے مرے دل کو سوا ہونے لگے
بند ہو کر جلوۂ نگاہِ یار میں آنکھیں کھلیں ہوش جاتے ہی حواس اپنے بجا ہونے لگے

اکیلے کا کہیں دو سرکشوں سے زور چلتا ہے دوپٹہ لاکھ سینہ پر سنبھالو کب سنبھلتا ہے
ہم بھی قدر اپنی وفا کی نہیں کھونے والے اور جفا کر کے پشیماں بھی نہ ہونے والے

دے چکا ساتھ ہمارا شب تنہائی میں بے مروت ہے یہ دل میں کا ہمدرد چلا گیا ہے
بن سنور لیں گے تو دیکھیں گے وہ انداز اپنا توڑ کے آئینہ حیراں ابھی بکھا گیا ہے
یاد ہے اتنا وہ اٹھ کر کہیں روٹھ جانا اور وہ پوچھنا گھبرا کے کسی کا کیا ہے

جھک کے شرمائی نگاہیں کبھی اٹھیں تو سہی آپ کو کیا جو زمانہ تہ و بالا ہوتا

غیروں کے سامنے ہنستے نہ گئے رونے پر تم نے گرتی ہوئی بجلی کو سنبھالا ہوتا

یاس نے ساری امید دل کو مٹایا دل کی ورنہ اس گھر میں بہت کچھ سرو ساماں ہوتا
بیٹھے دو نہ دیں ذرا آنکھ ملاؤ تو سہی یوں جفا کر کے نہیں کوئی پشیماں ہوتا

دیتا جو تسلی وہ ہمیں اور تڑپتے اس شوخ کو بیتاب بھی کرنا نہیں آتا

شب فراق تڑپ کر ہمیں تو گذری تھی سنا ہے تم نے بھی آرام رات بھر نہ کیا

کلیجہ کوئی تھام کر رہ گیا ہے ادھر جانے والے ادھر دیکھ لینا
گذرتی ہے شب دل تیرے منتظر کی ادھر دیکھ لینا ادھر دیکھ لینا

کبھی اس نے جو کہا ہے مرنے والے ہو گیا اور بھی جینا ہمیں دوبھر اپنا

آنکھ ملتے ہی یہاں قابو نہ جس دل پر رہا آپ کے بس میں نہیں معلوم وہ کیونکر رہے

کہتی ہے تڑپ ضبطِ فغاں ہو نہیں سکتا اب دردِ نہاں مجھ سے نہاں ہو نہیں سکتا
بت بنگئے کیوں عشق میں ہم ان کے نہ پوچھو اس چپ کا سبب ہم سے بیاں ہو نہیں سکتا

بتوں کے عشق میں انجام کار کیا ہوگا دل کے مرے پروردگار کیا ہوگا

تنہا شبِ غم عاشقِ کامل نہیں ہوتا — تم دل کی جگہ ہوتے ہو جب دل نہیں ہوتا
دیکھتے دیکھتے وہ میں تڑپتا تھا — قابلِ دید یہ تماشا تھا
سن کے نام اس کا دل کو تھام لیا — نامہ بر سچ بتا کہ یہ کیا تھا
کیا دکھے دل کو پھر دکھاؤ گے — تم نے کس دن مزاج پوچھا تھا
وہ آبدیدہ جو سنکر مرا افسانہ ہوا — مجھے بھی اشک بہانے کا اک بہانہ ہوا
دلِ ناکام کو ہم کھو کے بہت پچھتائے — کام اس سے بھی نکل جاتے تھے بیکار نہ تھا
عشق میں دل جو مرا ہمدم و ہمراز بھی تھا — وہی کم بخت تو رسوا کنِ غماز بھی تھا
یوں مری رات تری منتظری میں گزری — چشم بر راہ بھی تھا گوش بر آواز بھی تھا
اگر عشق میں سب ان کی ہشیاری کی باتیں تھیں — مگر قسمت میں تھا دیوانہ ہی مشہور ہو جانا
وفا مانع ہے ذکر اس کی جفا کا ہو نہیں سکتا — شکایت کا محل ہے اور شکوہ ہو نہیں سکتا
قضا کہتی ہے زندہ کشتہ اس کا ہو نہیں سکتا — ادا کہتی ہے کیا قاتل مسیحا ہو نہیں سکتا
جانے کیا بے اختیاری ہے جلال — دل مرے بس میں نہ قابو یار پر
کیا لطف دے رہا ہے بگڑنا عتاب میں — لاکھوں بناؤ ہیں ترے اک پیچ و تاب میں
کیوں آ کے دے گئے وہ تسلی ستم کیا — اب تو بہت کمی تھی مرے اضطراب میں
جفا کر کے وہ کیوں پچھتا رہے ہیں — وفاداری سے خود شرما رہے ہیں
غضب کا سامنا ہے حشر میں بھی — نقاب اٹھتی نہیں شرما رہے ہیں
خدا سمجھے جلال ان ناصحوں سے — نہیں معلوم کیا سمجھا رہے ہیں!
مجنوں سے عقل نہ شعور وہ اب کو بکے ہیں — ڈنکے بجے ہوئے مرے دیوانہ پن کے ہیں
چلا ہوں لے کے میں فریاد انکی وہ مری — اب اس میں دیکھئے پہلے سنے خدا کس کی
نظر فریب اداؤں پہ آہی جاتا ہے — ہزار روکئے سنتا ہے دل بھلا کس کی
تڑپ میں ہے جو مزہ وہ سکونِ دل میں کہاں — ہم اپنے درد کی خود ہی دوا نہیں کرتے

اثر کچھ ان کے دل میں کر گئی آہ و فغاں میری — کہ خود وہ چھیڑ کر سنتے ہیں مجھ سے داستاں میری
زاہد تو ہے دیوانہ حوروں کا وہ کیا جانے — عالم کو ترا سودا اے رشکِ پری کیوں ہے
منہ سے کچھ حشر میں بھی کہہ نہ سکوں — بت بنا دے خدا اگر کوئی
اس صنم کو جو ہم خدا سمجھے — لوگ کیا جانے ہم کو کیا سمجھے
کسی بے درد کی دل آزاری! — درد کی اپنے ہم دوا سمجھے
کٹ گئی پاؤں کی بیڑی جو پہن لی زنجیر — ہوشیاری کوئی سیکھے ترے دیوانے سے
شغل ہیں اپنے یہ صبح و شام کے — چند آہیں کھینچنا دل تھام کے
اٹھ کے اس محفل سے اٹھتا ہے وہ درد — بیٹھ جاتا ہوں کلیجہ تھام کے
اپنی بگڑی سی ہوئی تقدیر کے ہم شاکی ہیں — کبھی بگڑتے ہیں کیا شکوہ تمہارا کس لئے
مذہبِ عشق ازل سے نہیں آیا ہے پسند — وہ کوئی اور نہیں حضرتِ انساں ہونگے
دم بھرے جائیں گے اس سفاک کا — جانے اس میں یا ہمارا دم رہے
کچھ نہ زیادہ ہو چلا شوقِ وصال — زندگی کے دن بہت اب کم رہے
سجدہ کوئی قبول ہمارا ہو یا نہ ہو — لیکن جبیں ہو اپنی ترا آستانہ ہو
ابھار دیتی ہے اس کی جفا کو مری دعا — غرض کہ نوبتِ ترکِ جفا نہیں آتی
بتوں کو دیکھ ہماری نگاہ سے اے شیخ — نظر ان آنکھوں کو شانِ خدا نہیں آتی
جلوہ کسی کا دیکھ کے آنکھیں سی کھل گئیں — پردے جو غفلتوں کے پڑے تھے الٹ گئے
چٹکیاں دل میں مرے لیتے ہو چپکے چپکے — اور پھر دل میں شکایت مری فریاد کی ہے
چھپا لاکھ رازِ عشق افشا ہو ہی جاتا ہے — اگر چپ بھی رہے عاشق تو رسوا ہو ہی جاتا ہے
نہ ہو برہم جو بوسہ بے اجازت لے لیا ہم نے — چلو جانے دو بیتابی میں ایسا ہو ہی جاتا ہے
رہے گی رحمتِ حق دور زاہد تم سے — گناہ ہے یہ تمہارا کہ بے گناہ رہے
خدا سے کہتے ہیں بت بھی کہ رحم کر اس پر — نہ ہوگا عاشقوں میں ہم سا کوئی مضطر بھی

کہیں سمجھے ہیں دیوانے یہ ہر عاقل سمجھتا ہے
محبت میں کسے سمجھایئے کب دل سمجھتا ہے

جو سمجھاتا ہے ناصح کب ہمارا دل سمجھتا ہے
نہ یہ ناداں سمجھتا ہے نہ وہ جاہل سمجھتا ہے

سنگِ در اس کا ہے پیشانی میری
اب نہ سر پھوڑوں تو نادانی مری

پھرتی ہے ہر دم میری نظروں میں وہ جبیں
پھر کوئی دیکھے پریشانی مری

بعد ترکِ عشق کے کیسی پشیمانی ہوئی
عقل کا کہنا کیا ہم سے یہ نادانی ہوئی

توفیق انھیں رنج ہی دینے کی خدا دے
خوش جو ہیں ہوں وہ ہم کو گوارا ہے خوشی

اک مسیحا سے جو الفت ہو گئی!
بے اجل مرنے کی عادت ہو گئی

اٹکھیلیوں کے ساتھ ہے ستانا ادا بھی
سنبھالا کیئے دیتی ہے دل لغزشِ پا بھی

آفت ہے کسی کی نگہ ہوش ربا بھی
یوں ہوش اڑ گئے ہیں کہ نہیں جن کا پتا بھی

جلاد! کہتی ہے ہشیار رہنا
نقاب اٹھتی ہے سامنا ہے کسی کا

اٹھ گئیں تھیں کہیں اس شوخ کی نیچی نظریں
دیر تک ہم نے دو عالم تہ و بالا دیکھا

ہم نہ کہتے تھے کہ تم اس کو نہ دینا تسکین
درد دل نے تپش دل کو اچھالا دیکھا

دل کو کب تک دردِ دل تڑپائے گا
صبر ہی انجام کار آ جائے گا

ہوشِ رفتہ دیکھیے جب آئے گا
تیرے بے خود کو کدھر لے جائے گا

سمجھے تھے کہ فرقت میں مر جائیں گے ہم جلدی
اس میں تو قیامت کی تاخیر نظر آئی

حسرت جو مری دیکھی حیران سے ہیں وہ بھی
تصویر کے پہلو میں تصویر نظر آئی

وہ ترچھی نگاہوں سے محفل میں ادھر دیکھیں
سیدھی ہیں کچھ اپنی تقدیر نظر آئی

گذرتی ہے محبت میں جو ہم پر
وہ حالت دوسرا کیا جانے کیا ہے

تم لگا دو آگے ٹھوکر ناز سے
کون اٹھے حشر کی آواز سے

خود پکار اٹھا جو دل میں راز ہے
تو بھی خاموشی بڑی غماز ہے

مہرباں کو دیجیے دل نامہرباں دیکھا کیے
جو دکھایا تو نے ہم اے آسماں دیکھا کیے

اللہ رے عاشق کی زخود رفتگی شوق
یوں ہے تری محفل میں کہ محفل میں نہیں ہے

نجم الدین علی عرف علی میاں کامل

تعارف:۔ مولانا احمد علی صاحب مجتہد کے بیٹے ـــــ ولادت معلوم نہیں غدر میں جوان تھے سنہ ۱۹۰۶ء میں انتقال ہوا۔ مشرقی علوم میں صاحب استعداد ممتاز تھا سید محمد تقی صاحب کے شاگرد۔ شاعری میں ہر صنف پر قادر تھے ان کے کمال کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا انھوں نے امیر مینائی۔ جلال ماہر اور منیر سے غزلوں میں مقابلہ کیا اور مرثیہ میں میر نفیس کے مدِ مقابل ہے اور برابر کی ٹکر لی۔ اپنا کلام خود کبھی نہیں پڑھا لوگوں کو کہہ کے دیدیا۔

دولت کے معاملہ میں بھی یہی حال تھا لاکھوں ملے اور دو دن میں لٹا کر خالی ہاتھ ہو گئے۔ ان کی پہلی شادی حکیم باقر حسین کی صاحبزادی سے ہوئی جو شاہی اطباء میں تھے اور دولت کے لحاظ سے لاکھوں کے پیٹے میں تھے ایک ہی لڑکی تھی جو ان کی وارث ہوئی محبوب گنج میں ایک شاندار حویلی اور باغ تھا سب کامل صاحب کی داد و دہش کی نذر ہو گیا اور فاقوں کی نوبت آگئی تو نواب سردار بہادر اور نواب نادر صاحب نے تنخواہ مقرر کر دی جو آخر دم تک بسر اوقات کا ذریعہ رہی ان کے بے شمار شاگرد لکھنؤ میں تھے بابر کے شاگردوں میں میر مصحف حسین رئیس مصطفےٰ آباد ضلع پرتاب گڈھ اور رستم علیخاں رئیس دھولپور۔ (جوش صاحب کے نانا) تھے۔

مولانا صفی کو ان کی سوتیلی بہن بیاہی تھیں جو ان کے والد کی تیسری بیوی سے تھیں اب ان کا کلام سنئے۔ ؎

نہاں ہونے پہ تیرا نور ہر شے سے نمایاں ہے
جو تو اے شاہد معنی عیاں ہوتا تو کیا ہوتا

یہ کرشمے نہ تھے ہر وقت کا یہ ناز نہ تھا
آپ کی آنکھوں کا آگے تو یہ انداز نہ تھا

جا کے دیکھ آئے مرقع میں شبیہِ یوسف
ہم جس انداز کے خواہاں تھے وہ انداز نہ تھا

ہم نے مانا کہ قیامت کی تڑپ رکھتی تھی
آپ کے جلوہ جاناں کا انداز نہ تھا

جا کے دیکھا تو عجب امن کا گوشہ تھا مزار
غم نہ تھا عیش نہ تھا سوز نہ تھا ساز نہ تھا

شرم کے پردے میں اب کرنے لگیں کام اپنا
آگے ان نیچی نگاہوں کا یہ انداز نہ تھا

میں نہ مانوں گا کہیں میرے جلانے کو رقیب
برق کے جلوہ میں اس شوخ کا انداز نہ تھا

جان پر اب تو بنی جاتی ہے کچھ اے کامل
آگے افسردگی دل کا یہ انداز نہ تھا

صنعت عشوۂ جاناں نہ کبھی تھا ناز بھی تھا
سحر بھی آنکھ میں اس شوخ کی اعجاز بھی تھا

ایک خنجر ہی نہیں قتل کا میرے مجرم
ذبح کرنے میں شریک آپ کا انداز بھی تھا

قید سے ہو کے رہا مرغ چمن کیا کرتا
دل کے ہمراہ شکستہ پر پرواز بھی تھا

یکساں ہے ہم شکستہ دلوں کو حیات و موت
شادی نہ زیست کی ہے نہ غم انتقال کا

پوشیدہ راز ہائے جوانی نہ رہ سکے
پیری نے حال کھول دیا بال بال کا !!

کہنے میں آپ آ گئے لوگوں کے اے کلیم
کوئی محل نہ تھا ارنی کے سوال کا

اب رہائی کی تمنا نہ کر اے مرغ قفس
سوئے گلشن تو اگر بے بال و پر آیا تو کیا

ناوک مژگاں سلامت اس ستمگر کا رہے
زخم اے کامل ہمارے دل کا بھر آیا تو کیا

نیند میں ان کی مژہ کھلتی کبھی ہوتی تھی بند
مرتعش کے ہاتھ میں جام شراب ناز تھا

بام پر کل جو یکایک وہ پری زاد آیا
شیخ تو شیخ برہمن کو خدا یاد آیا

گل و بلبل کے مقدر پہ ہنسی آتی ہے
باغباں جانے نہ پایا تھا کہ صیاد آیا

کام سیکھا بھی تو وہ جس سے کلیجہ ہو لہو
دل کو آیا بھی تو کیا شیوۂ فریاد آیا

دیکھ کر گلشن فردوس میں حوروں کا جمال
یاد اسے دوست ترا حسن خداداد آیا

اب مجھے ضبط فغاں کی نہیں قوت باقی
کیوں قفس لے کے مرا باغ میں صیاد آیا

حسین کا عشق کہ سودائے زلف یار نہ تھا
ازل میں کیا دل غمدیدہ داغدار نہ تھا

جگر کو خون کیا تھا سحر کے دھڑکوں نے
شب وصال میں بھی قلب کو قرار نہ تھا

فغاں کو ضبط کیا پر تھمے نہ ہجر میں اشک
کہ دل پہ زور تھا آنکھوں پہ اختیار نہ تھا

مآل آمد فصل بہار کیا ہوگا
کسے خبر ہے کہ انجام کار کیا ہوگا

شب فراق میں ہے شام ہی سے نزع کا حال
سحر جو ہوگی تو پروردگار کیا ہوگا

خوش ہوں بے ساقی کہ ہم رندانِ آشام کیا
مے نہ ہو تو شیشہ کیا سبو کیا جام کیا

جب ہوا میں تلاطم درد کا ہونے لگے
کوئی یہ بارش نہیں اس کے لئے ہنگام

عیش و عشرت اہل دولت کو مبارک روز و شب
ہم سیہ بختوں کی اے کامل سحر کیا شام کیا

ابتدائے عشق ہے اس پر نہیں دل کو قرار
دیکھئے ہوتا ہے اس آغاز کا انجام کیا

بادشاہوں کو مبارک تخت و فر اور سلطنت
مرد مفلس ہوں مجھے طبل و علم سے کام کیا

کیوں دعا ہوتی نہیں یا رب ہماری مستجاب
عرش سے بھی مرتفع ہے ان کا بام کیا

بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے
غربت میں جب دیار وطن یاد آ گیا

نفس امارہ نے کیا سخت اذیت دی ہے
ساتھ ہے سایہ کے مانند یہ رہزن کیسا

فنا ہو روح تو آزاد ہوں عناصر بھی
ورق ہیں قید میں شیرازہ کتاب کے ساتھ

تجھے منعم نہیں معلوم رتبہ خاکساری کا
یہ وہ مٹی ہے جو روشن گر آئینہ دل ہے

ہمارا ہوش میں آنا نہ آنا ایک ہے کامل
کہ ہم ہیں دل کے بس میں اور وہ دیوانہ فن ہے

حکم سجدہ کا ہوا اس کو خدائے پاک کا
اور آگے کیا کہوں کیا ہے یہ پتلا خاک کا

سمجھ میں زردی رخسار سے آ جاتا ہے
بیان غم نہیں محتاج ترجمانوں کا

اے دل بتوں کے تیر نظر سے خدا بچائے
چھوٹا کمال سے اور کلیجہ کے پار تھا

مہوس نسخہ اکسیر کا یہ جزو اعظم ہے
غبار راہ پیدا کر جہاں میں اہل ہمت کا

کتاب ہستی دل میں کہیں تو یاد آتا ہے
دیا تھا ایک نقطہ ہم نے صحرائے قیامت کا

اپنا ہی اگر حسن دل آرا نہیں دیکھا
اس شوخ نے قدرت کا تماشا نہیں دیکھا

دل پاک کدورت سے کسی کا نہیں دیکھا
اس آئینہ کو ہم نے مصفیٰ نہیں دیکھا

عبث کے سوا کوئی تماشا نہیں دیکھا
کچھ ہم نے گنبد مینا نہیں دیکھا
کھلتا نہیں کس کرب میں ہے آج دل زار
یوں سینہ میں سکوتہ دیا لا نہیں دیکھا

دیا تھا جو لطف و مرحمت سے اب آج تک آزار ہی آگہی
خدا میں بندہ میں اے فرشتو حساب کیا کتاب کیا
کبھی وہ آئے تھے ایک شب کو فقط جدائی کا آج تک ہے
لگی نہ پھر آنکھ زندگی میں ہم نے دیکھا تھا خواب کیسا

غور کر دل کی حقیقت میں خدا مل جائیگا
دیکھ آئینہ کو جوہر کا پتہ مل جائے گا

پیری میں بھی رہے گی جلن داغ عشق کی
دن کو بھی یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

چشم مردم میں کھٹکنے کے سوا صورت خار
فائدہ کوئی مجھے نشو و نما سے نہ ہوا

خدا کسی کی محبت کا داغ دل کو نہ دے
یہ زخم وہ ہے کہ جو مندمل نہیں ہوتا

نمود حسن میں اے جان اگر نشہ ہے ابھی تم کو
جھکا کر آنکھ دیکھو آئینہ چاک گریباں کا

سرکشی پھر تو فرشتوں سے بھی انساں کرتا
سجدہ اس خاک کے پتلے کو جو شیطاں کرتا

یار کے حسن سے آنکھوں نے کیا سیر نہیں
کام اس مائدہ پر سے لب و دنداں نکلا
ہوش میں آئی جو موسیٰ تو یہ پوچھے کوئی
اب تو اللہ کے دیدار کا ارماں نکلا!

مٹ گئے بات سے تمہاری قسم
شکر ہے نقش بند! مکاں کا
عاشقوں کے دلوں کا نام نہ لو
ذکر کیا خانہ ہائے ویراں کا

غم دوست ہے اس قید سے آزاد نہ ہوگا
ہم خوش بھی کریں دل کو تو یہ شاد نہ ہوگا

کفر و اسلام کے یارب ہیں یہ جھگڑے کیسے
ایک ہی رشتہ اگر سبحہ و زنار میں ہے

شام ہی سے نہ گلا گھونٹ مرا اے شب ہجر
صبح تک دیکھ تو جینے دے کہ ہوتا کیا ہے

قفس کی قید سے آزادی مرغ!
نہ ہو جب قوت پرواز کیسی
نہیں سرمہ کا چشم یار میں خط
کمند ناز ہے دست نظر میں

چشم رحمت سے نظر کر ذرہ خاک پر
ہمت عالی سے پیدا کر دماغ آفتاب

امکاں سے تھک کے آخر کو پھرے گا شام تک
طائر اندیشہ پہنچے گا نہ اس کے بام تک

پاؤں پر میں نے جو شوق ذبح میں رکھ دیا
مسکرا کر ہاتھ سے قاتل نے خنجر رکھ دیا
یاد پینے میں جو آئی نرگس مخمور یار
ہاتھ سے میں نے گلگوں کا ساغر رکھ دیا

کم نہیں طاعت میں کہ ذرہ قمر سے دیکھنا
کون گزرا تھا ابھی اس رہگزر سے دیکھنا

قصہ فراق یار کا دوستو ایک رات میں
تم نے سنا تو کیا سنا میں نے کہا تو کیا کیا

محتاج نشو و نما کب ہیں جوانی میں خوشحال
دل خود بخود بہار میں کھنچتے ہیں سوئے گل
بلبل کی طرح کاہے کو ہوتا میں نالہ کش
دیتا اگر خدا دل بے آرزوئے گل!

داغ الفت سے جلے جاتے ہیں میرے استخواں
دل کے پہلو میں اپنی کس نے اخگر رکھ دیا

بتر نہ تنگئی دل آ کے جو دیکھی یاس
چاک سے زخم تمنا کے پریشاں نکلا

فغاں کو ضبط کیا پر تھمے نہ تھمے اشک
کہ دل پہ زور تھا آنکھوں پہ اختیار نہ تھا

رات کچھ ایسی ادا سے وہ پریزاد آیا
دیکھنے والوں کو محفل میں خدا یاد آیا

خاموش نہ کیوں ذکر جوانی میں ہیں ہم
آنکھوں نے ہماری یہ تماشا نہیں دیکھا

بخت خفتہ کا ٹھکانا کوئے جاناں میں تھا
خواب غفلت کا مزہ چشم نگہباں میں نہ تھا

تھے سب ہی دنیا میں مشتاق عروس بہشت
اس کے سر سہرا رہا جو ہجر سلطاں میں نہ تھا

ہو گئے محجوب تم کو دیکھ کر خوبان دہر
کون سا سر تھا جو آغوش گریباں میں نہ تھا

ہر گھڑی کے رنج سے اک بار تو ملتی نجات
زہر ہی میرے لئے تلخی دوراں میں نہ تھا

راہ و رسم خانۂ زنجیر کس سے پوچھتے
کوئی اگلے وقت کا دیوانہ زنداں میں نہ تھا

بحر غم میں طالب راحت کی مٹی تھی خراب
ننگ کشتی تھا جو تختہ عین طوفاں میں نہ تھا

کہئے کس پتھر سے جا کر کعبہ میں سر پھوڑتے
ایک بت بھی قبلۂ ارباب ایماں میں نہ تھا

کعبہ کے سامنے دل خانہ خراب تھا
یہ بھی بڑا حضور قلق کا جواب تھا

کھولی جو چشم دل تو بدن نقش آب تھا
جب تک کہ آنکھ بند رہی یں حباب تھا

دنیا کو دیں سے جس نے نکالا کھڑے کھڑے
بادش بخیر وہ دل خانہ خراب تھا

لو پوش نور دنار تھے اگلے شباب میں
بادل میں چاند زیر زمیں آفتاب تھا

جب خاک میں شباب ملا ہوش آ گئے
ہم چونک اٹھے تو زیر زمیں آفتاب تھا

افسانہ شباب غدارانہ پوچھئے !
دیکھا ہے جاگتے ہیں جسے یہ وہ خواب تھا

کیا کہتے مفلسی کی جوانی میں دعوتیں
مہماں اپنے گھر میں ہمارا شباب تھا

بل تھا بھو دن میں سامنے جاتا میں سطح
تلوار کھینچے ہیرے پہ اور دل عتاب تھا

کم اپنے کے بھی حصہ میں تھا فیض عام دو
شبنم کے قطرہ قطرہ میں اک آفتاب تھا

اس انجمن میں کوئی دل شادماں نہ تھا
کتنی اجڑے گھر کی رات سواد بیابانہ تھا

جنس شباب کا یہ کبھی قدرداں نہ تھا
گردوں کی ساعی پشت میرا کبھی جواں نہ تھا

تعظیم بیخودی کی بدولت نہ دے سکا
صاحب معاف کیجئے بندہ یہاں نہ تھا

جن رزوں نے تک نہ پہنچی تھی انگیا حضور!
واقف جناب موز سے اب زباں نہ تھا

پہ کہتے ہرزہ دل پہ ٹھہرے آنکھوں کے کھیل
جب تک تمہیں تمہیں نے انکا بیاں نہ تھا

منشی اسمٰعیل حسین منیر

تعارف :- منشی احمد حسین شاد کے بیٹے شکوہ آباد کے بسنے والے سنہ ١٢٦٢ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ابتدائے عمر میں لکھنؤ چلے آئے وہیں نشو ونما پائی اور اسی پر ان کو ناز تھا وہ خود کہتے ہیں ؎

سنبھالا ہوش جا کر لکھنؤ میں
ہوا گجیں ریاض گفتگو میں

لکھنؤ سے اپنے انس کی یہ کیفیت بیان کرتے ہیں ؎

لکھنؤ کا مجھ کو سودا ہے منیر
دل حسین آباد کا پروانہ ہے !

اس شگفتگی کی وجہ بھی انہوں بتائی ہے۔

مادام لکھنؤ رہے آباد اے منیر
مجمع ہے اس دیار میں اہل کمال کا

یہ شگفتگی اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے شاعرانہ کمال تک پہنچنے میں لکھنؤ کو بڑا دخل ہے ؎

منیر اس شہر میں اوج کمال نظم تک پہنچا
الٰہی لکھنؤ بھی عرش ہے مضمون عالی کا

منیر اگر باہر ہوتے تھے جب بھی لکھنؤ کا ذکر کرتے رہتے تھے اور اس سے ان کی طبیعت میں جولانی آجاتی تھی ؎

آگئی پھر شعر گوئی پر طبیعت اے منیر
لکھنؤ کا ذکر رخش فکر کا کوڑا ہوا

شاعری میں رشک کے شاگرد تھے ٥ رمضان سنہ ١٢٩٧ھ کو ہیضہ میں انتقال ہوا مادہ تاریخ "منیر عالی قدر ہے"

سلہ اس زمانہ میں حسین آباد سے رومی دروازے آصف الدولہ کی مسجد کی پشت گول دروازے زنگی محل چوک اور پاٹا نالہ تک شہر کا سب سے زیادہ بارونق حصہ تھا۔

میکدہ میں جو ہیں غمدیدہ مضطر آیا   چشم ساغر ہوئی تر دیدۂ دل بھر آیا
نیند کو راہ و میری آنکھوں کی معلوم نہ تھی   اے خدا خواب اجل ہجر میں کیوں کر آیا
شش جہت میں تری رحمت الٰہی سے ہو   کونسی راہ ہے گردش میں مقدر آیا
سا تھا گریۂ بے ساختہ کی کیا تقصیر   چشم نمناک ابل آئی جو دل بھر آیا
سنکے شہرہ تری رفتار کا آگے نہ بڑھا   جب دبے پاؤں کہیں فتنۂ محشر آیا

آجاتی قیامت کبھی تو فریاد نہ کرتے   نا محرموں کے آگے ترا نام نہ لیتے
کرتی جو مہ مصر کی تعریف زلیخا   تصویر دکھا دیتے ترا نام نہ لیتے

کب سے دل بکھرے ہوئے پھرتے ہیں شائق لہت   پردۂ ساز میں پوشیدہ صدا کس کی ہے
خود بخود دامن دلدار کدھر کھینچتا ہے   ہاتھ پھیلائے ہوئے آج دعا کس کی ہے

یہی انصاف ہے اے فصل بہاری تیرا   جال میں مرغ چمن باغ میں صیاد رہے
بادشاہ ہوں نہیں ہوں محبوب ہے درویش نہیں   یا الٰہی تری دنیا ہمیں کیا یاد رہے
کوئی دے حشر میں کس طرح حساب دنیا   ہم سوئے کے خواب کی روئیداد کیسے یاد رہے

پنہاں نہیں ہے کوئی جگہ تجھ سے اے صنم   رو پوش ہو کے بندہ جاہے کدھر ہو
حیرت سے سر نگوں ہیں اشاروں کی انگلیاں   تم شش جہت میں چھپے الٰہی کدھر ہو

نام اس شوخ کا سن کر یہ ملک کہتے ہیں   یہ تو شر دیکھئے کیونکر گل آدم میں ہے

بال بکھرائے ہوئے آتے ہو کیوں مقتل میں   اٹھ کے بے دین نہ بلائیں کہیں مرنے والے

اسے گنہگار کاتب اعمال اور برہم   افسانہ بڑھ گیا ہے بہت میرے حال کا

بگڑی ہوئی ہے ساتھ حسینوں کی بناوٹ   اللہ رے عالم ترے بے ساختہ پن کا

آئینہ میں عکس کا بھی اب پتہ ملتا نہیں   آشنا کیسا کہ تصویر آشنا ملتا نہیں
آئینہ کو پاس پری کا عکس اڑ کر گیا   جب سے وہ دل میں ہے دل کا پتا ملتا نہیں
کیا جانئے کیا لطف ہے ظلمت اور ہر آج   جاتی ہے آنکھ پھر کے نہیں آنکھ سے نقش پا

دنیا سے ہے باہر دل دیوانہ کسی کا   بستی میں سماتا نہیں ویرانہ کسی کا
ناحق دل نافہم ہے دیوانہ کسی کا   ہم سے بھی تھا یونہی یارانہ کسی کا
ساقی نگہ مست تری لوٹتی ہے دل   کیوں چور نہ ہو نشہ میں پیمانہ کسی کا

پڑ گیا جیسے تری شوخیوں کا پرچھاواں   کبھی چلا نہیں بیٹھا دل بیتاب اپنا
نشۂ جوش جوانی ہیں بدمست حسین   غیر کی آنکھوں میں ہم دیکھتے ہیں خواب اپنا

جو مری خرابیاں رہیں غربت میں اپنے ساتھ   پھر کس طرح خراب ہمارا دفن ہوا !

جس دل میں تیرے وصل کا ارماں رہ گیا   حسرت کا دین پاس کا ارمان رہ گیا
ہمصورتی کے رشک سے دیکھا نہ آئینہ   ان کو کبھی اپنی دید کا ارمان رہ گیا
پوچھا گیا یہ حشر میں تصویر جان کر   اچھا رہا جو عشق میں حیران رہ گیا
ابروئے یار دیکھ کے اب بھولتا ہی حال   ہائے لائے طاق آج سے نسیان رہ گیا

طائر جاز ہو سوئے گلشن ایجاد آیا   پیشوائی کے لئے دوڑ کے صیاد آیا
شاخ گل صحبت مرغان چمن فصل بہار   ہائے کس وقت مری تاک میں صیاد آیا

بتوں کے قدر آستاں پر عشق ہے ناصح   یہ بیچارہ سیدھا مسلمان نکلا !!

دلفریبی کی ادائیں ابھی آجاتی ہیں   سامنا چاہیئے پر چشم تماشائی کا

تھا وہ کعبہ ہی جو قبضہ میں بتوں کے آیا   پاؤں رکھے تو دل دوست میں دشمن تیرا

قبر شہید چھوڑ کے سر میں جو گندھا   وہ پھول چشم عشق میں رنگ چمن ہوا

کعبہ تک یا رب پہنچ سکتا نہیں تیرا گدا   ان بتوں نے طاق نسیاں پر رکھ دیا
شوق ایماں سے دل دنیا طلب کو کیا غرض   کیوں نجس شیشہ میں بھر کر آب کوثر رکھ دیا
جب کہا میں نے نقاب الٹو خدا کے واسطے   آئینہ اس شوخ نے مجھ کو دکھا کر رکھ دیا
ناز کا دعوی مسلم پر یہ سوچو تو سہی   حسن نے خراج دو عالم کس اوپر رکھ دیا
رہتے دنے عذاب غم انکھوں لے شور حشر   یادگار ایک یہ ہے عالم تنہائی کا

لکھنؤ کی شاعری کا تیسرا رنگ

محمد جعفر اوحد

ناسخ کے بعد غزل میں اصلاحی تحریک محمد جعفر صاحب اوحد نے پیش کی وہ معشوق مجازی اس کے حسن ظاہری اور سامان آرائش کا ذکر نہیں کرتے تھے محبوب کو حالت اطلاق میں رکھتے تھے اس کا مرد یا عورت ہونا ظاہر نہیں ہوتا تھا لفظ یار کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ شراب کباب کا ذکر زاہد و ناصح پر پھبتیاں حضرت خضر کی عمر یوسف کے حسن موسیٰ کے طلب دید کا مذاق اڑانا یا اس کی تحقیر کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے [1]

یہ تحریک ان کی زندگی تک تو باقی رہی ان کے کچھ شاگردوں نے بھی ان کی تقلید کی مگر ان کے بعد مر گئی اور اس کو مرنا بھی چاہیے تھا اس سے غزل کی ساری دلکشی ختم ہو جاتی۔

---

[1] مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں غزل کے لئے یہی اصلاحیں تجویز کی ہیں مگر کہیں اوحد صاحب کا ذکر نہیں کیا جو کھلا ہوا سرقہ ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ یہ توارد ہے سرقہ نہیں ہے مگر یہ صحیح نہیں مولانا حالی جس زمانہ کے آدمی ہیں اس زمانہ میں دہلی اور لکھنؤ کو زبان کا مرکز سمجھا جاتا تھا عام طور پر لوگ لکھنؤ کی اصلاحیں جاننے کے خواہشمند رہتے تھے اسی ضرورت سے خورشید صاحب نے افادات لکھی تھی جس میں اس کا ذکر بھی ہے سنہ ۱۸۹۰ء میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی خورشید صاحب لکھنؤ کے مسلم اساتذہ میں تھے دور دور ان کی شہرت تھی شاد اور بلگرامی وغیرہ ان کے شاگرد تھے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ مولانا حالی ان سے بے خبر ہوں خاص طور پر ان کی کتاب سے جس کا موضوع فن شاعری اور لکھنؤ کے اس وقت کی زبان و شاعری میں اصلاحیں ہیں۔

اوحد صاحب مولانا سید محمد باقر شریف الملک منصف الدولہ (متوفی سنہ ۱۲۵۸ھ) کے بیٹے اور سلطان العلماء سید محمد مجتہد العصر (متوفی سنہ ۱۲۸۴ھ) کے پوتے سنہ ۱۲۴۵ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۲۹۳ھ میں انتقال ہوا محلہ معالی خاں میں مکان اور امام باڑہ تھا وہیں سکونت تھی۔

غدر کے بعد انگریزوں نے سلطان العلماء کی دو ہزار روپیہ ماہوار پولیٹیکل پنشن پشت در پشت کے لئے مقرر کی تھی مگر ان کی اولادیں بہت تھیں اور اکثر ان کے ساتھ مر گئی تھیں بہت سے پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں محجوب تھیں ان کے لئے گورنمنٹ نے حین حیاتی پنشن مقرر کی تھی اوحد صاحب بھی انہیں میں سے تھے ان کو سو روپیہ ماہوار حین حیاتی پنشن ملتی تھی وہی ذریعہ معاش تھا۔

تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ دبلے پتلے متوسط قد کے آدمی تھے چوگوشیہ ٹوپی اور انگرکھا پہنتے تھے جو اس زمانے کے شرفاء کی وضع تھی۔

اولاد میں صرف ایک بیٹے محمد کاظم عرف بندو کاظم جاوید (اپنے زمانہ کے مشہور شاعر) تھے دو مرثیے اور ایک دیوان یادگار چھوڑا مرثیے عام طور پر لکھنؤ میں سنتے تھے دیوان جاوید صاحب کے پاس تھا ان کے بعد ان کے بعد سجاد حسین صاحب تمنا کے ہاتھ لگا وہ اسے چھپائے رکھنا اور کسی کو نہ دکھانے میں اس کی حفاظت سمجھتے تھے بڑی مشکل سے چند غزلیں مجھے دی تھیں یہ ان کی بڑی عنایت میرے حال پر تھی اب ان کے انتقال کے بعد اس کا کیا حشر ہوا نہیں معلوم۔

اوحد صاحب کی اہمیت کا جب مجھے علم ہوا تو ان کے حالات معلوم کرنے کی فکر ہوئی مگر کوئی بتانے والا نہ ملا۔

خمخانہ جاوید اور آب بقا میں ان کا ذکر ہے مگر کوئی کارآمد بات نہیں۔
شاد عظیم آبادی نے ذکر شعراء میں ان کی نفاست و پاکیزگی ذوق

نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ میر انیس کے ایک بند میں تار بار قافیہ اور پہ دوڑے ردیف نظم ہوگئی جس مجلس میں انھوں نے وہ مرثیہ پڑھا اس میں امیر صاحب بھی شریک تھے جب انھوں نے وہ بند پڑھا جس کے دو مصرعے ہیں ؎

اس طرح برق ابر گہر بار پہ دوڑے   جس طرح سے بجلی کی صدا تار پہ دوڑے

امیر صاحب نے کہا واہ کیا ردیف ہے تعریف نہیں ہوسکتی برسوں اس کے چرچے رہے۔

مشہور ہے کہ انھوں نے بجلی کی صدا اور اس کے تار پر دوڑنے کو بھی غلط کہا تھا۔

میر انیس نے ردیف کے بھونڈے پن پر تو خاموشی اختیار کرلی مگر بجلی کی آواز اور اس کا تار پر دوڑنا کسی اور مجلس میں ثابت کیا۔

افادات مصنفہ مولانا سید محمد مصطفےٰ صاحب خورشید (متوفی سنہ ۱۳۱۸ھ) سے معلوم ہوا کہ علم قیافہ میں بڑی مہارت بہم پہنچائی تھی نہایت شگفتہ مزاج تھے بچوں میں بچے اور بڈھوں میں بوڑھے جس محفل میں بیٹھ جاتے تھے اپنی شگفتہ بیانی سے لوگوں کو متوجہ کرلیتے تھے لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے پرانے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ سالم کے موجد وہی تھے۔

شاعری میں نواب عاشور علی خاں تلمیذ ناسخ کے شاگرد تھے جو نواب صاحب سعادت علی خاں کے پوتے صاحب علم اور مقدس آدمی تھے اپنے دور کے مسلم اساتذہ میں شمار تھا بڑے بڑے نامی شاعر شاگرد تھے جان صاحب ریختی گو اور چرکین مزاحیہ گو بھی شاگرد تھے اور ہر ایک کو اس کے رنگ میں اصلاح دیتے تھے مگر خود صرف نعت و منقبت کہتے تھے ان کا سارا کلام مفقود ہوگیا صرف ایک منقبت تذکرہ خوش معرکہ زیبا کے

قلمی نسخہ میں ملی ہے جس سے ان کی استادی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اب امیر صاحب مرحوم کا کلام ملاحظہ فرمایئے ؎

کیا ہے لن ترانی نے قوی دعویٰ الصیرت کا   وہی بینا ہے جو قائل ہوا ہے نفی رویت کا
جو آتا ہے تصوّر وسعت دامان رحمت کا   نسیم لطف پردہ کھول دیتی ہے عدالت کا
بڑھے تھے جو حجاب قدس رحمت سے لپٹ کر کچھ   نہ ان پر بھی کھلا پردہ تری کہنہ حقیقت کا

کچھ رفتگان ملک عدم کا نشاں ملا   ذروں سے خاک کے جو کوئی استخواں ملا
پہنے قلم اسی کو کیا باغباں نے   جس شاخ پر چمن میں ہمیں آشیاں ملا

امن انسان شماتت سے کہاں لکھتے ہیں   دھر میں آتے ہی نام اہل جہاں لکھتے ہیں
ساتھ آہوں کے جو آنسو بھی ٹپک جائیں گے   شعلے اور آہوں کے پانی سے بھڑک جائیں گے
پختہ کاروں کے مضامین نہ رہیں گے محفوظ   وہ ثمر نخل سے ٹوٹیں گے جو پک جائیں گے
عہد پیری میں بھی سرگشتہ ہوس رکھے گی   سر کو ہوگی حرکت پاؤں جو تھک جائیں گے
بار عصیاں سے ہمیں چار میں سبکی ہوگی   جو اٹھائیں گے جنازہ کو وہ تھک جائیں گے

روشنی داغ دل بزم دل مضطر میں ہے   یا چراغ طور کا جلوہ خدا کے گھر میں ہے
ملتا نہیں پتہ در و دیوار و سقف کا   تصویر لامکاں کی ہمارے مکاں میں ہے

با چشم راہ رو ملک عدم رہتے ہیں   دوش احباب پہ چلنے میں قدم رہتے ہیں
منتظر ہم سفروں کے ہیں پھندے جانے سے   اشک اس واسطے رخسار پہ تھم رہتے ہیں

شاکی ہے عبث رزق جو گردوں نہیں دیتا   کوئی کچھ تقدیر سے افزوں نہیں دیتا
جھک کے ملنے کو ترقی میں نہ چھوڑ   دیکھ اس رفعت پہ گردوں خم رہا

سودا ازل سے عشق حقیقی کا سر میں ہے   جس جا نظر کا کام نہیں وہ نظر میں ہے
امراض سے ہوئی نجات اپنی ہے محال   داخل دوا کی فکر بھی جب درد سر میں ہے
رکتا نہیں ہے توسن عمر رواں کبھی   گھر میں بھی بیٹھنا مرا داخل سفر میں ہے

نالے درد ہو تعریف کے قابل میرا　　ناوک آہ میں کھینچ لے اگر دل میرا
ہر قدم اٹھتی ہے تعظیم کو جب چلتا ہوں　　پاس کرتی ہے یہ گرد رہ منزل میرا
جو مقدر کا ہے دیدے مجھے بے منت غیر　　حصۂ غیر میں حصہ نہ ہو شامل میرا
بیٹھتا اٹھتا میری طرح رواں ہے یہ بھی　　ساتھ دیتا ہے غبار رہ منزل میرا
سانس چلتی نہیں یہ عمر رواں جاتی ہے　　ہے ہر اک تار نفس جادہ منزل میرا
وہ موحد ہوں کہ شرکت سے ہے نفرت مجھے　　رنگ ہوگا نہ کسی رنگ میں شامل میرا
عیش دنیا کے مزے ساتھ جوانی کے گئے　　اب تو امید نہ وہ میں ہوں نہ وہ دل میرا

فلک دوش صبا پر رہا غبار میرا　　ہوا نہ خاک کبھی تو آسماں پہ بار رہا
گدا جہاں کے نہ کیوں ہیچ شاہ کہلائے　　بنا نہ فقر کی دولت پہ افتخار رہا
ہوا بندھی جو ہماری سیاہ کاری کی　　کبھی چراغ نہ روشن سر مزار رہا
نظر گئی سوئے صانع ہر ایک صنعت سے　　ہزار پردوں میں نور اس کا آشکار رہا
جب آیا سامنے محشر میں نامۂ اعمال　　امید تم سے کرم کا امیدوار رہا

چشم نے آنسو کا عقدہ وا کیا　　تھا جو اک قطرہ اسے دریا کیا
آنکھ دی تو نے تو نظارہ کیا　　تیری آنکھوں سے تجھے دیکھا کیا
اہل مسند خاک میں آخر ملے　　دولت دنیا پہ کیوں تکیہ کیا
خامشی سے بڑھ گئی مشق سخن　　چپکے رہنے نے مجھے گویا کیا
غم کے مہمان کی رسائی دیکھئے　　دل میں آکر غم نے گھر پیدا کیا
ظالموں سے خلق کو پہنچا نہ فیض　　خون ابر تیغ سے برسا کیا
نام سید صابر سے میری اٹھا　　انقلاب دہر نے یہ کیا کیا

ابھی عصا میں نہیں اتنے بار کے قابل　　عصائے آہ ہے اس جسم زار کے قابل
گھٹا دیئے مرے دعوے قمر نے گھٹ گھٹ کے　　کمال بھی نہ رہا اعتبار کے قابل

ہیں فنا اثر ضعف مرے کام آیا　　زمیں رہی نہ لحد کی فشار کے قابل
میں فنا دل احباب صاف ہیں مجھ سے　　میں خاک ہو کے نہیں ہوں غبار کے قابل

ہنر سے ہاتھ کے ہم رزق پا نہیں سکتے　　نوشتہ جبیں سے خط اپنا مٹا نہیں سکتے
مکان امید نہ کیوں گر ہو خاکسار دو کا　　زمیں سے نقش قدم کو اٹھا نہیں سکتے

یہ نعمتوں کی حلاوت نے بند کر دیئے لب　　زباں پہ شکر کے کلمے بھی آ نہیں سکتے
روا ہو دل شکنی کیا ہمارے مذہب میں　　خدا کے گھر کو مسلماں ڈھا نہیں سکتے
وہ دوست خاک ہماری لحد پہ بیٹھ گئے　　جو فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا نہیں سکتے
کھنچیں چلو نہ چلو دوستو یا ہم سے امید　　گئے جو ملک عدم کو وہ آ نہیں سکتے

شوق یہ سیر عدم کا کم نہیں　　وہ چلے جاتے ہیں جن میں دم نہیں
ہر گل خنداں گریباں چاک ہے　　واہ رونے سے یہ ہنسنا کم نہیں
توڑتے دیکھا ہے لاکھوں ہی کو دم　　کچھ نفس کا تار مستحکم نہیں
فکر فانی کس لئے تم سے ہے امید　　پاؤں پھیلانے کو تربت کم نہیں

گوارا اپنا نقصان ہو تو رنج غیر نہ ہے　　بیاباں میں زخم نے گھٹ کر یہ [illegible]
سحر کو کھول [illegible] شبنم شب [illegible]　　[illegible] تصویر ہے ہر رنگ عالم کا

دور سے دیکھنے والے جب سمجھے غبار　　شاہانہ وہ سر گور غریباں نکلا

شاگردانِ اسیر

مہدی حسین آہر

تعارف :۔ خاندان اجتہاد کے رکن رکین شہر کے بڑے رؤساء میں تھے بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے عربی گھوڑوں سے اصطبل بھرا تھا چار گھوڑوں کی گاڑی پر نکلتے تھے مشاعرے اور مجلسیں بڑی دھوم سے کرتے تھے ان کے تکلفات مشہور رہے سنہ ولادت معلوم نہیں ۱۳۴۰ھ میں انتقال ہوا شاعری میں امیر کے شاگرد تھے خلاق معانی کہے جاتے تھے۔ مولوی علی میاں کامل کا دعویٰ ہے کہ ؎

سرزمینِ ہند میں ابتک نہیں پیدا ہوا — آپ کا ایسا بلیغ نکتہ داں نازک خیال

پیارے صاحب رشید کا قول مشہور ہے کہ ان کے ایسے شعر کوئی کہہ نہیں سکتا۔

مرزا محمد ہادی صاحب عزیز نے لکھا ہے کہ ان کا مرتبہ انیس سے کم نہیں ان کا خاص رنگ یہ ہے ؎

رگوں سے سر میں مے نشہ شراب آیا — طنابیں کھنچ گئیں گردوں پہ آفتاب آیا

مگر میں تسبیح کا ہوں دانہ جو اس کو کھونا تو اس کو پانا
ہزار پھیرتا رہے زمانہ فراق دیکھا نہ ہمنشیں کا

آوارگی کے لطف کو سوزن سے پوچھیے — لاکھوں بنائے گھر مگر اک میں مکیں نہیں

زباں سے کام کم لے گر بقائے دم کا خواہاں ہے — کہ عمر رشتہ گھٹتی جاتی ہے رفتار سوزن میں

حیرت مجھے روانی عمر بشر میں ہے — لنگر پڑا ہوا ہے سفینہ سفر میں ہے

کریں کس وقت کار دین و دنیا اہل عالم — نہیں ملتی ہے فرصت سانس لینے سے کوئی دم کی

تاثیر ضعف عالم پیری میں دیکھنا — سایہ بھی بے عصا نہ چلا ہم جہاں چلے

اس طرح کے اشعار کے علاوہ ایسے شعر بھی بہت ہیں جیسے آجکل پسند کیے جاتے ہیں ؎

تو ہی اے شوق بتا ہے کوئی منزل ایسی — داخلہ لیلیٰ کا بانگ درا سے نہ ہو

خاک آگاہ شکستِ دلِ نازک سے وہ ہوں — آشنا ٹوٹے شیشہ کی صدا سے نہ ہوا

کیوں نہ تڑپائیں مجھے سوزِ الم میں آہیں — کون شعلہ ہے جو بیتاب ہوا سے نہ ہوا

ہوں وہ بے خود ہنسیں گر شیشہ کو ٹکتے دیکھا — جان کر اپنا دلِ نازک میں نالاں ہو گیا

تھی یہ صورت تو اثر کا میں گلہ کیا کرتا — ہاتھ مطلب سے اٹھاتا تو دعا کیا کرتا

وہیں ہم زباں عجب ہو رہا ہے کچھ بیاں میرا — چمن میں جس طرف اجڑا پڑا ہے آشیاں میرا

نہ دیکھیں دیکھنے والے ہی اے نرے جلوہ — کھلے یہ حسن کہ آخر حجاب ہو جائے

ملتے ہیں ہاتھ ملے سے کاغذ کو وہ یوں — چھپ رہا جاتا نہیں تصویر سے

سن ترانی سے کھلا ناز کا بھی راز مجھے — پردہ ہوتا تو سناتے نہ وہ افسانہ مجھے

مرض موت ہوا دہر میں آغاز مجھے — میں تو کہتا تھا ہوا یاں کی ہے ناساز مجھے

تن خاک ہے تو زیست کا کیا اعتبار ہے — جو عضو ہے غبار کا نقش و نگار ہے

رحمت سے دور ہوں تو کروں ترک معصیت — یوں بھی تو مشکل اے مرے پروردگار ہے

رحمت کے اعتماد پہ ماہر کیے گناہ — اب عفو وہ کرے نہ کرے اختیار ہے

اللہ ری شرم آئی جو تصویر بھی مری — آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دیے فرطِ حجاب میں

کشتہ ہوئی ہے کوئی تو ایسی بھی آرزو — آنسو تڑپتے آتے ہیں چشمِ پر آب میں

شاخیں بلائیں لیتی ہیں جھک جھک کے بار بار — عالم ہے کس کی نیند کا سبزے کے خواب میں

راضی ہوں دیکھ میرا تڑپنا جحیم میں — رحمت جو تیری دیکھ سکے اضطراب میں

رحمت کو اضطراب ہے نالہ میں اہلِ حشر — یوں سر کو خم کیے میں کھڑا ہوں حجاب میں

لاکھ کوئی بجلی کی ادائیں ہیں گواہ — نشہ آنکھوں میں جوانی کا ہے مخمور نہیں

کوئی ہے لیں مگر آگ لگانے والا — آپ سے آپ چلے تیغ یہ دستور نہیں

جس سے دن وصل کا بنجائے مری ہجر کی شب — سحر وہ نرگسِ جادو کو بھی منظور نہیں

حشر میں ہوتا ہے جو کچھ وہ بجا ہوتا ہے
آپ آجائیں تو پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
غیر ممکن ہے کہ یوں جائے مرا سوزِ الم
شمع کو شعلہ فنا کر کے فنا ہوتا ہے

رضا کی ہو جو منافی وہ التجا نہ کرے
طلب سے ہاتھ اٹھائے مگر دعا نہ کرے
صدا جو سنتا ہے منہ پھیر کر وہ دیتا ہے
کسی سے جا کے اسیرِ قفس کہا نہ کرے

بچپن کی ہے جو چال ادا پر نظر نہیں
کس کی خبر انہیں ہو جب اپنی خبر نہیں
پھیلائے پاؤں سوتے ہیں تکیہ پہ سر نہیں
کیا کر رہی ہے کس کی نظر کچھ خبر نہیں
کچھ حال دل چھپائے تو ہیں اپنے زعم میں
ترچھی نگہ جو کہتی ہے اس کی خبر نہیں

قیامت جیسے آنے میں نظر آتی ہے دیر ان کو
زمیں سے چلنے میں کھینچتا ہوا دامن اٹھاتے ہیں

خیالِ خاطرِ نازک تھا عفو ہو تقصیر
جگر کو تھامے اب عرضِ حال کرتے ہیں

بند بھی باندھے سے کس اہلِ نشست ہم [illegible]
ہوا کیا گر پڑی زنجیر رشتہ پائے سودے میں
ہوا کے دم اتنا بھی اگر ہے تو غنیمت ہے
مرے بلبلے مرے پر آرے جاتے ہیں نشیمن میں
یہی تو ہیں ادائیں قتل کرتی ہیں جو محفل کو
کہ خود بیٹھے ہیں اور تصویر پوشیدہ ہے دامن میں
نظر میں کیوں نہ ان کی نشہ آتا انکی آنکھوں کا
کہ مستوں کے ہاتھ سے بھی گر جاتی ہے [illegible]

داغِ دل وقتِ جوانی جلوہ گر کیونکر نہ ہو
ضو فشاں ہنگامِ شب نورِ قمر کیونکر نہ ہو

کہاں وہ حال کہاں خفتگانِ خاک کے دل
خدا کسی کو تمہاری طرح جوان نہ کرے

زیست کے دن کر کے پورے نکلی ہے تن سے روح
جس کو بھرنے لے کیا خالی ہیں وہ پیمانہ ہوں

ہیں جو محتاط وہ کہتے نہیں حال تم رو کے بھی خار
ڈر یہ رہتا ہے کہ وہ بھی تو زبان رکھتے ہیں

فصلِ بہار آئی ہے صیاد رحم کر
قیدی کوئی قفس میں ہمارے سوا نہیں

جان ڈالے قالبِ بے جان میں گر قدرت تری
رنگ دوڑے خون بنکر پیکرِ تصویر میں

داغِ دل میں کیوں مرے ضیا دیتے ہیں
نیند کے وقت تو شمعوں کو بجھا دیتے ہیں
ہچکیاں نزع میں آتی ہیں تصور ہے ترا
تو نے بھلایا نہ سہی ہم تو صدا دیتے ہیں

اللہ خیمہ لیمو دل کی شتاب میں
تاریک شب ہے اور کوئی پاسباں نہیں

جاگے تھے رات بھر وہ اسی اضطراب میں
وہ دیکھتا نہ ہو مری صورت کو خواب میں
قاصد کے انتظار میں آخر ہوا یہ تنگ
لکھنے لگا میں آپ خط اپنے جواب میں
مجبور کس گناہ سے یارب ہوا ہوں میں
رحمت کو دیکھتا ہوں تری اضطراب میں
رکھے رہیں نہ ہاتھ وہ سینے پہ کس طرح
عادت ہے بیمار کی کسی [illegible] خواب میں
بے خوف ابھی میں چلا ہوں سوئے جحیم
رحمت نہ تیری دیکھ سکے گی عذاب میں
پوچھی جو میں نے ان سے سختی راہِ عشق
پاؤں کے خار رکھ دیے سر نکال کے
اک عاشقوں کی بات تھی اسکو بھی کہو
موسیٰ ملے جواب ارنی کے سوال کے

بخشش دو دل سے اگر آہ رسا آتی ہے
ٹوٹتا ہے کوئی شیشہ تو صدا آتی ہے
گوشۂ دل سے مری آواز کو سنتے ہیں ملک
تیر پردے میں کسی کی تو صدا آتی ہے
مجھ سے کہتا نہیں لے قافلہ اشک روان
دل دھڑکتا ہے کہ آوازِ درا آتی ہے
کان آواز کے وحدت سے بھرے رہتے ہیں
کوئی بولے مجھے تیری ہی صدا آتی ہے
پردۂ دید میں کیا کام نکالا موسیٰ
اب تو کانوں میں وہ مطلب بھرا آتا ہے

جلوہ گر ہو کے نکلا ہوں جو چھپ جاتا ہے
کچھ سحر میں نظر آتی ہے شرارت تیری
حشر میں آتے ہیں اس شان سے تیرے مجرم
قہر آگئے ہیں لپیٹے ہے رحمت تیری
عکس آئینہ میں جس طرح نظر آتا ہے
یوں مرے دل میں نظر آتی ہے صورت تیری

گر نہ کیجیے قدر ہو گا تو قدر دانی آپ کی
ہر ادا ہے ناز پروردہ جوانی آپ کی
دو ہی چیزیں ہیں نہیں جن کا زمانے میں نظیر
موسمِ گل باغ کا فصلِ جوانی آپ کی
کونسا انصاف ہے آئینہ رکھنا ہاتھ سے
آپکی صورت نہ دیکھے نوجوانی آپ کی
کان میں مردہ کے بھی جانے لگی آوازِ پا
رو کے کہتا ہوں گذرتی ہے جوانی آپ کی

سبب یہ تھا کہ جو مستوں میں انقلاب آیا
جدھر وہ آنکھ پھری ساغرِ شراب آیا

خدا کی شان کہ شرم آ ہی گئی عکس آئینہ سے
وہ اجنبی ہوئے خود سے بھی جب شباب آیا

بہر طریق ہوا عاشقوں ہی کا مطلب
وہ سو گئے ہیں مجھ کو اگر نہ خواب آیا

دھمک نے پاؤں کی تربت میں یہ کہا مجھ سے
خبر تجھے نہیں یاں عالم شباب آیا

جہاں میں ہم سے زیادہ حسین ہے شاید
پسینہ آ گیا تم کو بھی جب حجاب آیا

جب سے آئی ہے جوانی یہی دیکھا ہم نے
جاگ کر رات کٹی صبح کو آرام کیا

شوق کی نظروں نے کام اپنا جو کرنا تھا کیا
بے خبر کیوں ان سے اتنا ان کا انداز تھا

رہ گیا تھا کیا یونہی خالی پھڑک کر قید میں
تیلیوں کی جا قفس میں کم پر پرواز تھا

حسن کی نیرنگیاں دیکھیں مگر سمجھے نہ یہ
شعبدہ تھا سحر تھا جادو تھا یا اعجاز تھا

زخم اپنے دل کے بھی تو دیکھ لے ناوک فگن
میں بھی اپنی [illegible] کی نظروں سے تیر انداز تھا

میں تو کروں نہ درد دل اپنا کبھی بیان
ہر آہ کو مگر طولِ سخن میں ہے

روح کو تن میں نہ کیوں ہو والہ ہوا ہر
شمع ہر بزم میں جلنے کے لیے آتی ہے

پیری میں بھی چمک گئے داغ جگر میں ہے
جیسے الٹا پھول کہ شب کی طرح ضو قمر میں ہے

روح اپنے جسم میں کیوں محو ہے بعد شباب
شمع کو دیکھا تو شب بھر کیلئے محفل میں ہے

فلک سمجھا نہ کچھ برہم جو ہم میں صحبت غم کی
اداسی ہی تو رونق تھی ہماری بزم ماتم کی

کون بڑھ سکتا قیامت تھا قد دلجوئے دوست
دیر تک آ کے آخر رک گئے گیسوئے دوست

آ گئے جذب دلی اثر آئی شبیہ لینے دوست
میری نظروں سے جو آئینہ نے دیکھا سوئے دوست

ہوتی زباں مگر تو ہمیں کہتا دم ازل
دل تو آ نہ لوں گا لے میرے پردہ نگار دل

بے خودی سا بھی کوئی دہر میں ہمساز نہیں
غم نہیں عشق نہیں سوز نہیں ساز نہیں

گمزدگی شبنم یہ کہتی ہے کہ جاگے ہو گئے
سوئے ہوا نوں کی تو آنکھوں [illegible]

ہے یہی تازہ اسیری میں مجھے گھبراتا جو مرا
یا قفس آج نہیں یا پر پرواز نہیں

مدعی جان سے کوئی یہ کہہ دے آخر
قضا سے کام وہ لے جو ترکا ادا نہ کرسکے

ہم تو واقف بھی نہ تھے حشر سے اس سرو قد کی قسم
آپ آئے تو یہ سمجھے کہ قیامت آئی!

کمسنی کے مرنے کو سوائے دل ما بر نہ سنا
اک یہی تھی خبر ایسی جو سنائی نہ گئی

تجلی میں دکھایا اپنا پرتو یار جانی نے
کیا کچھ اور سنایا کچھ صدائے لن ترانی نے

قبا اسکی پسینہ آ گیا گرمی سے اف اف کہ
لگایا جب گلے اچھی طرح ان کو جوانی نے

رو ا سینہ سے سر کی خبر تجھ بھی سونے میں
انھیں بیہوشیوں سے سر اٹھایا تھا جوانی نے

وہ ہوا جو روشنی شمع پردہ فانوس
تو کیوں نہ حسن کلیجے کے پار ہو جائے

دیوانے بیخودی میں پہنتے ہیں بیڑیاں
غل ہو رہے ہیں آمد فصل بہار کے

صیاد قید زیست سے کبھی میں تو چھوٹ گیا
اب کیا تو دیکھتا ہے قفس کو اتار کے

مجرم بھرے محشر تو مرسل یہ بول اٹھے
ہم بھی گناہگار ہیں پروردگار کے

کیا یونہی مر گئے سمجھتے جوانان عشق باز
دم توڑنے کے خاک پہ برسوں نشاں رہے

یہ حد کبھی ہوئے پھڑکنے کی بوستاں کیلئے
قفس کی تیلیاں لایا ہوں آشیاں کیلئے

اسی کو ہوش میں دیکھا اجڑتے آنکھوں سے
یہاں میں تنکے چنے تھے جس آشیاں کیلئے

اسی سے کھل گیا حال قفس مرا سارا!
پیروں میں تیلیاں اٹکی تھیں جو نشاں کیلئے

نگاہ شوخ موسیٰ نے تو کب دیکھا تھا
فروغ حسن گر پردہ نہ رکھے لن ترانی

خدا بخشے بہت سمجھا دل کا اپنے خاتمہ سمجھے
لہو سا کچھ نظر آیا جو نامہ بر کو آنکھوں میں

میں جو آیا تو زمانہ میں بلا بھی آئی
بزم میں شمع کے آتے ہی ہوا بھی آئی

اب ٹوٹے بازوؤں کی بھی تدبیر کیا کریں
توڑا قفس کے در کو تو سر مار مار کے

شمع وحدت کا میں بزم دہر میں پروانہ ہوں
ہے جنوں میں خرد جس کا میں وہ دیوانہ ہوں

روح باعث ہے سیہ کاری کا میری ہر
شمع جس گھر میں ہے اندھیر میں وہ خانہ ہوں

جو آئینہ سے وہ نرا عکس نما نہیں
یکتا تو وہ ہے جس کا کوئی دوسرا نہیں

فصل بہار آئی ہے صیاد رحم کر
قیدی قفس میں کوئی ہمارے سوا نہیں

منشی امیر احمد امیرؔ مینائی

تعارف | ۱۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۸ھ میں انتقال ہوا لکھنؤ کے مشہور اساتذہ میں تھے اور اسیر کے شاگرد تھے۔

تہمت بندوں سے کرتے ہیں یہ بت دعوائے خدائی کا
تماشا دیکھتا ہوں تیری شانِ کبریائی کا

مرے ہی سامنے دامن اٹھا کر ناز سے چلنا
تجھی سے پھر گلا الٹا مرے چاکِ گریباں کا

امیر آئیں گے گھبرا کیا شمع اور تاروں کو چھپ چھپ کے
نیا انداز ہوگا سیر مدفن پر چراغاں کا

پھپھولے ہیں یہ خون مرا گرے کیوں حضور
اب اس پہ خاک ڈالیے جو کچھ ہوا ہوا

کیا باغ میں دیکھتی ہے شبنم
جو گل کی ہنسی پہ رو رہی ہے

شیخ کو تھوڑا نہ جانو یہ بڑا مکار ہے
ساری دنیا چھوڑ بیٹھا ہے تلاشِ حور میں

داورِ محشر کو بھائی میری ان کی چھیڑ چھاڑ
چھیڑ کر پوچھا کرے کیا ہوا کیوں کر ہوا

چالاکیاں تو دیکھو مجھے قتل کر کے خود
اور دل سے پوچھتے ہیں یہ کیا ماجرا ہوا

آہ کرنے پہ کیوں بگڑتے ہو!
تم تو صاحب ہوا سے لڑتے ہو

تم کو آتا ہے پیار آپ پر غصہ
مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے!

گھٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی امیر
ادا کسی کی وہ پردہ اٹھا کے آنے کی

راتوں کو مثلِ شبنم چھپ چھپ کے باغباں
ہر پھول سے لپٹ کر روتا ہوں میں چمن میں

بڑھ جاتی ہے چمن میں اور آرزو تمہاری
جس گل کو سونگھتا ہوں آتی ہے بو تمہاری

خزاں تم خیر سے گزری چمن میں بلبلو
بہار آئی ہے اب آشیاں لیے نہ رہے

شوخی تھی قیامت تری مستانہ ادا میں
شگوفوں نے قدم چوم لیے لغزشِ پا میں

امیر ایسی کہاں قسمت کہ پہنچیں اٹھ کے پھولوں تک
کبھی چاکِ قفس سے جھانک لیا کرتے ہیں گلشن

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

اے موت تجھ کو کیا ہوا تو ہی بلا [illegible]
[illegible] بڑی دیر ہو گئی

غنچہ و گل کو تو سو بار شگفتہ دیکھا
غنچۂ دل بھی الٰہی کبھی خنداں ہوگا!

ایک پری الفت نے بنائی یہ ہماری صورت
سیکڑوں پرزوں میں کیا حال گریباں ہوگا

دستِ وحشت تو سلامت ہے رفو ہونے دو
ایک جھٹکے میں نہ دامن نہ گریباں ہوگا

خواہشِ وصل تو کیونکر کہوں لیکن ناصح
دیکھ لینے کا تو حسرت کو بھی ارماں ہوگا

مرے بس میں یا تڑپنا نہ ستم شعلہ ہوتا
یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا

دو در کا دیا مزا تڑپ اب آرزو ہے یار کی
مزہ یہ دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

میں زباں سے تم کو سچا کہو لاکھ بار کہہ دوں
اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا

جمالِ یار کو کہتے ہو تم کہاں دیکھا
کلیم ہوش میں آؤ ابھی کہاں دیکھا

وہی چراغ وہی گل وہی قمر وہی برق
نئے لباس میں دیکھا اسے جہاں دیکھا

سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی
وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولہ جاتا رہا

آنکھ کیا ہے جو ہنسی ہے سحر ہے اعجاز ہے
اک نگاہِ لطف میں سارا گلہ جاتا رہا

شکوہ کسی سے تنگیٔ دل کا کروں میں کیا
یہ شیشہ چوٹ کھانے سے پہلے ہی چور تھا

آفت کی شوخیاں ہیں تمہاری نگاہ میں
محشر کے فتنے کھیلتے ہیں جلوہ گاہ میں

صورت تری دکھا کے کہوں گا بروزِ حشر
آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

گر کر زمیں میں ظلم سے بچنے کا دھیان تھا
دیکھا تو زیرِ خاک وہی آسماں تھا

بیداد تھی شوخی تھی جفا تھی کہ ستم تھا
ہوتی جو وفا آپ میں جو کچھ تھا وہ کم تھا

دھیان کیوں لطف میں باندھا اس جلوۂ لب [illegible]
وائے قسمت دم نکلے اسے بھلا ابھی گیا

امیر کس سے کہوں کوئی اپنا یار نہیں
شریکِ غم جو تھا اک دل اسے حواس نہیں

کسی رشید کی محفل کا ذکر کیا ہے امیر
خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بے بلائے ہوئے

ناز ہے تم کو بہت حسن کی یکتائی پر!
اک ذرا آئینہ خانہ میں تو چل کے دیکھو!

عشق سے پیری میں بھی کچھ لاگ باقی رہ گئی
کارواں عمر گزرا آگ باقی رہ گئی!

لکھنؤ کی شاعری کا تیسرا دور

مولانا علی حیدر نظم طباطبائی

تعارف:- ۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے ۱۹۳۳ء میں انتقال ہوا ان کی ادبی و شاعرانہ عظمت مسلم ہے۔

ادا میں سادگی ہے کنگھی چوٹی نے خلل ڈالا   شکن ماتھے پہ ابرو میں گرہ گیسو میں بل ڈالا
کھلے دو پھول نیلوفر کے آنکھیں اس نے جب کھولیں   ستم کیسا کیا شرمائے ہاتھوں سے جو مل ڈالا
شکن ماتھے پہ آئی اب بھلا کیوں رخ لگے کرنے   تعلی بڑھ گئی ہو بات جو پہلے پہل ڈالا

خوشبو سے یوں ہی ہوش ربا وصل کی شب تھی   گیسو ہوئے برہم تو کھلا نافۂ چیں اور
اللہ رے ساقی کا بضد ہو کے پلانا !   کہتا ہوں میں بس بس تو وہ کہتا ہے نہیں اور

دیکھتا ہوں کبھی حسرت سے تو کہتا ہے وہ شوخ   تو مجھے دیکھ کے جلتا ہے تو جل کیا ہوگا

اڑ کے جاتی ہے مری خاکِ لحد ہر گاہ ادھر   کچھ پتہ دے زندگی عمر گریزاں اپنا

اسیری میں بہار آئی ہے فریاد و فغاں کر لیں   نفس کو خوں فشاں کر لیں قفس کو بوستاں کر لیں

دل اس طرح ہوائے محبت میں جل گیا   بھڑکی کہیں نہ آگ نہ اٹھا دھواں کہیں

مجھے پیری اور شباب میں جو سمجھا تو اس قدر   کوئی جھونکا بادِ سحر کا تھا مرے پاس سے جو گزر گیا

ہنسی ہنسی میں وہ بات کہدی کہ رہ گئے آپ دنگ ہو کر   چھپا ہوا تھا جو راز دل میں کھلا وہ چہرے کا رنگ ہو کر
شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پُر درد ہے فسانہ   یہ رہ گئی بن کے گرد حسرت وہ اڑ گیا رخ سے رنگ ہو کر

یہ کس دھوکے میں جان اپنی دیے دیتے ہیں پروانے   انھوں نے شمع کے شعلے کو شاید تاج زر جانا
ذرا سی ابر دو قطرہ شبنم سے بھی کم تھی   سنا جوہر شناسوں سے اسے آبِ گہر جانا

سارے عالم کو بنایا ہدف تیر اجل   قادر انداز نے یہ فعل حکیمانہ کیا
آج گم دل میں کیا شہرۂ آفاق جسے   کل اسے محفلِ احباب کا افسانہ کیا
الحذر نظم بہت جھک کے فلک ملتا ہے   خوف کی بات ہے دشمن نے جو یارانہ کیا

ادھر جوانی کی شام آئی۔ ادھر ہوئی صبح عہد پیری   یہ کیسی شام و سحر الٰہی کہ جس میں درمیاں نہیں ہے شب
اگرچہ ہے بے ثبات عالم ٹھہر کوئی دم تو اے نسیم   ترا قدم تو سبک ہے ایسا کہ برگِ گل پر گراں نہیں ہے

ہستی کا شور تو ہے مگر اعتبار کیا   جھونکی خبر کسی کی اڑائی ہوئی سی ہے
منزل اپنے سمجھ کے گھر کر لیتے ہیں ہم   بستی جو رہزنوں کی بسائی ہوئی سی ہے

سمجھے دوڑا رہا ہے شوق منزل کا یہ کہہ کر   کہ گر گرنا بار بار اچھا نہیں اے فصلِ آدم بدم ٹھہرا

مرزا محمد ہادی مرزا رسوا

تعارف :- ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔

حسن شاہد ہے مری نیرنگئ تحریر کا
اک ادا نے شوخ ہے جو رنگ ہی تصویر کا

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی
اسی کافر کی ادا یاد آئی

تم کو الفت نہ ادا یاد آئی
یاد آئی تو جفا یاد آئی

ہجر کی رات گزر ہی جاتی
کیوں تری زلف رسا یاد آئی

لذت معصیت عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا
لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

کیا غزل کوئی کہی ہے مرزا
آج کیوں باد صبا یاد آئی

وہ بھی دن ہوں کہ ہم باغوں میں پینے جائیں گے
دیکھیے فصل خزاں کب بیتنے جائیں گے

حضرت ناصح نہیں ممکن مری وحشت کا علاج
دشت میں چاک گریباں آپ سینے جائیں گے

زندگی، دولت، جوانی، بے خودی، شوق وصال
پھر ملیں گے بھی جو یہ سامان چھینے جائیں گے

موت ہی کو زندگی کہنا اگر ہے رسم عشق
مرنے والے آپ کے قبروں میں جینے جائیں گے

اپنی قسمت راہ پر آئے تو مرزا دیکھنا
گر بلا ہوتے ہوئے اس کے مدینے جائیں گے

مشکل ہے ضبط گریۂ بے اختیار کا
کب تک نگاہ بانی دریا کرے کوئی

گو ادعائے شوق کے بالکل خلاف ہو
لیکن یہ مصلحت ہے کہ پردہ کرے کوئی

ہاں اے نگاہ شوق مناسب ہے احتیاط
ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی

ہاں دیکھنا ہے اس کے جنوں کا بھی امتیاز
مجنوں سے جا کے شکوۂ لیلیٰ کرے کوئی

دل بے نیاز اور طبیعت حیا پسند
وہ کیا کریں جو خواہش بے جا کرے کوئی

درد دل کی لذتیں صرف شب غم ہو گئیں
طول فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہو گئیں

ہم نشیں دیکھی نحوست داستان ہجر کی
محفلیں جمنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہو گئیں

ہم کو بھی کیا کیا زمانے کی داستانیں یاد تھیں ؛ لیکن اب تمہید ذکر درد ماتم ہو گئیں

دل یہ کہتا ہے فراق ماہ و انجم دیکھ کر ؛ ہائے کیا کیا صحبتیں راتوں کو برہم ہو گئیں

آئینے سے ہے ان کا رد و بدل ؛ تنگ ہیں شوخی، مقابل سے

شمع فانوس اس کی محفل میں ؛ جھینپتی کیوں ہے اہل محفل سے

اور تو سب تری محفل میں جمے بیٹھے ہیں ؛ بار بار اٹھنے کو کہتا ہے ہمیں سے کوئی

سائلوں کے لئے اب کوئی سزا ہو تجویز
جانتے ہو کہ نہ مانے گا نہیں سے کوئی

بے خودی میں بھی ہر ایک سے کہہ دیتا ہوں
پوچھ لے جا کے ذرا حال انھیں سے کوئی

خاک میں تم نے ملایا ہے کہاں مرزا کو
حیف اتنا بھی نہ پوچھے گا زمیں سے کوئی

حضرت ناصح نہیں ممکن مری وحشت کا علاج
دشت میں چاک گریباں آپ سینے جائیں گے

سمجھا ہوں جو مراد ہے اس چھیڑ چھاڑ سے
ناصح کو بھی ہوس ہے کہ رسوا کرے کوئی

کیا ہنسی کھیل دل لگانا ہے
دل کا آنا قضا کا آنا ہے

دل ناداں سے کیا فریب کرے
اس کے پہلو سے اٹھ کے آنا ہے

دشت میں بھی تو دل نہیں لگتا
اس جنوں کا کہیں ٹھکانا ہے

شعر گوئی فقط بہانا تھا
حال دل کا انھیں سنانا تھا

تجھ سے کیا چوک ہو گئی قاصد
ساتھ ہی اس کو لیکے آنا تھا

کچھ نہ پوچھو شباب کا عالم
کیا کہوں کچھ عجب زمانہ تھا

کچھ دنوں ہم سے دشمنی رکھیے
دشمنوں کو بھی آزمانا تھا

وحشت کے پابند ہم دیوانگی جب تک نہ تھی
پھر لگایا جائے تو پاتھیں کی زنجیر کا

شور فریاد تا فلک پہنچا
مگر اس کو خبر نہیں ہوتی

تیرے کوچے کے بے نوا ہیں ہم
ہوس مال و زر نہیں ہوتی

جان دینا کسی پہ لازم تھا
زندگی یوں بسر نہیں ہوتی

کسی امید پہ نظر میری
شکوہ سنج اثر نہیں ہوتی

ہم اسیران عشق کو صیاد
ہوس بال و پر نہیں ہوتی

غلط انداز ہی سہی وہ نظر
کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی

لے ادا ہم کبھی نہ مانیں گے
دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی

سر سے ٹلتی ہیں شب غم کی بلائیں کیونکر
یا خدا ہوتی ہیں مقبول دعائیں کیونکر

دیکھو دیکھو مرے لٹنے کا تماشا دیکھو
اور سا دل میں بستی ہیں گھٹائیں کیونکر

نہ سہی عشق و محبت بھی ہے آخر کوئی شے
رسم بڑھ جائے کسی سے تو گھٹائیں کیونکر

وصل کی رات ہے پہلے سے بتا دو ہم کو
تم کسی بات پہ روٹھو تو منائیں کیونکر

عین وحدت خلاف کثرت ہے
لطف خلوت جو ہے انجمن میں ہے

کس قدر معتقد حسن مکافات ہوں میں
دل میں خوش ہوتا ہوں جب ہاتھ سوا ہوتا ہے

شوق اظہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ
اسی آئینہ میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

نہ ہم ہستی سے گزر جانا تھا
موت کے قبل ہی مر جانا تھا

موت کیا چیز ہے؟ ترک لذات
ہے اسی موت سے مقصود حیات

رنگ و بو سے نہ رکھو کچھ مطلب
جز خدا اور نہ ہو کچھ مطلب

اک مریض بلا ہمہ پامال و رسوا
وحشی، آوارہ، خانماں رسوا

خستہ، آشفتہ حال، آوارہ
بے دل و بے قرار و بے چارہ

ہرزہ گرد طریق گم نامی!
رہرو شاہ راہ ناکامی

دل پریشان و مضطر و بے تاب
زار، بے حال، بے خود و بے خواب

کشتۂ تیغ الفت جلاد
بسمل تیر حسرت بے داد

چشم بے خواب، خواب سے محروم
دل بے تاب، تاب سے محروم

قطرۂ اشک ارغوانی رنگ
چہرۂ زرد زعفرانی رنگ

خشک ہونٹوں پہ آہ شعلہ فشاں
اک پری وش کا نام ورد زباں

حیا کی شوخیوں سے اٹھ کے جھک گئی نظر
مری قسمت ان کے تیر بھی آئے کماں ہو کر

خیال اس کا نہیں آیا ادھر بھی لکھنا تھی جو
نہیں رکتی طبیعت اہل معنی کی رواں ہو کر

ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گی ادائیں ان کے جوبن کی
دوپٹہ اوڑھ کر آئیں جو چلنے میں ابھرتے ہیں

تماشا ہو جو ان کا بوسہ لے کر ہم مکر جائیں
بہت جو چاہنے والوں کا دل لیکر مکرتے ہیں

جواں ہوتے ہی وہ تو اور ہی کچھ ہو گئے دل
کہاں کی پاک بازی ہم بھی اب نیت بدلتے ہیں

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے
دیکھئے دیکھئے اک آن میں کیا ہوتا ہے

نالہ رکتا ہے تو سر گرم جفا ہوتا ہے
درد تھمتا ہے تو بے درد خفا ہوتا ہے

پھر نظر چھپتی ہے آنکھ جھپکی جاتی ہے
دیکھئے دیکھئے پھر تیر خطا ہوتا ہے

بت پرستی میں نہ ہوگا کوئی مجھ سا بدنام
جھینپتا ہوں جو کہیں ذکر خدا ہوتا ہے

حال دل اپنے نہ کہتا تھا سو ہم کہہ گئے
اس کے ان بات بنا کچھ ہو تو کیا ہوتا ہے

تا لب گور پہنچ جاتے ہیں مرنے والے
وہ بھی اس وقت کہ جب حق رسا ہوتا ہے

ہوا ہو ابر بھی ہو گلزار بھی شراب بھی ہو
یہ سب بھی ہو مگر اک سادہ شباب بھی ہے

بعد توبہ کے بھی دل میں یہ ہے حسرت باقی
دے کے تعمیں کوئی اک جام پلا دے ہم کو

نہ پوچھ ہم سے کہ کیونکر ہجر کے دن گزرتے ہیں
کسی بریدہ زندگی فرقت میں جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

کل رات کو انہیں جو کہیں دیر ہو گئی
دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

پھر وہ خواہشوں نے نہ جینے دیا ہمیں
ان موذیوں سے عقل مری زیر ہو گئی

اے موت تجھ کو کیا ہوا تو ہی بلا آ
ان کو تو آتے آتے بڑی دیر ہو گئی

میری تباہیوں کی انہیں اب خبر ہوئی
کیا پوچھتے ہو عمر تو ہیں تیر ہو گئی

آج اس نے ہم سے آنے کا وعدہ کیا تو ہے
دم ہی نکل گیا جو کہیں دیر ہو گئی

نہیں ہے جسمیں ترا عشق وہ دل ہے تباہی میں — وہ کشتی ڈوب جائیگی کہ جس کا ناخدا ہوگا

اپنے گناہ دیکھ کے دفتر میں روز حشر — ہنگامہ ہوائے ہوس یاد آگیا

صد پارہ ہو کے پھیل گیا ہے ہمارا دل — شیرازہ کھل گیا ہے وفا کی کتاب کا

تنگ آ کے تیغ نے سوال نکالا پردہ کیا قبول — انجام یہ ہوا ہے تمہارے حجاب کا

صبر لازم تھا مجھے ظلم کرنا تھا تمہیں — یہ لباس عشق تھا وہ حسن کی پوشاک تھا

محشر میں ہے سوال گناہ و ثواب کا — یہ ذکر ہو رہا ہے ہمارے شباب کا

مانگی اجازت اور تری آنکھوں نے نہ دی مدد — عالم نے جب ارادہ کیا انقلاب کا

نیند بھر کے بھی نہ پائی تھی کہ آیا وقت کوچ — کھول کر آنکھیں جو دیکھا قافلہ تیار تھا

ذکر وفا جو لائے ستم ایجاد آگیا — بھولے ہوئے تھے قصۂ غم یاد آگیا

رستہ گیا ہے سوئے حقیقت مجاز سے — بت یاد آگیا تو خدا یاد آگیا

دنیا کے سب امور فراموش ہو گئے — کیا جانے دفعتاً ہمیں کیا یاد آگیا

ہم زمانے سے گئے ہجر تن و جان ہو گیا — آج بالکل فیصلہ اے شام ہجراں ہو گیا

غش پڑے تھے سالک بستر خوشا تم جو آئے — بند آنکھیں کر لیں گھر یا چراغاں ہو گیا

اب ہوا ثابت کہ یکرنگی ہے حسن و عشق میں — آپ کا گیسو ہمارا دل پریشاں ہو گیا

دست وحشت نے بڑھائی اور بھی دیوانگی — جادہ دشت جنوں ہر تار داماں ہو گیا

محو وہ زلفیں بنانے میں ہیں پروا بھی نہیں — کس کا بگڑا حال کس کا دل پریشاں ہو گیا

لائے ہمراہ چھری کا دوسری قاتل میرا — خون اغیار میں ہو جائے نہ شامل میرا

گو برا ہے دل مگر رہنے دیا ہے اسلئے — عشق کی ہو کر طبیعت پر کبھی کام آئے گا

قاصد مرگ آئے یا آئے تمہارا نامہ — کہہ رکھا ہے دل کو کوئی آج پیغام آئیگا

روح کا تن سے نکلنا آپ کا جانا ہے ایک — کچھ عجب ہنگام ہوگا جب وہ ہنگام آئیگا

دونوں آنکھیں دل جگر مرے عشق ہو میں شریک — یہ تو سب چھپے رہیں گے مجھ پہ الزام آئیگا

پیارے صاحب رشید

تعارف:۔ سید مصطفیٰ مرزا نام پیارے صاحب عرف رشید تخلص میر انیس کے نواسے سید مرزا انس شاگرد ناسخ کے پوتے احمد مرزا صابر کے بیٹے عشق اور تعشق کے بھتیجے سنہ ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶) میں ولادت اور سنہ ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۷) میں وفات ہوئی۔

سید اصغر شاہ صاحب نے صرف و نحو اور مرزا محمد اخبادی سے فقہ اور مولوی انور علی حنفی سے معقولات کی تحصیل کی شوق مطالعہ نے استعداد علمی بڑھائی شاعری میں اپنے چچا میر عشق اور تعشق کے شاگرد تھے دبلے پتلے میانہ قد لکھنؤ کی تہذیب و شرافت کا پتلا خود دار نازک مزاج کم سخن مرنجان مرنج انسان تھے معاصرین میں کبھی کسی سے سخن گسترانہ چشمک کبھی نہیں ہوئی غزل اور مرثیہ میں اپنے وقت کے مسلم اساتذہ میں تھے دور دور شہرت تھی شاگرد آغا شمیر نے ان کے حالات میں ایک مستقل کتاب حیات رشید کے نام سے لکھی ہے:۔

شروع عشق میں صبر اس دل مضطر سے کیا ہوگا — ابھی نا آشنا ہے رفتہ رفتہ آشنا ہوگا

ہے یہ تو وصل میں دل ہجر میں مضطر سوا ہوگا — خوشی جس گھر کی ایسی ہے وہاں کا رنج کیا ہوگا

ابھی تو یاد ہے کہنے کی باتیں دل میں لاکھوں ہیں — نہ کچھ یاد آئیگا اس وقت جب ان سے سامنا ہوگا

انھیں عشاق کی گستاخیوں کا خوف رہتا ہے — کبھی غافل نہیں سوتے کہ کوئی جاگتا ہوگا

وہ گیسو بڑھتے جاتے ہیں بلائیں ہو گئی ہیں نازل — قدم تک آ گئے جب حشر عالم میں بپا ہوگا

غضب کرتے ہو میرے دل کو ابرو سے چھڑاتے — بھلا سوچو تو کیوں کر گوشت ناخن سے جدا ہوگا

عدم میں کیسا کیسا دم نہ لے گا ایک ہی تنگ — نئی بستی نئی پوشاک ہوگی گھر نیا ہوگا

رقیبوں کی امیدوں کو جگہ دیتے ہیں ہم دل میں — کراں ہیں سے کوئی آخر ہمارا مدعا ہوگا

بیاں ہوتا ہے دل کا راز جب ایسی ہو بیتابی — ترا شکوہ کرونگا میں فقط جس دن نہ ہم ہوگا

ترا وحشی فقط ہے منتظر اک خندۂ گل کا — نظر سوئے چمن ہے ہاتھ رکھا ہے گریباں پر

ہاتھ کھینچے ہوئے بیٹھے ہیں اسیرانِ قفس — کہ نہ داماں قفس ہے نہ گریباں قفس
کب رہا ہو گے اسیری کا مزا دل سمجھ گیا — آشیاں بھی جو بنایا تو بعنوانِ قفس

جد تیں دیکھئے صحرا میں بھی دیوانوں کی — وضع اک نعذ بدلتے ہیں گریبانوں کی
کیجئے سال گرہ فصلِ بہار آپہنچی — بیڑیاں پھر سے بدلوائیے دیوانوں کی
آج ہم روئے بہت دیکھ کے تصویرِ شباب — یاد تازہ ہوئی بھولے ہوئے افسانوں کی
منع کرتے تھے کہیں اشک نہ آنکھوں سے رکیں — ابر دکھوئی چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

دل ہی ڈوبے کبھی ڈبوئے کا ... — یہی کشتی یہی دریا ہے یہی لنگر ہے
تنگ ہوا اپنے وطن سے میں پریشاں نکلا — جامہ تن کو وہیں چھوڑ کے عریاں نکلا
کس قدر جلد ہمیں بھول گئے اہلِ وطن — کوئی ہو کر نہ سوئے گورِ غریباں نکلا
دل کی بستی کا بہت ہم نے سنا تھا شہرا — شہر سمجھے تھے جسے ہم وہ بیاباں نکلا
تجھ سے اے جسم جو ہوئی روح جدا پیری میں — ہو کے بیقدر ترے گھر سے یہ مہماں نکلا
کہتے ہیں شبنم و گل عالمِ نیرنگ کا حال — کوئی ہنستا ہوا نکلا کوئی گریاں نکلا
بام پر شب کو جو سرکی رخِ روشن سے نقاب — کاٹ کر راہ ادھر سے مہِ تاباں نکلا

بجلی تڑپ تڑپ کے گری گی کہاں کہاں — تنکے تو باغ بھر میں مرے آشیاں کے ہیں
کیا آپ جوڑتے ہیں دلِ پارہ پارہ کو — معلوم بھی ہے کون سے ٹکڑے کہاں کے ہیں

خدا وحشت میں برکت دے سلامت رکھے ہاتھوں کو — کہ بسم اللہ کہہ کر چاک کرتا ہوں گریباں کو
مدد دینے لگی ہے ہر قیامت خیز طوفاں کو — غضب ہو جائیگا کیا ہو گیا ہے چشمِ گریاں کو

بندہ کاظم جاوید

محمد کاظم نام بندہ کاظم عرف جاوید تخلص محمد جعفر صاحب امید (م ۱۲۹۳ھ) کے بیٹے مولانا محمد باقر صاحب منصف الدولہ بہادر (م سنہ ۱۲۷۶ھ) کے پوتے سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب (م سنہ ۱۲۸۴ھ) مجتہد العصر کے پر پوتے۔

زین العلماء عضد الدین مولانا علی حسین (م) خلف سید العلماء سید حسین (م سنہ ۱۲۷۳ھ) کے نواسے سنہ ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی کہاں تک ہوئی یہ نہیں معلوم۔

گیارہ برس کے سن میں والد کا انتقال ہو گیا ماموں (مہدی حسین ماہر م سنہ ۱۳۲۰ھ) نے پرورش کی ملاذ العلماء مولانا ابوالحسن عرف بچھن صاحب (م سنہ ۱۳۰۹ھ) نے ولیعہد معین کیا اس طرح جاوید کی ابتدائی زندگی خوشحالی میں بسر ہوئی۔

شادی خاندان ہی میں صادق علی عرف چھنگا صاحب (م سنہ ۱۳۵۱ھ) کی بہن سے ہوئی جو سید صادق صاحب (م سنہ ۱۲۵۰ھ) پسر سلطان العلماء کے نواسے تھے۔ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ جب بیوی کا انتقال ہو گیا تو دوسری شادی نہیں کی۔ کتابی چہرہ۔ میانہ قد۔ گدبدا جسم وجاہت اور شان چہرے سے نمایاں تھی چوگوشیہ ٹوپی انگرکھا اس پر تکونا رومال مشروع یا چھالٹین کا پجامہ اور ڈربی کا پمپ پہنتے تھے ایک ہاتھ میں تسبیح رہتی تھی خشخشی داڑھی تھی جب سے بال سفید ہونے لگے تھے خضاب پابندی سے لگاتے تھے۔

اختلاجی مزاج تھا ہیضہ سے بہت ڈرتے تھے گرمیوں میں اور خاص طور پر فصل کی خرابی کے زمانہ میں استخارہ دیکھ کے کھانا کھاتے تھے۔ اکثر فاقہ کرتے تھے۔

سفر سے بھی بہت گھبراتے تھے جب بضرورت کہیں جانے لگتے تو کوئی شاگرد قرآن کے نیچے سے نکالتا اور وہ دعائیں پڑھتے دونوں بازوؤں پر دم کرتے گھر سے نکلتے تھے۔

خلیق متواضع منکسر مزاج اور صاف دل آدمی تھے سیکڑوں لطیفے یاد تھے جہاں بیٹھ جاتے تھے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔ شیرازی کبوتروں کا شوق تھا نہایت عمدہ قسم کے رنگ برنگی کبوتر پلے تھے جب ان کی ڈھابلیاں کھلتی تھیں تو ایک چلتا پھرتا باغ نظر آتا تھا۔ دنگل کے بہت شوقین تھے پان کثرت سے کھاتے تھے۔ شاعری کا بچپن سے شوق تھا محمد مصطفیٰ عرف لڈن صاحب خورشید کے شاگرد تھے۔

شاعری میں ان کی شہرت غزل گوئی سے ہوئی اور اپنے زمانہ میں لکھنؤ کے سب سے بڑے غزل گو کی حیثیت سے مشہور ہوئے ان کا مزاج عاشقانہ تھا غزل سے فطری مناسبت تھی اوائل عمر ہی سے انہوں نے شہرت حاصل کر لی۔

مہدی حسین صاحب ماہر کے انتقال کے بعد وہ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے اور غالباً اسی زمانہ سے مرثیہ کہنا شروع کیا جو اس زمانے میں باعزت ذریعہ معاش تھا اس میں بھی انہوں نے بڑی شہرت حاصل کی اور لکھنؤ کے چوٹی کے مرثیہ گویوں میں شمار کئے گئے۔ حضرت انجم لکھنوی نے اس زمانے کے اکابر مرثیہ گویوں کا ذکر ایک رباعی میں اس طرح کیا ہے۔

اس عہد کے بس یہی ہیں پانچ شاہان سخن ۔۔۔ حقا کہ انھیں کے دم سے ہے شان سخن
جاوید عروج و عارف و اوج و رشید ۔۔۔ یہ پنجتن پاک ہیں ایمان سخن

وہ مرثیے پڑھنے کے لئے دور دور بلائے جاتے تھے دو مرتبہ نواب کمال الملک کی دعوت پر حیدرآباد گئے۔ اصغر آباد پنڈراول جانسٹھ ضلع مظفر نگر

ہر سال بلائے جاتے تھے اور ہر جگہ سے معقول رقم ملتی تھی جب واپس آتے تھے تو خوشحال ہو جاتے تھے مرغ تیتر بٹیر دونوں وقت پکتے ڈیوڑھی پردوں سے بھری رہتی تھی کھانے میں اکثر شاگرد بھی شریک رہتے تھے۔

جب پیسہ ختم ہو جاتا تو وہی عسرت کا عالم ہو جاتا لیکن غیور اتنے تھے کہ کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے نہ کسی شاگرد سے کبھی طالب ہوئے کبھی کوئی چیز گروی رکھ دی یا بیچ ڈالی اسی سلسلہ میں اپنا آبائی مکان جو سرائے معالی خاں میں تھا بیچ ڈالا اور تھوڑی دور پر کرائے کے مکان میں اٹھ آئے جہاں مرتے دم تک رہے کسی حال میں ہوں فکر سخن سے غافل نہیں رہتے تھے اور مشق سخن جاری رہتی تھی۔ پیتل کا جالی دار قلمدان سامنے رہتا تھا جس میں قلم دوات رکھا جاتا تو الائچیاں اور عطر کی شیشی ہوتی تھی۔

برجستہ گوئی۔ وہ بڑے برجستہ گو تھے شعر کہنے میں ان کو فکر کی ضرورت نہ تھی غزلوں کی غزلیں اس طرح کہہ ڈالتے تھے جیسے باتیں کر رہے ہیں انھوں نے اپنی بعض غزلوں کے مقطع میں اس کا ذکر بھی کیا ہے صفدر مرزا پوری ان کے تلامذہ میں تھے انھوں نے ایک کتاب بزم خیال لکھی ہے جس میں ان شعراء کا ذکر ہے جن کو انھوں نے دیکھا ہے جاوید صاحب کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے کمال فن سادگی مزاج اور برجستہ گوئی کا اندازہ ہو سکتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"جب میں لکھنؤ میں آیا یہاں کے اکثر شعراء کاملین فن سے ملتا رہا جس وقت میں بندہ کاظم صاحب جاوید سے ملا تو جس قدر میں نے شہرت سنی تھی اس کا کوئی اثر طریقہ بسر سے نہیں پایا۔

اتفاق سے ایک دن ساتھ سبزے کی سیر ہو رہی تھی کہ ایک عنا

سیاہ شیروانی پہنے ہوئے نمودار ہوئے آپ نے کہا ــ صبح سے شام تک اصلاحیں دے کے یہاں آیا تھا یہ بھی مرے ماتم میں سیاہ پوش ہیں انھوں نے قریب پہنچ کر فراشی سلام کیا اور شعر اصلاح کے لیے سُنایا۔ جاوید صاحب سنتے جاتے تھے اور اصلاح دیتے جاتے تھے۔ اتنے میں ایک دوسرے صاحب نازل ہوئے انھوں نے ایک شعر اور ایک مطلع اصلاح کے لیے پیش کیا مطلع تو مجھے یاد نہیں رہا شعر یہ تھا۔ سے

نہیں ہے اب کوئی جوان کو دیکھے ؎ حسیں اب کیا کریں سُرمہ لگا کے

اصلاح

مرم زینت خیال آتا ہے کس کا حسیں رو دیتے ہیں سُرمہ لگا کے

...... ایک دن جاوید صاحب میرے گھر سے جا رہے تھے پانی برس کے نکل گیا تھا راستے میں کیچڑ بہت تھی پاؤں کیچڑ میں پڑا اور چھینٹیں اڑیں مولانا عشقی اور عزیزی طرب ساتھ تھے آپ نے برجستہ کہا ؎

جو چھینٹ پاؤں سے اڑتی ہے سر پہ آتی ہے ؎ فلک کی طرح زمیں بھی ہمیں ستاتی ہے

۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۰ھ مطابق پندرہ نومبر ۱۹۲۱ء کو انسٹھ برس کی عمر میں دو دن سانجر کے مرض میں مبتلا رہ کے انتقال فرمایا۔ جنازہ بڑی دھوم سے اُٹھا شہر کے تمام روساء علماء اور شعراء شریک تھے غفران مآب کے امام باڑہ میں دفن ہوئے۔ ہندوستان کے تقریباً تمام شعراء نے وفات کی تاریخیں کہیں کسمنتے آواز طبتم فادخلوها خالدین"

سے مادہ تاریخ نکالا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔

احباب و معاصرین :۔ ان کے احباب میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے جو

سلہ بزم خیال مطبوعہ صدیق بکڈپو امین آباد لکھنؤ ص ۱۲۵ تا ص ۱۲۷

ان کے بڑے قدردانوں میں تھے جب لکھنؤ آتے تھے تو ان سے ضرور ملتے تھے اور اکثر مصرع طرح بھیج کے غزلیں بھی منگواتے تھے ایک غزل کے مقطع میں جاوید صاحب نے اس کا ذکر بھی کیا ہے ؎

ایک ہی دن میں غزل بھیجدی کہکر جاوید پاس تھا حضرت آزاد کے فرمانے کا

امیر مینائی ان کے اساتذہ کے ہمعصر تھے مگر ان سے برابر کا برتاؤ کرتے تھے اور اکثر غزلوں کی طرح بھیج کے ان سے غزلیں کہلواتے تھے اس کا ذکر بھی جاوید صاحب نے ایک غزل میں کیا ہے ؎

آپ جاوید بجا لا چکے ارشاد امیر طرح گر خوب ہو تو فکر بھی بیکار نہ ہو

ریاض خیرآبادی ان کے معاصرین تھے ان سے بھی عزیزانہ تعلقات تھے ایک مقطع میں اس کا ذکر بھی ہے ؎

یہ کہہ ریاض سے جاوید ہو جو لکھنؤ کشش کہاں وہ جائیں جو دوست لکھنؤ آ کے رہ گئے

محل ملال نہ مجھے حشر میں جو نالوں کا! کمال ہو گیا چہرہ ستانے والوں کا

کہیں کے بھی کہاں نہ رہیں گے جو لوگ جیتے ہیں حضور غم نہ کریں آپ مرنے والوں کا

چپ رہوں گا تو ستائیگا مجھے دل میرا کچھ کہوں گا تو مزاج آپ کا برہم ہوگا

پہلے تو اس نے قتل مجھے بے سبب کیا اب ہاتھ مل رہا ہے کہ یہ کیا غضب کیا

کام اپنا اپنا سب کی نگاہوں نے کر لیا اللہ کی نظر نے یہ کیا غضب کیا

آئے ہیں لیکے غیر کو وہ پوچھنے مزاج کیونکر کہوں کہ شکر ہے پروردگار کا

جہاں میں کوئی نہ شوق تھا شباب ایسا زمانہ یاد ہے اس بیوفا کا خطاب ایسا

بہار باد سبز بزم آئینہ دیکھو! میں جانتا ہوں کسی کا نہیں شباب ایسا

یہ کس نے چاہنے والوں پہ سرد مہری کی یہاں تک آتی ہے آواز لن ترانی کی

جو چھپنا ہے تو میری طرف پھیر لو منھ یہ کوئی کھیل نہیں موت ہے جدائی کی

انھوں نے دیکھے تسلی پہ کیا کیا اے ہجر / ہمارے دل کو نہ پہلے تھا اضطراب ایسا
قدم قدم پہ ترے بس لٹے ہیں دل کیسے / ملا کسی کو نہ عالم میں وہ شباب ایسا
اب ایک نزع کی ہچکیں سی تھی ہیں گھبرا دل / ہزار بار ہوا ہوگا اضطراب ایسا

اس قدر چپ چپ نہ دیکھا تھا کبھی / دیکھ کر تصویر کو پیار آگیا
دے کوں کچھ خود ہی تسلی کے جواب / حال کہتے کہتے دم گھبرا گیا
بات کھولی عشق کی یہ بھی اے کلیم / جس کی صورت دیکھ لی عشق آگیا

عاشق کو ترے جی سے گزر نہیں آتا / سب آتا ہے بدبخت کو مرنا نہیں آتا

یہ نکات تجھی ہے کہ ہیں دو داغ جگر میں / اک ہجر کی شب کا ہے تو اک وصل کی شب کا

اب یہ حسرت کہ لاش بھی وہ اٹھائیں / دل کو مرنے سے پہلے مرنا تھا
گلے اپنے لگایا انھیں اٹھتی جوانی نے / مزاج اب آج سے کچھ اور ہے اس کا

ہے جن کو درد خیر کے غم میں شریک ہیں / تڑپی جو موج ٹوٹ گیا دل حباب کا

دل سے رخصت ہو گیا خوف و خیال باز پرس / مسکرا کر حال دل کا پیش اور کہہ دیا
یاد تھا پوری طرح افسانۂ ہجر و وصال / کچھ گھٹا کر کہہ دیا اور کچھ بڑھا کر کہہ دیا

کوئی کہہ دے کہ جو آئے ہیں تو دم بھر بیٹھیں / ایسی کچھ دیر نہیں ہے مرے مرجانے میں
نشہ آنکھوں میں بل ابرو پہ ہے اور یہ ہنسی / ہے سلیقہ انھیں تصویر کے کھنچوانے میں

کسی دامن کی بھرے کشش کو یاد کرتے ہیں / ہم اپنے اشک کی امید برباد کرتے ہیں
بہت روئے ہیں قسمت کو جو آباد کرتے ہیں / جگر کے زخم بیٹھ جاتے ہیں جب فریاد کرتے ہیں

جاوید اتحاد عناصر ہے یادگار / یہ اک سرا میں چار مسافر کہاں رہیں

یہ آرزو ہے کہ رہ جائے طاقت پرواز / پھڑک رہا ہوں لہو بادئے کبوتر

مسکرانا بھی اور انداز سا / کھلتی کلیوں کو آگیا کیونکر
عشق سے پریشان ہوں کلیم آپ سر حلقہ / ہوتا ہے یہی عاشق دلگیر کا انداز

داستاں وصل کی چھیڑوں کہ شب فرقت کی / لطف دو رنگ کے اور ایک ہے افسانہ عشق
آنے کے دن کی خبر دل کی دھڑک نے دی تھی / بیٹھے ہیں کبھی سنتے تھے جو افسانہ عشق

اپنے یہ شر حشر ہے لاکھوں ہی ہیں تمنا / یہاں ہم بھی ہیں راضی نقاب ڈال کے جا
کہیں ہے نشہ جوانی کا ہم کو غفلت عشق / نہ اختیار میں تم ہو نہ اختیار میں ہم

ہے مذاق عاشقی میں موت اک امر محال / تم پہ جو مرتے ہیں ان کے دم نکل سکتے نہیں
وصل کے اقرار کے حشر میں نادم ہیں وہ / اب یہ دیکھئے آج کے تردا پہ کل سکتے نہیں

اتنی حسرت ہے کہ اے کاش اجل بھی آجا / ان پہ جو مرتے ہیں جینا انھیں منظور ہیں
وہ کیا خوب کی لاش بھی آ کر وہ لپٹ گیا / جانتا ہوں کہ حسینوں کا یہ دستور نہیں
ان کے کوچے میں کوئی دفن نہیں ہو سکتا / اب کہوں خاک کہ جینا مجھے منظور نہیں
پاس آتے ہیں وہ ہمراہ رقیبوں کے جا رہے / اب اگر آج اجل آئے تو کچھ دور نہیں

دیکھ ہی لیتے ہیں ان کے تکنے والے نہیں / ان سے تو خود بھی سر محفل چھپا جاتا نہیں

سنبھالا ہے خودی کو تو سمجھے وہ سنبھلے ہیں / نکلے ہیں کبھی ہم نے تو بوں اور ان کے نکلے ہیں

ثابت نہ کچھ ہوگا نگہ ان کی ہے یہی / اب کھینچئے تصویر وہ شرمائے ہوئے ہیں
اب چاہنے والوں کے کلیجوں کا خدا ہے / آئی ہے جوانی تو وہ اترائے ہوئے ہیں
عشاق کی ضد سے وہ نگہ رکھتے ہیں نیچی / بیدرد یہ سمجھے ہیں کہ شرمائے ہوئے ہیں
بلا جانے تو خود دیکھ لو آنکھوں سے جنازہ / ہم در پہ بڑی طرح سے آج آئے ہوئے ہیں

دامن کی وہ ہوا دیتے ہیں بار بار / مطلب ہے اپنے ہم کو بھی عشق آئے جاتے ہیں
رات کو دریا میں سوچیں کس طرح سے چین لیں / اک کنارے چاند ہے اور اک کنارے آپ ہیں
ہوتا ہے جو قتل ان کی نزاکت دیکھ کر / کھینچی نہیں ہے ہاتھ سے تلوار کیا کریں
دیکھیں تو جان جائے نہ دیکھیں تو جان جائے / آخر کسی کے طالب دیدار کیا کریں

شکوے جو کچھ کئے ہیں جنون یہ کہہ رہا ہے / یا ہیں بنا رہے ہیں کچھ ایسے جوڑتے ہیں

شمع نے رو کے یہ پروانے کی میت پر کہا ! آندھو اب کوئی جلنے کے سوا ارماں نہیں
بیکسی خون گرم پھر کسی گوشہ میں وہ گرا رو بیٹھی ترا غم ہو دل ابھی ہار میں

دل کو کیا ہوا ہے تو جلتا ہے رات بھر دل میں جو سوز ہے وہ نہیں در پہ نہیں
اب کیا یہ چاہتے ہو کہ عشق سے کوئی اٹھا روس یہ کیا ہماری ہوتی رہی دل میں
دوران کیجیو ہوا ہے کوئی بیمان دل پھر اک جنگ چھتی ہے کلیجہ کے دینے میں

شام کو آ سوئے تو رات اُن کی سانجھی لب پہ صبح کو نیند آئی تو دل تھام کے گھر سے چلے

کسی پہ آئے کہیں سو غضب کی شے ہے شباب وہ پھول کیا جو کہ کھلے چمن کی جگہ سے
یہ پوچھنے کی بات ہیں کہ نہیں تو اور ہے کیا کہو تو چھوٹ یہ کہہ دوں کہ تم جوان
درازی شب فرقت کا ذکر کیوں پوچھو کبھی صدا نہ پڑی کہ تم جوان ہے
یہ کیا سبب ہے کہ تصویر کے بھی چہرے پر ہنسی کیسے آگئی جس وقت وہ جوان ہوئے

ہر ایک نقش نے گریہ رنج خود ذات میں یہ اب اور یاد نہیں کس قدر ملال ہوئے
یہیں تو سر ہے دنبالہ وند سے وار یہ وہ تیر تھی ہے دیکھ کر ملال ہوئے

جس کی باتوں سے ستاتا ہے دشمن جانی بھی ہوش بھلا ایسے کو آئے گا تو دیوانہ لیے ہے

موت اور غش میں کوئی فرق کیسا ہوتا ہے دیکھ کر وہ دل کی صورت گریہ پہچان گئے

گماں غلط ہے کہ وہ خود وہ ہوا ان کی بے تمہارے جس کے ٹکڑے ہو گئے ہوتے
ان کو تو سہل ہے وہ میرے گھر جا آئیں گے ہم جو اس سے آگے نکل گئے تو لد گئے
کیا کہیں کیا نہیں تیر کی اینا دیں گر اب اگر ہو سنہ آگئی تو مر جانا ہے
روز ہم تیر ہی گئے ہیں غضب ہے تو بھی اب یقیں ہو کو نہ آئیگا جو ہے اس سے
اک نقطہ حسرت وہ جاو یہ ہم کرتے ہیں گرو میں کیا نہ ملے تم تو ادھر جا کر بیٹھے

بکھر کے زلف کو نہ جانا تو ہے پر آئیے اس رنگ کی ہیں لاش نہ اٹھے گی بر کے
بجلی گر گئی آج کسی بد نصیب پر ہم نے کلیجہ تھام لیا بکر جائے

زمانہ اپنی آزادی کا شاید یاد کرتا ہے گرفتار قفس کس درد سے فریاد کرتا ہے
کلیجہ کھلتی کلیوں کا بھی شق ہوتا ہے گلشن میں یہ کون اس درد سے اے باغباں فریاد کرتا ہے

اب تو ڈھونڈتے ہیں عباد کو بھی وہ آئے ہوئے جب سے دیکھا ہے کسی کا دم نکل جاتے ہوئے
ہے گماں مرگ اٹھتے ہیں گھبراتے ہوئے آنکھ سے دیکھا نہ تھا کیا غش کبھی آتے ہوئے
کس نے بے سمجھے ہوئے تعریف کر دی چاند کی لیجئے آئے نقاب رخ وہ سرکائے ہوئے
ان کی ایسی ہو جوانی تو نہیں لیتے ہیں ہوش خود نقاب رخ کو دیکھا ہے سرک جاتے ہوئے

جانکنی کا وقت ہے کروٹ بدل لیجئے آپ کی حسرت نہیں دم ہے نکلنے دیجئے
مہربانی آپ کی پہلوئے ہے ظلم کا درد دل کا حال کہتا ہوں سنبھلنے دیجئے

تھی حشر میں بھی چال قیامت حضور کی سچ پوچھئے تو جھینپ گئی آنکھ حور کی

ہے مصلحت وقت جو غصہ نہیں آتا ہنستے ہیں کہ جس میں مرے رنج کا اثر جائے
ہاں گور غریباں میں وہی میری لحد ہے بے قصد چلا پر وہ ستمگار ٹھہر جائے

واں آرزو کسی نے نکالی شباب کی یاں آگئی قضا دل خانہ خراب کی
ساقی کے رخ سے گھٹ گئی رنگت شراب کی چہرے پہ کھنچ کے آگئی سرخی شراب کی
بجلی تڑپ تڑپ گئی گردونہ بار بار تصویر کھنچ سکی نہ تمہارے شباب کی
کیا مل گیا طلسم تصور کو توڑ کے تصویر کھنچ رہی تھی تمہارے شباب کی

داغ دیتی ہے جوانی آپ کی پاس ہے سب کے نشانی آپ کی
بچپنا تھا آپ کا ہر دل عزیز دیکھنے آئی جوانی آپ کی !
مٹنے والا جب کوئی ملتا نہیں دل سے کہتے ہیں کہانی آپ کی
ساتھ ہی اس کے ہوئے ہم بھی تمام پر اثر کیا تھی کہانی آپ کی
دید کی امید بھی جاتی رہی جب سے سن لی ترانی آپ کی

ریاض خیر آبادی

تعارف:- ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۳ء) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوا۔ ریاست محمود آباد سے وظیفہ ملتا تھا۔ لکھنؤ کی ادبی چہل پہل میں شریک تھے۔ اسیر اور امیر مینائی کے شاگرد تھے۔

کچھ شوخیٔ رفتار میں بھی کم ہے قیامت ۔۔ کچھ قد بھی نکلتا ہے بت شوخ ادا کا

لاکھوں پردوں میں کوئی لائے نگہ شوق تو ہے ۔۔ دیکھ لیگا جو کوئی دیکھنے والا ہوگا

ذرا جو ہم نے انھیں آج مہرباں دیکھا ۔۔ نہ ہم سے پوچھئے کیا رنگِ آسماں دیکھا

بہت ہی روئے گلے مل کے ایک ایک سے ہم ۔۔ لٹا ہوا جو کوئی ہم نے کارواں دیکھا

وہ دل مرا ہو کہ دل کی ہو آہ کوئی ہو ۔۔ بجھی سی آگ کا اٹھتے ہوئے دھواں دیکھا

ہنگام نزع گریہ یہاں بیکسی کا تھا ۔۔ تم ہنس پڑے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

جب حالِ دل کہا تو یہ سننا پڑا ہمیں ۔۔ تم تو سنا رہے ہو فسانہ سنا ہوا

جھگڑے وہ گلرخوں کے الٰہی کہاں گئے ۔۔ کیا ہو گیا گلاب کا تختہ کھلا ہوا

میخانے میں کیوں یادِ خدا ہوتی ہے اکثر ۔۔ مسجد میں تو ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا

کوئی مست میکدہ آگیا ہے بیخودی میں پکارتا ۔۔ نہ صدائے نغمہ دیر کبھی نہ حرم سے شور اذاں اٹھا

رہ گیا پردہ تمہارے چاک گریبانوں کا ۔۔ حشر میں کوئی بھی پرساں نہیں دیوانوں کا

آنکھ سے دیکھ لیا خون تمنا سو بار! ۔۔ دیکھیے پھر بھی ٹپکتا ہے نظر سے کیا کیا

آپ آئے تو خیالِ دلِ ناشاد آیا ۔۔ آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

کچھ بھی ہو ریاض آنکھ میں آئے نہیں آنسو ۔۔ مجھ کو تو کسی بات کا اب غم نہیں

اک ذوقِ نالہ ضبط سے وہ بھی مٹا ہوا ۔۔ میں کیا بتاؤں کیا دلِ اندوہگیں میں تھا

مزا دیتی ہیں گھڑیاں انتظارِ یار کی کیا کیا ۔۔ کبھی مسرور ہو جانا کبھی رنجور ہو جانا

اب خدا جانے بہار آتی ہے آئیں کہ نہیں ۔۔ میرے دم سے کبھی آباد تھا گلشن اپنا

باغباں کام ہمیں کیا ہے وہ اُجڑے کہ رہے ۔۔ جب ہمیں باغ سے نکلے تو نشیمن کیسا

اگر اب حشر کب ہے کچھ کا ریاض! ۔۔ داغ ہے دامنِ تر سب میں ہو چکا

بہار آئی تھی گلشن میں وہ دن بھی یاد ہیں ہم کو ۔۔ کسی کے ہاتھ میں مینا فرشتہ کوئی گل بدامن تھا

قریب نجد کا ابتک نہ بیستوں نزدیک ۔۔ یہ کون تھا مجھے صحرا میں جو پکار گیا

بتوں کو دیکھ کے اللہ یاد آتا ہے ۔۔ وہ دن گئے، وہ محبت گئی، وہ بچپنا گیا

اڑائے پھول جبیں آئے ہیں بہار میں کیا ۔۔ لگی ہے آگ سی یہ آج لالہ زار میں کیا

مرے ہاتھ سے پینا انھیں اور بار ہوتا ۔۔ مگر از رہِ تجلی جو گلے میں ہار ہوتا

مانا نہیں کرتا تھا دم عشق کا بھرتا تھا ۔۔ رنگ سے مرتا تھا ہر رنگ سے مر دیکھا

ایک چلو ہے نہیں کوثر و تسنیم ریاض ۔۔ خاک اڑتی جو لبِ خشک مرا تر ہوتا

عالم جو ہوا ہے تو آواز سی آجاتی ہے ۔۔ چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

بجا تھک کے گرے گر کے اٹھے اٹھ کے پھر بیٹھے ۔۔ تجھ پر اثر اے دوریِ منزل نہیں ہوتا

کوئی جا کر ریاض کو سمجھا دے ۔۔ کچھ خفا ہیں وہ اپنی جان سے آج

رہنے کا ریاض ابھی ذرا نام لیا ۔۔ جینا ابھی مر مر کے تجھے ہے مری جان اور

ملا یا خاک ہو کر حسرتوں کو اپنی مٹی میں ۔۔ چھپایا کارواں کو ہم نے گرد کارواں ہو کر

[illegible] ۔۔ ہم حرم میں آرہے ہیں میخانے ویراں کر کے

پڑا ہی اس دل کی بیتابی یہاں تک ۔۔ ہمیں ہم ہیں زمیں سے آسماں تک

کہیں چھپتا ہوئے عتاب کا رنگ ۔۔ کہ بدلنے لگا نقاب کا رنگ

رنگ کا اس کے پوچھنا کیا ہے ۔۔ جس کا سایہ بھی دے گلاب کا رنگ

پایا جو تجھے تو کھو گئے صنم ۔۔ بیدار ہوئے تو سو گئے ہم

اب دشت نورد عشق ہو ہو ۔۔ اس راہ میں کانٹے بو گئے ہم

اس پر ہے یہ وہ بت بھی ساتھ ہوگا ۔۔ یہ سچ ہے ریاض تو گئے ہم

فتنہ سا ہے شرابِ گل رنگ جو پی نہیں ۔۔ یہ رنگ ہے شباب کا تو رنگ نہیں

کوئی ناخوش ریاض سے کیوں ہو — اس روش کا وہ آدمی ہی نہیں

پھٹ کر غنچہ نا نہیں پھوٹتے ہی چاک دہن — کام کے جب دیدۂ پُرنم نہیں تو کچھ نہیں

کرن سورج کی نکلی جام سے — یہ کیسا دھوپ سینا چادر زرّیں

وہی ہم ہیں نہ چھوڑا بار تلم ہم نے گریبا — وہی ہم ہیں کباب ٹکڑے لیے اور

ہستیں جلتے گرے جا کے فلک پر جھکر — کچھ تو کم کچھ اور گئے سیارہ ہیں

رنگ دل کا داغ چھپتا نہیں — اس چمن کا پھول مرجھاتا نہیں

جو بکھرتے رہتے ہیں نقش قدم — تو کہیں آتا نہیں جاتا نہیں

سیر کو جلوہ گاہ طور کہاں — جب ہے پاس جائیں دور کہاں

سر اٹھانے میں ماتھے سے سیر — گم ہوئی ہے صدائے صور کہاں

کوئی بھی دل مجنوں کی بیاباں ہی نہیں — چمن کے تشنہ سر اپنی گاہ جلاتے ہیں

داد محشر سے کیا شکوۂ بیداد کریں — ہال نہیں ابھی تو کچھ آپ سے فریاد کریں

مدت ہوئی کہ رسائی قسمت کو دو چکے — وہ سنگ در کہاں یہ ہماری جبیں کہاں

ساغر پہ آنکھ پڑ رہی ہے بزم غیر میں — کھل کھیلنے کو ہے نگہ سرمگیں کہاں

ڈولی ہے آنے کو پیمانہ میں آج اس — اب دیکھیں ڈھلتے ہے دم ایسیں کہاں

رام ہے دست یار میں یاد ہے لالہ زار — پھول آئے بہار میں کھل گئے ہیں

کس قدر گور غریباں کے ہوا فردہ چراغ — جس قدر زیر گرہ اور بجھے جاتے ہیں

فرط سبزہ کو ہوئی جاتی ہے لغزش — مستی [illegible] بہار جھما دیکھ رہے ہیں

دیکھا ہیں ہم نے ابھی دنیا کا بدلنا — بدلی ہوئی دنیائی ہوا دیکھ رہے ہیں

لشکر طور ہے جو موج ہے پیمانے میں — بجلیاں کوندتی ہیں آج بر [illegible] نہیں

الگ ہے خدا سے کچھ ساخت ان کی — یہ بت اور سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں

دل تو ہے کیونکہ کہیں [illegible] نہیں — سہے وہی محفل مگر اب گرم محفل نہیں

نوبت رائے نظر

تعارف:- لکھنؤ کے کالستھ علم و فضل میں فخر لکھنؤ میں ان میں ایسے ایسے ادیب و شاعر پیدا ہوئے جن کا مثل مشکل سے ملے گا ان میں ایک منشی نوبت رائے نظر بھی تھے یہ کالستھوں کے پرانے خاندان سے تھے ان کے آبا و اجداد سلاطین اودھ کے یہاں معزز عہدوں پر فائز تھے۔

منشی نوبت رائے نظر ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے اردو فارسی اور انگریزی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے شاعری کا ابتدا سے شوق تھا آغا مظہر لکھنؤی کے شاگرد تھے شاعروں میں لکھنؤ کے اساتذہ سے ٹکر لیتے تھے بڑے بڑے شعرا ان کے کمال کے معترف تھے ایک رسالہ خدنگ نظر بھی نکالتے تھے ۱۹۲۳ء میں انتقال ہوا۔ سہ

گردش دھر بھی ایک گردش پیمانہ ہے — ذرہ ذرہ میں ترا جلوہ مستانہ ہے

اک طبیعت کی اداسی کا اثر اتنا ہے — ساری دنیا نگہ یاس میں ویرانہ ہے

حالت محفل عشرت ہے رقص اسمیں — ایک رفتر کے برابر پر پیمانہ ہے

پر تو مہر کجا ذرہ ناچیز کجا — کیوں یہ دل حسرتی جلوہ جانانہ ہے

ترے ملنے کی وہ تقریب ہے جو یلوا — جس سے کہتا ہوں وہ کہتا ہوا افسانہ ہے

نظر اب چلا ہے کرنا چاہے آباد مرقد کو — بہت ہے منتظر اپنی زمیں گور غریباں کی

موت سے کیا ساد کر کہاں ہیں اس کے نظر — مدتیں گذریں سبب کھلتا نہیں تاخیر کا

یاس و ناکامی سے ہے حسن قلب مضطر ہوا — اب تو ملنا نہ ملنا سب برابر ہو گیا

وہ نگاہ سرمگیں ہو یا کسی کا انکسار — چمک کے جو مجھ سے ملا وہ ایک خنجر ہو گیا

اس سے بڑھ کر اور کیا ہے سادہ سی خو — آپ نے وعدہ کیا اور مجھ کو باور ہو گیا

خاک رہی کی جو مراد تھی تو آخر اے نظر — خاک میں ملنے کے قابل جسم لاغر ہو گیا

دل کی حالت نہیں سنبھلنے کی — اب یہ دنیا نہیں بدلنے کی
حسرتیں دل میں گھٹ رہی ہیں ہنوز — راہ نکلا نہ کچھ نکلنے کی
دلِ سوزاں کو شمع کیا کہیے — اُس کو حسرت کہاں ہے جلنے کی
ہم ہیں مجبورِ زندگی معذور — دم میں طاقت نہیں نکلنے کی
میں کہاں اور خیالِ دوست کہاں — ایک صورت ہے جی بہلنے کی
جل گئے ہم بھی صورتِ خرمن — انتہا یہ تھی ہاتھ ملنے کی

راحت کی جگہ گلشنِ امکاں نہیں دیکھا — کس گل کو ہرا سا تھا پدایاں نہیں دیکھا
ایسا خنکیِ جوشِ جنوں داد طلب ہے — جل نکلے ہیں گو ہم نے بیاباں نہیں دیکھا
میں بحر میں ڈوبی دلِ مایوس کی کشتی — انہیں کبھی بھٹکتے ہوئے طوفاں نہیں دیکھا
سینہ چاک گئی عشق پہ بھی دل کو ہوا اک ناز — ڈھونڈھا ہے جنونِ زر کا ور انہیں دیکھا
اک ہستیِ موہوم کی تعبیر عدم ہے — دنیا میں بجز خوابِ پریشاں نہیں دیکھا
جس رخ سے نقاب اس نے سرِ بزم اٹھا دی — پھر ہم نے کسی شمع کو سوزاں نہیں دیکھا
جتنی ہیں گھٹ سے ترے چشم پہ بلائیں — کھلتے ہوئے ہر سول درِ زنداں نہیں دیکھا
ہر سال نظر فصلِ جنوں آتی ہے لیکن — مدت سے تجھے چاکِ گریباں نہیں دیکھا

مدت سے ڈھونڈتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے — وہ اک سکونِ خاطر جو بیشتر نہیں ہے
دل تھا تو ہو رہا تھا احساسِ زندگی بھی — زندہ ہوں اب کدھر ہوں مجھ کو خبر نہیں ہے
آنکھیں بچھی ہیں بہت کچھ دم توڑتا ہے پی — اس آہ میں بھی جیسے پھول ہے یا اثر نہیں ہے
تاریک ہو گئی ہے دنیا مری نظر میں — پھر کوئی امتیازِ شام و سحر نہیں ہے
دنیا سے جا رہا ہوں کیا لے کے اے مقدر — زادِ سفر نہیں ہے رختِ سفر نہیں ہے

ہر قدم پر اک نالہ ہر نفس پر ایک آہ — زندگی کیا ایک شرحِ حسرتِ جذبہ
ہے کہ دنیا آتش ساماں ہے نظر — لیکن اپنے جام میں آنسو ہی ہیں

زندگی کی کشمکش سے کہ کہ باقی کچھ نہیں — اس سے پہلے اے نظر وسعت کبھی ایسی تھی

جب ہوں ناصحوں سے کیا پرسشِ آزار ہے — یہ محبت اک عداوت تھی زرے ہے
اب بھی آ جاتا ہے مجھ کو زندگی میں کچھ نہیں — تیز جاتا ہوں میں اپنی عمر کی لغزش ہے
کچھ ہوا ایسا نہیں واعظ کے سبز ذرے — زہر مل جاتا ہے لیکن تشنگی گوارا ہے
کثرتِ صحرا نوردی آ گئے بھی کہو یا — وہ جو اک سلطِ علش جاتا تھا یکبار
دل میں کتنا خون ہوتے تھے پھر آنا تھا اے خدا — کم نہیں ہوتی روانی ہر وہ جو نیا ہے
اب نہیں معلوم کیا دریا میں رنگِ بہار — اک زمانہ ہو گیا چھوٹے ہوئے ہو آ ہے
باغِ عالم میں سب بے رونق ہے سب نظر — سیرِ گلشن کی مگر دامن جا کیا ماتھ

جلیل حسن جلیل

تعارف: ۱۸۶۶ء میں مانکپور اودھ میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی ادیب اور محسن تھے ان کا ذوق شعری پروان چڑھا امیر مینائی کے شاگرد تھے ان کے بعد نظام حیدرآباد کے استاد ہوئے سنہ [illegible] میں انتقال ہوا۔

نغاں میں درد دعا میں اثر نہیں آتا
جو تم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا
شراب عشق کی مستی عجیب مستی ہے
گیا جو ہوش تو پھر عمر بھر نہیں آتا

رنگ گلاب کی کلی کا!
نقشہ ہے کسی کی کمسنی کا
منہ پھیر کے یوں ہنسی جوانی
یاد آگیا روٹھنا کسی کا
کچھ نہ جلیل کر سکا تو
مٹ جائے گا نام عاشقی کا

کوئی حسین ہو کبھی اک نگاہ کر لینا
جگر کو تھام کے ہلکے سے آہ کر لینا
نیاز مند ہوں کافی ہے اتنا کرنے کو
سلام جا کے انھیں گاہ گاہ کر لینا
کوئی ستم نہ سہنا نہ کوئی درد دل کہنا
اثر کرے نہ کرے تم کو آہ کر لینا

موسم گل میں عجب رنگ ہے میخانے کا
شیشہ جھکتا ہے کہ منہ چوم لے پیمانے کا
خوب انصاف تری انجمن ناز میں ہے!
شمع کا رنگ جمے خون ہو پروانے کا
میں سمجھتا ہوں تری عشوہ گری کو ساقی!
کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانے کا

جب تسمے عشق کا پھندہ مری گردن میں ہے
پھر برابر ہے قفس میں کہ نشیمن میں رہا
لوگ آرام کی خاطر ہے دنیا میں خراب
اور آرام چھپا گوشۂ مدفن میں رہا
چاک دامانِ یوسف تو کوئی بات نہ تھی
ہائے وہ چاک زلیخا کے جو دامن میں رہا
قیس و فرہاد کا پھرتے رہے بہروپ جلیل
یہی سودا تھا، یہی کھیل لڑکپن میں رہا!

دامن سے اب لپٹ کے رہے گا مرا غبار
اچھا کیا جو خاک میں تم نے ملا دیا
آتا نہیں خیال اب اپنا بھی اے جلیل
اک بے وفا کی یاد نے سب کچھ بھلا دیا

یار تک پہنچا دیا بے تابیٔ دل نے ہمیں
اک تڑپ میں منزلوں کا فاصلہ جاتا رہا

کہہ گیا شمع سے پروانہ کہ ممکن ہے
میں جلوں اور کلیجہ رہے ٹھنڈا تیرا

روئے رنگیں پہ پسینے کا عجب عالم ہے
آب و آتش کو بہم دست و گریباں دیکھا

وہ شوق بھرا دل تھا حقارت سے تڑپ اٹھا
ثابت نہ ہوا مجھ پہ ترا ناوک کا خطا کرنا

جاتے ہو خدا حافظ ہاں اتنی گزارش ہے
جب یاد ہم آجائیں ملنے کی دعا کرنا

بُرا نہ مانو اگر ذکر حور سن کے کہا
غرور تم نے کیا تھا قصور میں نے کیا
اب اس کو پردہ دری سمجھو یا کچھ اور سمجھو
تمہارے حسن کا چرچا ضرور میں نے کیا

رہا اسیر تو شکوے رہے اسیری کے
رہا ہوا تو مجھے غم ہوا رہائی کا

منتظر موسم گل کے ہیں نئے دیوانے
ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پر

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

یہ جو سر نیچے کیے بیٹھے ہیں
جان کتنوں کی لیے بیٹھے ہیں
واعظ چھیڑ نہ رندوں کو بہت
یہ سمجھ لو کہ پیے بیٹھے ہیں
دست وحشت کو خبر کر دے کوئی
ہم گریباں لیے بیٹھے ہیں

آج سنتے ہیں وہ اپنا مدعا کہنے کو ہیں
کون جانے دل میں کیا ہے منہ سے کیا کہنے کو ہیں
ان بتوں ہی نے کیا ساری خدائی کو تباہ؟
برہمن کیا ہم انہیں پیش خدا کہنے کو ہیں
ساری دنیا جانتی ہے جیسے حضرت ہیں جلیل
جان دیتے ہیں بتوں پر پارسا کہنے کو ہیں

رو آنکھ چرا کے جانے والے
ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں

مزے بیتابیوں کے آ رہے ہیں
وہ ہم کو ہم انھیں سمجھا رہے ہیں

نہ اشارہ نہ کنایہ نہ تبسم نہ کلام
پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں

لے کے پیمانہ میں چلتا ہوا میخانے کو / ایک پری تھی کہ لگا لے گئی دیوانے کو
کوئی ایسی بھی ہے صورت ترے صدقے ساقی / رکھ لوں دل میں اٹھا کر ترے پیمانے کو
دم زینت انھیں کیا جانئے کیا یاد آیا / آئینہ توڑ دیا پھینک دیا شانے کو
ہے سبق یاد دو عالم کی فراموشی کا / ہوش اتنا تو ہے اب تک ترے دیوانے کو

اب آنکھ چراتا ہے بلاتے ہوئے ساغر / رندوں کی نظر لگ گئی ساقی کی نظر کو
وعدہ رہا نہ یاد تو اتنا شعار کو / اب کیا جواب دوں نگہ انتظار کو

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی / کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی
آتے آتے ان کو آئے گا خیال / جاتے جاتے بے خیالی جائے گی
بے سبب اپنی جگر کاوی نہیں / عشق کی بنیاد ڈالی جائے گی
فصل گل آئی جنوں اچھلا جلیل / اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

بوئے لیلیٰ جو صبا لائی ہے / دشت مجنوں میں بہار آئی ہے
باغ ہستی سے بہت دور تھے ہم / تو کسی گل کی لگائی ہے
داغ جو تم نے دیا ہے مجھ کو / وہ چراغ شب تنہائی ہے

دل چرانے کی ادا خاص ہوا کرتی ہے! / دیکھ لیتے ہیں وہ دزدیدہ نظر سے پہلے
یار سے پردہ اٹھانے کو ابھی کیا کہئے! / ہوئے دامن تو جدا دیدۂ تر سے پہلے
شام غربت کا فسانہ نہ ابھی چھیڑ اے دل / پوچھ لوں حال وطن باد سحر سے پہلے
کہہ گیا آج وہ بیدرد گلے مل کے جلیل / ہم نہ واقف تھے ترے درد جگر سے پہلے

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے / فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے
جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے / جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

اچھا ہے وہ جو مجھ کو پھرا لائے ہیں در در / آگاہ کر رہے ہیں محبت کی راہ سے
سیر چمن کو آپ گئے تھے یہ گل کھلا / پھولوں میں آگ لگ گئی برق نگاہ سے

لکھنؤ کی شاعری کا چوتھا دور

علی نقی صفی

تعارف :۔ علی نقی نام صفی تخلص ۱۸۶۲ء (۱۲۷۸ھ) میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں تقریباً ۸۸ برس کی عمر میں انتقال ہوا ان کی شاعری کی عمر ۷۶ سال ہے حقیقت میں یہ دور سوم کے شاعر ہیں مگر ایک مدت تک بحیثیت شاعر کے نمودار نہیں ہوئے دور چہارم کے شعراء کے ساتھ نمایاں ہوئے اس لئے ہم نے ان کو دور چہارم میں رکھا ہے۔

تو بھی سایہ ہی سماتا ہے انداز میں سحر / جب تو یہ درد بھی تمہی آواز میں ہے

بزم ساقی میں ذرا ہشیار بیٹھیں آج ہم / کل بہت پہلو سے میرے شیشۂ دل گر گیا

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا / ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

بادل گھر آیا کھل گیا بیکی رو دی غنچہ ہنس پڑا / مرثیۂ عمر کی سحر کی شب کے افسانے ختم ہو

جام ہلکے ساتھ گردش میں مقدر آ گیا / آنکھ ساقی سے ملائی تھی کہ چکر آ گیا

گل کی آئینہ میں رخ کی جھریاں دکھلا کے / کارواں عمر رفتہ کے نشاں دکھلا گئے
زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے / آشیاں جلتا رہا ہم ناتواں دیکھا کئے

وہ اور کچھ نہ سہی لطف انتظار تو ہے / کہ غیر کو ترے وعدے کا اعتبار تو ہے

یہاں بات وہیں لکھی ہوئی تم نے کہا ہے / یہاں ایک گردش کو پیمانہ کہتا ہے ادھم نکلتا ہے
وہ عالم ہے کہ منہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے / شب فرقت کے غم جھیلے ہوئے دم نکلتا ہے

چوٹ کھائے ہوئے دل کو نہ خدارا چھیڑو / آ لگی تیر نہیں ہیں بھرے نے ہی تصویر کماں
پھر تو لیتے مفت گنہگار ہو گئے / اٹھ کے نہ جانے تھے کہ گرفتار ہو گئے

راہ عمل میں نفس دم لیتا رہا سرتر / رشتہ اک ذرا گا دیوانہ ساتھ ہم

یارب پڑی ہے میری میت اسی طرح
بیٹھے رہیں وہ زلف پریشاں کئے ہوئے

پھیری کا یہی یوں پلپلیا شب غم کہ شام ہی سے سحر ہوتی ہے
مگر نہ آنا تھا وہ نہ آئے ادھر کی دنیا ادھر ہوگئی

گلشن میں بہار آئے خزاں آئے بھی گیا
ہے ایک کلی دل کی وہ مرجھائی ہوئی ہے

سمجھ واعظ شگفتہ بیاں کیا سنئے
دل پریشاں کبھی نہ ہوتا ذرا پریشانی

اُف ری ناسازی دل گو کہ زمانہ تو ذرا
صدقے ابر کے ہی لحد دلربا ہوئی ادا

بے خطا کم ہوا ہے ہدف ناوک ظلم
ایک دعشہ ماکماں قدر انداز میں ہے

سبب کینہ سرکے بہشتی سا فراق الم کی ہی
ہزار چاہیں کہ ہم کہ بیٹھیں لیوانہ اسکا مگر

جو وہ حسن عالم آرا کہیں بے نقاب ہوتا
تو زمیں کا ذرہ ذرہ بھرا آفتاب ہوتا

رہی نشۂ جوانی ہے بلا سے زندگانی
جو شباب ہی نہ ہوتا کوئی کیوں خراب ہوتا

[illegible]
دلکش انداز کسی شوخ کی انگڑائی کا

دل جو ٹوٹا تو اک آنسو سر مژگاں نکلا
صبح محشر کا ستارہ وہ شب ہجراں نکلا

گل خدا جانے کہ بہار کی حالت کیا تھی
شب کو اس گھر سے جو نکلا وہ پریشاں نکلا

جب صبح شب وصل ہوا شام کا وعدہ
پھر ہوش مجھے صبح سے تا شام نہ آیا

دل چھوٹ گئے ہم سے حسرت منزل میں گیا
تنہا غریب وادی مشکل میں رہ گیا

سوئے رقیب کس نے کیا قصد نا تمام
درد اٹھتے اٹھتے آج مرے دل میں رہ گیا

نقطہ دل میں نہ تھی گنجائش نقش جمال
مشتق سے ذرے ہیں لیکن آفتاب آ ہی گیا

سنبھلے تو دیکھے کہ آگیا موسم بہار کا
اب کیا بھرے گا زخم دل بیقرار کا

نہ خوشگوار رنگ نہایت نظر فریب
پھیل تلخ ہے مگر چمن روزگار کا

ہوش و خرد کشمکش لذت و الم
یہ فلسفہ ہے زندگی مستعار کا

کمبخت بڑھ گئے روز قیامت سے ملگئی
دیکھا فریب تم نے شب انتظار کا

زندہ بچا کہ راہ طلب میں فنا ہوا
اک دل تھا وہ غریب جدا جا کیا ہوا

بے پردہ حسن ذات کا ہونا محال تھا
آئینہ صفات میں صورت نما ہوا

دنیا کے ساتھ ساتھ ہیں تیرے التفات
جو آج ہو رہا ہے وہی بارہا ہوا

زندانی حیات کو یہ کبھی خبر نہیں
بیچارہ کب اسیر ہوا کب رہا ہوا

دل سے نکل تنگ نوع میں کچھ نہ پیغام تھا
آمد و رفت نفس کا ورنہ پھر کیا کام تھا

کچھ نہ تھا خواب پریشاں تھا خیال خام تھا
زندگی سمجھے تھے جس کو موت کا پیغام تھا

اس عملا پر جیسے دوزخ میں جاتے ہیں
در فردوس کو سمجھتے ہے ترا گھر سمجھا

قامت یار ہو یا فتنۂ محشر ہو صفی
اپنی دانست میں دونوں کو برابر سمجھا

سنتا ہوں ذکر تنگی کنج مزار کا
کیونکر نبھے گا ساتھ دل بے قرار کا

مرے چھپانے سے کب سوز دل نہاں ہوگا
جہاں جلے گی کوئی شے دھواں ہوگا

یہ رنگ دو کہ وہ روٹھیں تو منائیں کیونکر
جن کی عادت ہے خوشامد سے خفا ہو جانا

اچھا ہوا کہ حشر کا ہنگام ہو گیا
دھڑکن سے روز روز کے آرام ہو گیا

دل اول شباب ہی سے مر کے رہ گیا
بے نور یہ چراغ سر شام ہو گیا

دل ٹوٹنے میں تھوڑی سی تکلیف تو ہوئی
لیکن تمام عمر کو آرام ہو گیا

گرانباری عصیاں کی مرا سر اٹھ نہیں سکتا
زمیں کہتی ہے جیسے اب یہ لنگر اٹھ نہیں سکتا

دل بیمار کیجھ تری نازک مزاجی کی
بتوں کا ناز کبھی اللہ اکبر اٹھ نہیں سکتے

تہ کیا غنچہ نے کس طرح قبائے گل
حیرت انگیز ہے داس کا گریباں کرنا

دل کو لائے تھے صفی کہ جلوہ گاہ ناز میں
پھر نہیں معلوم اسے لا کر وہاں کیا کر دیا

رفتہ رفتہ روح شاید پہنچ رہی ہے سوئے دوست
دے رہا ہے میرے ماتھے کا پسینہ کچھ داد

جگہ پیدا دلوں میں کی بتوں نے بے وفا ہوکر
خدا کو بھی ہوئی یہ بات حاصل کب خدا ہوکر

بہ چشم فتنہ گر کے تھی نظر دل سے اشارہ ہو کر
رہے کیونکر نگاہ شوق پابند حیا ہوکر

سینوں پڑے قوالِ الٰہی شکوہ بیداد پر — فیصلہ محشر میں ہو جائے اسی روداد پر
وہ جفائیں سادگی سے دیتا جنھیں بھولا ہو — آگئیں سب یاد ظالم کو مری فریاد پر

دمِ آخر کسی کا ہچکیاں لینا یہ کہتا ہے — کچھ آہیں دل میں شاید رہ گئیں تھیں ناتمام ہو کر
سوارِ کشتیِ طوفاں زدہ کے قلب سے پوچھو — خدا ہی یاد آتا ہے بلا میں مبتلا ہو کر

قفس میں گو دلِ بیتاب کو بہت تھا دکھ — مگر زباں سے نکل ہی گیا کہ ہائے بہار

صلا ہے چھیڑنے دیا تو نہیں غافل ہائے دو بالا کو — چلو زنجیرِ زنداں کی نا آئینہ ساماں کو

آہ وہ رات جو بسر نہ ہوئی — ہم تڑپتے رہے سحر نہ ہوئی
کیوں شبِ انتظار کیا ہوگا — اتفاقاً اگر سحر نہ ہوئی

زندگی مجھ شکستہ کی اسیرِ دام کی — یوں تو میری خیر ہے لیکن بڑے کام کی
محشر میں جا کے آخر کیا دادخواہ کر لے — کہتا کسی کی آخر جس کو گواہ کر لے

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا — ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

جو پیدا ہی نہ میں لندوہ جہاں ہوتا تو کیا ہوتا — ہوا تھا خلق اگر دل شادماں ہوتا تو کیا ہوتا
نہیں جب طاقتِ پرواز ہی دلخستہ بلبل میں — قفس جیسے کیا برا ہے آشیاں ہوتا تو کیا ہوتا
میں کچھ کہتا نہیں اس پر تو ناصح کا یہ عالم ہے — خدا جانے جو میرا رازداں ہوتا تو کیا ہوتا
وہی مجھ کو سلانے خاک میں آخر جو ملتا تھا — ہوا تھا بے نشاں لو بے نشاں ہوتا تو کیا ہوتا
جب اس نامہربانی پہ یہ عشقی یوں جاں جاتی ہے — خدا جانے جو وہ بت مہرباں ہوتا تو کیا ہوتا

جا کے جیتا زندہ مزاروں پہ چراغاں کرنا — ایک ٹوٹی ہوئی تربت بھی احسان کرنا
دیکھ لوں دور سے تصویرِ شبابِ رفتہ — مڑ کے ادھر بھی اے عمرِ گریزاں کرنا

جیسے ہی ہم نے لگائی لب پہ اک مہرِ سکوت — خود چراغِ زندگی خاموش گویا کر دیا
یوں کیا انساں کو زندانِ خلاف میں اسیر — ہر طرف سامانِ دلچسپی مہیا کر دیا

مرزا محمد ہادی عزیز

سنہ ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء) میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۹۳۵ء کو انتقال کیا قصیدہ اور مرثیہ دونوں خوب کہتے تھے اپنے فن پر نازاں تھے ۔

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

صاف سرخی سے کیا کس نے سرِ زرد جمال — اپنے عالم میں تم نے دیدۂ مخمور نہیں

انھیں جب قدر ہوگی اپنے حسنِ روز افزوں کی — اگر وہ سلسلہ سی میری تصویر دیکھیں گے

لذتِ درد رہی بعدِ فنا بھی دل میں — حصۂ عمر سے عشق کو کافی نہ ہوا !

دل نہ ہوتا جب بھی تیرا عشق ہوتا روح کو — اس گرہ نے اور اس شے کو محکم کر دیا

اشک گلرنگ بہا دیدۂ تر سے اکثر — بارہا فاش ہوا رازِ گلستاں ہم سے

کچھ اس میں مصلحتِ ذوقِ زندگی بھی تھی — عزیز وعدے کا اس کے جو اعتبار کیا

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا — وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا
اللہ اللہ یہ سلیقہ ترا اے جلوۂ طور — کس طرح تو نے چھپایا ہے نمایاں ہونا
عالمِ عشق کی فطرت میں خلل آتا ہے — مان لوں حضرتِ واعظ کا گر انساں ہونا
سرخ ڈورے تیری آنکھوں کے الٰہی توبہ — چاہیے تھا نہیں بیتو رگِ جاں ہونا
حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گزرے ہیں — میرا مرنا تری زلفوں کا پریشاں ہونا

ہجومِ شوق کا بس مختصر یہ قصہ ہے — کہ میں جو چاہتا ہوں وہ کہا نہیں جاتا

حسرت اے دل کہ گئی لذتِ درد — غیر کہتا ہوا فسانہ یاد آیا !!

سکوں امن کی دنیا کا سبب ہو آخر — کبھی تو نے دل کو کچھ اس طرح بیقرار کیا

دل کو جہاں سکون ہوا جسم سرد تھا — وہ لذتِ حیات تھی جب تک کہ درد تھا

گلہ کس سے جب اس کو اضطراب ہی پسند آیا — خدا ہی کو ازل سے شیوۂ بسمل پسند آیا

آگے خدا کو علم ہے کیا جانیں کیا ہوا — بس ان کے رُخ سی یاد ہے اٹھنا نقاب کا

کیا بتاؤں ابتدائے عشق کی مجبوریاں
لاکھ سمجھایا دل خانہ خراب آہی گیا

لکھ لیا سب قصہ بربادی عمر عزیز
کیا کلیجہ تھا ہمارے کاتب تقدیر کا

کیا آپ نے بھی ہجر کے بیمار کو دیکھا
سینے میں دعا مانگتے اغیار کو دیکھا

اب زندگی و موت تذبذب میں پڑی ہے
کیوں نزع کے وقت آپ نے بیمار کو دیکھا

اب پھینکئے یہ خون بھری ہے پھینکئے
کیا سوچتے ہیں آپ جو ہونا تھا ہو گیا

عشق کی مجبوریاں کیونکر کہیں کس سے کہیں
مختصر یہ ہے کہ جو ہم کو نہ کرنا تھا کیا

ذرے ذرے میں ہے تموج دونوں عالم مضطر
وہ بھی کیا تھا وقت جب عاشق کا دل بیتاب تھا

دل سے باتیں کرنیوالے کچھ خبر بھی ہے تجھے
تیرے ہر انداز کو چھپ کر کوئی دیکھا کیا

میں حشر کی حقیقت اتنی سمجھ رہا ہوں
دو دلوں جہاں ہوں گے ان کا شباب ہوگا

سینہ میں ایک جہنم آنکھوں میں ایک طوفاں
کیا جانتے تھے ہم کو جینا عذاب ہوگا

ہستی ذرہ دل میں دنیا لئے ہوئے ہے
یہ بھی کوئی نہیں سا خانہ خراب ہوگا

مجھ سے قاتل کی ندامت تو نہ دیکھی جائیگی
جی میں آتا ہے بتا دوں روز محشر کا ہوا

میں اور اپنی زیست سے مایوس ہو گیا
جب رو دیا مجھے کوئی غمخوار دیکھ کر

وعدہ کیا تھا پھر بھی نہ آئے مزار پر
ہم نے تو جان دی تھی اسی اعتبار پر

اٹھنے کو تیرے در سے اٹھا تو مگر نہ پوچھ
جو کچھ گذر گئی دل بے اختیار پر

کہا محاسب رحمت نے لیکے فرد حساب
یہ مشغلہ ہے شب ماہتاب کے قابل

شراب عشق سے چھلکا جو دل کہا میں نے
یہ جام تھا کسی مست شباب کے قابل

فضائے وسعت دنیا ہے تنگ آنکھوں میں
جگہ نہیں دل خانہ خراب کے قابل

آئے ہیں اس ادا سے ترے جلوہ زار میں
بجلی چمک رہی ہے دل بیقرار میں

ہر چند ضبط یا عشق اخفائے راز ہو
یہ بات اب نہیں ہے کسی اختیار میں

پھر حسن و عشق میں تھا کیا امتیاز کیا
ہوتا اگر یہ دل ہی کسی اختیار میں

کاش تری نصیحت بے جا بجا سہی
کیونکر دکھاؤں تجھ کو کلیجہ نکال کے

وادی عشق میں بہلاؤں کہاں دل اپنا
ہر طرف رونے کی آواز چلی آتی ہے

ہم کسی فکر میں وہ اپنی کہے جاتے ہیں
سچ ہے ناصح کو بھی کیا دردسری آتی ہے

سچ تو یہ ہے کہ جوانی میں کسے ہوش رہا
میں نے اپنا وہ زمانہ ہی کہاں دیکھا ہے

ان کو سوتے ہوئے دیکھا تھا دم صبح کبھی
کیا بتاؤں جو ان آنکھوں نے سماں دیکھا ہے

جس کے مرنے کی ہو خوشی تم کو
ایسی میت یہ کون روتا ہے

کوئی عالم میں سو نہیں سکتا
بجز یوں بھی کوئی سوتا ہے

بجلی چمک رہی تھی یہ تمہید امتحاں
پردہ سرک رہا تھا کہ بیہوش ہو گیا

کیا دیکھتا ہوں کون یہ بیٹھا ہے مہرباں
میں بے ہوش میں ہوں کہ بیہوش ہو گیا

ابر میں اور بجلیوں کی لہر میں کھوئی
بال بکھراتا ہوا انگڑائیاں لیتا ہوں

دنیا کو ولولۂ دل ناشاد سے ہوا
یہ طول اس خلاصۂ ایجاد سے ہوا

ہے یہ حقیقت عدم و عالم وجود
وہ خامشی ہے یہ مری فریاد سے ہوا

رحمت نے برائے سر شبنم کو کر دیا
کیا قصور یہ دل ناشاد سے ہوا

ناواقف رسوم محبت ہے کوئی چیز
انسان عزیز شیوۂ فریاد سے ہوا

لب تک اس کا نام آجاتا ہے اب بے اختیار
بات کرنا بھی اسی ڈر سے بہت کم کر دیا

ذرہ ذرہ خاک کا میری کہے گا داستاں
آپ سمجھے ختم میں نے قصۂ غم کر دیا

آپ کہتے تھے بنائیں گے خدائی ہم الگ
سینے میں دل نے وہ ساماں بھی فراہم کر دیا

دل کے اجزا میں نہیں ملتا کوئی جزو نشاط
اس صحیفہ سے کسی نے اک ورق کم کر دیا

کر دیا انکار ازل میں سب نے ہر دل کیا
وہ مری قسمت میں لکھا کاتب تقدیر نے

موت سے پہلے لکھا تھا میں آن کہ ایک خنک
کر دیا ہنگامہ اس حسرت بھری تحریر نے

دونوں ہاتھ اس نے ملا کر اس طرح انگڑائی کی
مار ڈالا کھینچ کے وہ مری بازو کا شمشیر نے

مجھ کو کافر ہی سمجھتے یہ خدا کے بندے — فاش اگر پردہ اسرار محبت کرتا
تیرا اندازہ رحمت جو بیاں کر دیتا — کوئی دنیا میں نہ پھر تیری عبادت کرتا

جتنی مصیبتیں تھیں وہ لکھ دیں کسی نے یہاں — بس ختم سعی کاتب تقدیر ہو گئی
دل کو جلا کے دولت جاوید پا گیا — اتنی سی بات مایہ اکسیر ہو گئی
اے سعی نامراد بتا کیا جواب دوں — تقدیر پوچھتی ہے کہ تدبیر ہو گئی
ہاتھوں سے میرے دامن رحمت چھڑا لیے — ہاں ہاں یہ جانتا ہوں کہ تقصیر ہو گئی

تیرا پرتو جو نہیں جلوہ فروز — ذرہ ذرہ میں چمک کیسی ہے

ہے طلسم تصور تو اب قدم اٹھیں — کہ ذرہ ذرہ پہ تصویر یار راہ میں ہے

اگر کوئی حالت بیمار فرقت ہو گئی ہوتی — اگر دم بھر نہ آتے تم قیامت ہو گئی ہوتی
سر محفل نگہ سرگرم تعلیم محبت ہے — یہاں ہوتے تو ناصح کو نصیحت ہو گئی ہوتی

مانا کہ کسی نے نہ کرو نگاہ میں کوئی بات — قیمتی ہے کہیں چاہنے والے کی نظر میں

یہی کہہ کہہ کے میں نے منزلوں کی ہمت افزائی — کہ اب آتا ہے اب دل اب یہ جانا جانا

وہ دل ایسا کون دل ہے کہ جسے قرار آئے — یہ جوانی اف جوانی کہ خدا کو پیار آئے

مرنا اور مر کے دیکھوں رنگ میں اپنی طبیعت کا — یہی تدبیر اب باقی ہے قسمت آزمائی کی

بزم میں یہ ادا ہمیں سمجھے ! — سب کو دیکھا ادھر نظر نہ ہوئی
ہم اسی زندگی پہ مرتے ہیں — جو یہاں چین سے بسر نہ ہوئی
دل نے دنیا نئی بنا ڈالی ! — اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی
ہجر کی رات کاٹنے والے — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

ہوتا نہیں ہے کوئی زمانہ میں کیا جواب — اللہ کوئی حد ہے تمہارے غرور کی بھی

دیار عشق میں اللہ رے بیکسی دل کی ہمدردی — ہر اک آنسو دل کے ساتھ تھوڑی دور تک آیا

دم توڑتا نہیں کوئی بیمار اس طرح — شاید شریک موت کسی کی ادا بھی ہے

کس قدر ہے نالہ میرا دلخراش — سننے والوں سے سنا جاتا نہیں
بجلی سی تھا ایک سامنے آ کر نکل گئی — کیا دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی

شوق دل بڑھ گیا ہے حد سے سوا — فاصلہ گھٹ گیا ہے منزل کا
جیتے ہیں کیسے ایسی مثالوں کو دیکھئے — پردہ اٹھا کے چاہنے والوں کو دیکھئے
اب بھی ہیں ایسے لوگ کہ جن سے ملے سبق — دل مردہ ہے تو زندہ مثالوں کو دیکھئے

بتا دوں کیا کہ میرے دل میں کیا ہے — سوا تیرے تیری محفل میں کیا ہے

نزع کا وقت ہے بیٹھا ہے سرہانے کوئی — وقت اب وہ ہے کہ مرنا ہمیں منظور نہیں
دل میں سو سو ہی بھی جو میرے روز ازل — ہے وہی شورش نظر صاعقہ طور نہیں
جہاد سر حق سے کیا کس نے سر نہ جھکا — اپنے عالم میں ترے دیدۂ مخمور نہیں

امید وار وصل کو ان کا جواب صاف — ایک تیر تھا جو توڑ کے پہلو نکل گیا

یاد ہے پہلے پہل بجلی گرانا یاد ہے — آپ کی جب مہربانی تھی دل ناشاد پہ

چمن کی سیر میں مقصود دل بستگی اپنی — خبر کیا تھی کہ ہر غنچہ کو ہم دلگیر دیکھیں گے
یہ مانا کاتب اعمال لکھ لیں گے مرقعے — مگر کچھ حال دل ناقابل تحریر دیکھیں گے
زمیں شق ہو فلک ٹوٹے پہاڑ آپس میں ٹکرائیں — مگر ہم آج زور نالۂ شبگیر دیکھیں گے

ذرے ذرے کو بنا دیگی کسی دن مشرق — مہر افروز تجلی ترے رخساروں کی !
آ کہ سامان تجلی کی کمی پوری ہو ! — بزم آراستہ ہے جھکے ہوئے تاروں کی

ساز دل کو عشق کی مضراب ہی کافی نہیں — آپ کی آواز اس پردہ سے آنا چاہیے

میرے دل میں کوئی ہمراز اور ہے — سن رہا ہوں ایک آواز اور ہے

شام فراق ذکر جوانی میں کٹ گئی — کیا رات تھی کہ ایک کہانی میں کٹ گئی

دیدار کا لطف اے دل بیتاب دیکھتا — ہر جلوہ مستانہ جہاں چین بجبین تھا
تھی آپ کے آنے کی تمنا ترے دل میں — مفہوم قیامت کا مگر ذہن نشین تھا

مرزا ذاکر حسین ثاقب

تعارف:- ۱۸۶۹ء کو آگرے میں پیدا ہوئے ۱۸۹۸ء سے لکھنؤ میں مستقل سکونت رہی وہیں ان کے ذوق شعری کی تکمیل ہوئی اور وہیں سنہ میں انتقال ہوا۔

بڑھائے حوصلے دریا دلی نے ساقی کی — ذرا سے جام میں سو بار آفتاب آیا
سنائیں کیا تمھیں نیرنگ عشق کا قصہ — تمام عمر نہ آنکھیں کھلیں نہ خواب آیا

یہ خندۂ طرب نما مبارک اہل دہر کو — بہت زمانہ ہو گیا کہ میں ہنسی کو رو چکا
نہ دم لے اے شریک غم تجھے قسم عشق کی — فلک کو چھوڑتا ہے کیوں اگر مجھے ڈبو چکا
رہے وہ دل میں مدتوں مگر سنبھل سکا نہ میں — مزاج حسن و عشق کو بہت دنوں سمجھ چکا
یہ آشیانہ ہمسم چمن میں ہو تو خوب ہے — یہ جی میں ہے کہ لے اڑوں قفس تو میرا ہو چکا

آئینہ جس میں سرا ڈوب گئے ابھر گیا حسن — ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا
حسن کے ہاتھ بندھے تو وہ ذرا دیر سہی — مجھ پہ احسان تری آئی ہوئی انگڑائی کا

جلوۂ حسن اک اشارے میں بہت کچھ کہہ گیا — میں نہیں سمجھا مگر ہاں دل تڑپ کر رہ گیا
اُن کی بزم ناز میں تو سانس بھی دل نے نہ لی — نالہ کش برسوں کا اک تصویر بن کر رہ گیا

عشق میں سہل تھی فرہاد کی تقلید مگر — یہ مری ہمت عالی کو گوارا نہ ہوا

مری قید کا دل شکن ماجرا تھا! — بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا
میں دنیا کو میخانہ سمجھا کہ اس میں — کوئی ہنس رہا تھا کوئی رو رہا تھا
شب غم کی تنہائیوں کو نہ پوچھو — جدھر دیکھتا تھا خدا ہی خدا تھا

مری داستان غم کو وہ غلط سمجھ رہے ہیں — کچھ انھیں کی بات بنتی اگر اعتبار ہوتا
کوئی بات ہے جو دل میں ترا تیر جم کے بیٹھا — نہیں تو ذرا سی جنبش میں جگر کے پار ہوتا
وہ حکایتیں جوانی کی میں سن رہا ہوں دل سے — جنھیں اور کوئی کہتا تو نہ اعتبار ہوتا

تجھے اوروں کی خاطر چھوڑ جاتا ہوں میں اے غیرت — مرے بعد آنے والوں کو مرا قصہ سنا دینا
مرا دل محرم اسرار حسن و عشق تھا ثاقب — ازل میں مصلحت تھا مجھ کو دیوانہ بنا دینا

بوئے گل کلیوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی — میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

متاع عشق کیا ہو دل کے بعد کیا سودا — کہ گم شدہ کا بھروسہ نہیں ملا نہ ملا

اُس کے سننے کے لئے جمع ہوا ہے محشر — رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی کا
تڑپوں تو راز کھولوں سنبھلوں تو عشق ناخوش — جس حال کو میں سمجھا اچھا وہی برا تھا
سلسلہ ذکر جنوں کا آج تک باقی ہے کیوں — ختم کب کا قصۂ جیب و گریباں ہو گیا
سیر عالم کے لئے کچھ چھوڑ دے اے دست جنوں — اب تو دامن کی جگہ میرا گریباں ہو گیا

مجھ کو یقین وعدۂ فردا ضرور تھا — مشکل یہ آپڑی تھی کہ دل ناصبور تھا

جو آنکھ ہو تو دیکھیے نہ پوچھیے کہ کیا کیا — چراغ بزم ہو گیا جلا کیا ہنسا کیا

کیا دیکھتا آثار سحر میں شب فرقت — وہ جوش پہ آنسو تھے کہ دل ڈوب رہا تھا

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں — ابر سیاہ جانب گلزار دیکھ کر!
کہتے ہیں دل لگی مری شام فراق کو — تنہائیوں ہی سہی مگر اک بار دیکھ کر

بیڑے ہوئے گل گلشن کو میں دیکھوں توبہ — ابھی ایسی تو نہیں قوت تسخیر بہار
میں تو میں گل بھی دیکھ جاتے مزاج میں مشغول — سب کو دیوانہ کئے دیتی ہے تاثیر بہار

کعبہ کدھر ہے شکر کا سجدہ ادا کروں — اللہ آپ آئے ہیں میرے مکان پر
میری طرح سے حال مرا ان کا خیر خواہ! — عاشق ہے اُن کی نیند مری داستان پر
آزار عشق سے کہیں گھبرا نہ جائے دل — آنے لگی ہیں یاس کی باتیں زبان پر
قابو میں دل نہ ہو تو غزل کیا کہے کوئی — فرمائشیں عذاب ہیں ثاقب کی جان پر

غنیمت ہے قفس فکر رہائی کیا کریں ہمدم — نہیں معلوم اب کیسی ہوا چلتی ہے گلشن میں
خدا آباد رکھے ہم صفیران گلستاں کو — جو کوئی پھول کھلتا ہے تو ہم کو یاد کرتے ہیں

عدو صیاد و گلچیں کیوں ہو میرے نشیمن کے
یہ تنکے بھی ہیں اس قابل جنہیں برباد کرتے ہیں

خود ان کا حسن میری داد خواہی ان سے کرتا ہے
وہ آئینہ لیے ہیں اور مجھ کو یاد کرتے ہیں

عشق میں دل گنوا کے حال یہ ہے
کچھ میں کھویا ہوا سا رہتا ہوں

پرسش حال اس نے کی تو مجھے
یہی کہتے بنا کہ اچھا ہوں

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

باغباں آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

آئینہ ہو جائے میرا عشق ان کے حسن کا
کیا مزا ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

کسی کا رنج دیکھو تو نہیں ہوتا کمر سے
نظر صیاد کی جھپکے تو کچھ کہہ دو عنادل سے

چلے اے ہجوم دل اساز طرب کی چھیڑ بھی
اگر دل بیٹھ جائے گا تو اٹھ جائیں گے محفل سے

امید و ناامیدی کا ہم ہو تاڑ ہی جانے
کہ جس میں کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہے ساحل سے

تڑپتے ہیں شب غم یوں کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا
بتا دے نامرادی کون سی باتیں کروں دل سے

غموں کے آ ہو ملے پر ہجر میں بھی زندگی تا
خلش بڑھتی ہی جو یہ کانٹے نکلے دل سے

مراد و نا شب فرقت تماشا گاہ عالم ہے
مگر ڈوبیں گے آخر کو یہ طوفاں تجھ پہ دل

کہیں چاند چھپا ہے داستاں کا زنگ محفل ہی
... سنتے ہیں سنتے جاں مالی ...

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

ہجوم تمنا سے گھٹتے تھے دل میں
جو میں روکتا بھی تو نالے نہ رکتے

لہو تھا تمنا کا آنسو نہیں تھے
بہائے نہ جاتے تو ہرگز نہ بہتے

نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی
ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

بتاتے ہیں آنسو کہ اب دل نہیں ہے
جو پانی نہ ہوتا تو دریا نہ بہتے

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا
زمانہ ہوا ہم کو چپ رہتے رہتے

فضل الحسن حسرت موہانی

تعارف: ۱۸۶۸ء میں موہان میں پیدا ہوئے ۱۹۵۱ء میں انتقال ہوا۔

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

اک نظر بھی تری کافی تھی پئے راحت جاں
کچھ بھی دشوار نہ تھا مجھ کو شکیبا کرنا

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت
ان سے مل کر بھی نہ اظہار تمنا کرنا

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

جان پر تم نے کبھی الزام لگایا نہ کبھی
یاس کو خوبیٔ تقدیر سے منسوب کیا

سمجھے محروم ادائے دل حسرت نے اگر
بے وفائی سے ترے جور کو منسوب کیا

شکوۂ غم ترے حضور کیا
ہم نے بے شک بڑا قصور کیا

درد دل کو تری تمنا نے
خوب سرمایۂ سرور کیا

یہ بھی اک چھیڑ ہے کہ قدرت نے
تم کو خود بیں ہمیں غیور کیا

آپ نے کیا کیا کہ حسرت سے
نہ ملے حسن کا غرور کیا

حسن شوخی ہے اک ہمیں سے حیا
اے فریب نگاہ یار یہ کیا!

اب وہ ملتے بھی ہیں تو یوں کہ کبھی
ہم سے کچھ واسطہ نہ تھا گویا

رہے محو خواب ہوس اہل ظاہر
گزر بھی گیا کاروان محبت

نہ سمجھا سوا حسن کے اور کوئی
بیان تمنا زبان محبت

سر عجز حسرت بھی خم کیوں نہ ہوتا
ترا ناز ہے حکمران محبت

بسکہ ترے حسن سے جلوۂ جانانہ آج
ہے سراپا آرزو ہر عاشق دیوانہ آج

یہ ہوا بے تابیوں پر لغزش مستانہ کا اثر
کہہ دیا سب ان سے حال شوق گستاخانہ آج

ہے فروغ بزم یکتائی جو وہ شمع جمال
آ گئی ہے دل میں بھی بیتابی پروانہ آج

میں ہی اب حسرت نہیں محوِ جمالِ یار، سب — پڑ رہی ہیں نگاہیں اُس پہ مشتاقانہ آج
نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے — شرابِ بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد اُنکی مہینوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
اب تو اُٹھتا ہے یہی جی میں کہ اے محوِ جفا — کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں
شکوۂ جور تقاضائے کرم عرضِ جفا — تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں
حال کھل جائیگا بے تابیٔ دل کا حسرت — بار بار آپ اُنھیں شوق سے دیکھا نہ کریں
تلطف کی اُن سے التجا نہ کریں ! — ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں
مل رہے گا جو اُن سے ملنا ہے — لب کو شرمندۂ دعا نہ کریں
صبر مشکل ہے آرزو بیکار — کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں
باقی نہیں اک تار بھی دامن میں جو حسرت — اب اہلِ جنوں فکرِ گریباں میں لگے ہیں
نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے — وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد — ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
اُمیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ — تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے
عرضِ کرم پہ ترکِ جفا بھی نہ کیجئے — ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجئے
اُس بے وفا سے مصلحتِ شوق ہے یہی — اپنے ستم کشی کا گلا بھی نہ کیجئے
منظور ہے جو ترکِ محبت ہی آپ کو — ہم پہ ہجومِ ناز و ادا بھی نہ کیجئے
حسرت یہ کیا ستم ہے کہ اک بت کے عشق میں — تو چاہتا ہے یادِ خدا بھی نہ کیجئے
نہ ملے نصیب جو ہو میرے حال کو بھی نصیب — وہ ابتری جو تری زلف کی شکن میں ہے
ادب کا ہے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات — سنے نہ کوئی مرے دلمیں یا دہن ہی میں رہے
آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن — آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

روکا جو بزمِ غیر سے اُٹھتے ہوئے اُنھیں — کہتے بنا نہ کچھ وہ قسم کھا کے رہ گئے
جامہ زیبی نہ پوچھئے اُن کی — جو بگڑنے میں بھی سنور جائے
شب وہی شب ہے دن وہی دن ہے — جو تری یاد میں گزر جائے
گریۂ شام سے تو کچھ نہ ہوا — اُن تک اب نالۂ سحر جائے
شعر در اصل ہے وہی حسرت — سنتے ہی دل میں جو اُتر جائے
یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے — دل ابھی بھولا نہیں آغازِ اُلفت کے مزے
حسن سے اپنے وہ غافل تھے میں اپنے عشق سے — اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے
صحبتیں لاکھوں ہی بیماریٔ غم پر نثار — جس میں اُٹھے بارہا اُنکی عیادت کے مزے
وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں — آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں
بے زبانی ترجمانِ شوق بےحد ہو تو ہو — ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں
مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عشرت کی — اب نظر کاہے کو آئینگی یہ تصویریں کہیں
التفاتِ یار تھا اک خواب آغازِ وفا — سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں
تیری بے صبری ہے حسرت خام کاری کی دلیل — گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں
پہلے آنکھیں ہوئیں گرویدہ پھر آنکھوں کی طرح — چاہنے دل بھی لگا آپ کو دیکھا دیکھی
کہیں وہ آکے مٹا دیں نہ انتظار کا لطف — کہیں قبول نہ ہو جائے التجا میری
خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا ہے — تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی
چل بھی دیئے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل — ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا
شرحِ بے مہریٔ احباب کہوں کیا حسرت — رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہنچا تھا
ملتے ہیں اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں — کیا آپ کی نگاہ سے میں آشنا نہیں
شاید وہ یاد کرتے ہیں مجھ کو کم اور بھی — تکلیفِ اضطراب کی شدت ہے آجکل
عہدِ یک عمرِ فراغت سے بھی خوشتر گزرا — وہ جو اک لحظہ تری یاد میں ہم پر گزرا

انور حسین آرزو

آرزو جوش طبیعت کو ہے آزادی پسند ۔ ہم نہ غالب کے مقلد ہیں نہ پیرو میر کے

تعارف: ۔ سنہ ۱۲۸۹ھ میں پیدا ہوئے سنہ میں کراچی میں انتقال ہوا۔ جلال کے شاگرد تھے۔ شاعری میں تو پایہ بلند تھا ہی زبان کے متعلق بھی انھوں نے ایسا کچھ لکھا ہے جو دوسرا نہ لکھ سکا کلام کا نمونہ یہ ہے۔

تابع شوق بھی ہیں ہم ان کے بھی ہیں اجارہ
سوچ کے خط میں کچھ لکھا آپ ہی خود مٹا دیا

اتنا بھی بار گلشن خاطر نہ ہو کوئی
ٹوٹی وہ شاخ جس پہ مرا آشیاں بنا

وحشت ہم اپنی بعد فنا چھوڑ جائیں گے
اب تم پھرو گے چاک گریباں کئے ہوئے

جوش جنوں میں اف تمہیں وحشی کا کھینچنا
بندھا ہے ہاتھ سے در زنداں لگے ہوئے

مجھے بس چھوڑ میرے حال پہ اے شرم رسوائی
وہ دامن چاک کر بیٹھا ہوں جس سے منہ چھپانا

زبان آرزو اور ماجرائے عشق کیا کہنا
فقط بے قدر ہے اس سے کہ جھگڑا ہی پرایا

کچھ بات کہی ہم نے نہ کچھ اس نے سنی ہے
چتون ہے کہ تلوار لئے سر پہ کھڑی ہے

رہنے دو بتی ہم اپنی کہہ چکے بس جل چکے دل ٹوٹ گیا
اب ہاتھ ملے سے ہو کیا ہے جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا

جس نے یہ حالت بنائی وہ بھی آج اے آرزو
چہرہ بیمار سے چادر ہٹا کر رو دیا

کہنے کی بات ہی نہیں آہ کہیں تو کیا کہیں
لب پہ ہے کس لئے سکوت بیٹھے ہیں جھکائے

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ ادھر سے ہوئی
شمع کا شعلہ جب لہرایا اڑ کے چلا پروانہ بھی

چونک اٹھی ہر اک دنیا چیخ اٹھا ہر اک عالم
گھبرا کے اکیلے میں جب اس کو پکارا ہے

اداسی بل تیوری یہ لایا بجا کہہ کے مسکرانا
شکایت اس طرح سن رہے ہیں کہ جیسے ان کو بھی

کچھ کہتے کہتے اشارے دے کر بتائے کسی کا رہ جانا
وہ میرا سمجھ کر کچھ کا کچھ کہنا نہ تھا جو سب کچھ کہہ جانا

موج اٹھے ڈوبی عمر کی کشتی
آج پایا نشان ساحل کا

عادی بلا کے قدرت آزار نے کیا
غم کی خلش کو دل کی تمنا بنا دیا

جو سینے میں دل ہے تو بار محبت
اٹھے یا نہ اٹھے اٹھانا پڑیگا

وحشت انگیزی میں یکرنگی گریباں گیر تھی
جتنے دیوانے تھے سب کا ایک ہی انداز تھا

ہم کو اتنا بھی رہائی کی خوشی میں نہیں ہوش
ٹوٹی زنجیر کہ خود پاؤں ہمارے ٹوٹے

بدلی کی چھاؤں سی ادھر آئی ادھر گئی
جھپکی پلک کہ ختم تھا موسم بہار کا

بڑے مزے کے تھے الزام گرچہ جھوٹے تھے
پھر آج ہاں کوئی ٹکڑا اسی فسانے کا

جیسی جس کی طینت ہوگی ویسا سب کو بتائیگا
داغی آئینہ جب دیکھو دھبا منہ پر آئیگا

رسوائی مزید کا امکاں نہیں رہا
ان دھجیوں کا نام گریباں نہیں رہا

شرح بربادئ دل مجھ سے نہ پوچھ
ہے ترا حسن سراپا موجود

ہے نگاہ باغباں میں آج بجلی کی چمک
ہم صفیرو اپنے اپنے آشیاں کو ہوشیار

آہنگ تھی یہ جوانی کی یا کوئی آندھی
ملا کے خاک میں ہم کو گئی بہار کہاں

ان کی بے جا بھی سنو آپ بجا بھی کہو
آخر انسان ہوں میں کبھی کوئی دیوانہ نہیں

کئی چاک ان کے ہاتھوں کے کچھ آنسو اپنی آنکھوں کے
دیا ہے جو مقدر نے لئے بیٹھا ہوں دامن میں

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

پردہ کی جنبشوں میں بھی لہریں تھیں حسن کی
جو دیکھنا تھا اہل نظر دیکھتے رہے

لپٹی ہوئی دستار کو بھی سر سے اڑی ہے
وہ گرد کہ جو اپنی ہی ٹھوکر سے اڑی ہے

افشائے راز کشان دفا امتحان صبر
آج ایک خامشی نے بڑے حق ادا کئے

اس انجمن میں کہ وسعت ہے جس کی نامحدود
نہیں پناہ کی جا ایک آشیاں کے لئے

تمہیں ذکر دفا پر آہ کرنا کیا ضرور
سادگی دیکھو کہ دل کا راز خود افشا کیا

ہر سانس ایک شعلہ ہے ہر شعلہ ایک برق
کیا تو نے مجھ کو اے تپش دل بنا دیا

اس شان عاجزی کے فدا جس نے آرزو
ہر ناز ہر غرور کے قابل بنا دیا

اشک دل راز کھلتا کیا خون آرزو کا
آنکھوں تک آتے آتے رنگ اڑ گیا لہو کا

آرزو صاحب کی خالص اُردو

رس ان آنکھوں کا ہی کہنے کو ذرا سا پانی
کتنے ہی ڈوب گئے پھر بھی ہے اتنا پانی

دل سے ٹپکا جو اُٹھا آنکھ سے ٹیکا پانی
آگ سے آج نکلتے ہوئے دیکھا پانی

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

اس ہی اُس جیون میں ہوا اور سیل ذرا سی بھی نہیں
مانگتا ہے کہیں ان آنکھوں کا مارا پانی

تڑپا جو کبھی جوت تمہارے جانے کی
چنچل بھی تھی کہ بجلی کا جتن اس نے لیا تھا

وہ آرزو اب تک تو کلیجہ پہ پڑا ہے
چمکا جو بھاتی ہوئی چتون نے دیا تھا

دیکھنے کو جو ان آنکھوں کے ترس جائیگا
جی تو اک پھول ہے کمھلا کے جھلس جائیگا

لگ سر کتا ہوا پھندا ہے بہت جا کا لگاؤ
وہ تو پیچ بیٹھے ہیں ڈالیں اور بھی کس جائیگا

جل سکے ہیں راکھ بھی ہو جائے تو کوئی نہ پوچھے
راکھ بھی آگ ہی ہے ہاتھ جھلس جائیگا

آزمانے سے تو دینے کی نہیں جی کی اُمنگ
پانی مرتا جو گڑھا ہوگا وہ دھنس جائیگا

سیکڑوں ڈوب گئے بوند چھلک کر نہ گری
باہر آنکھوں کے نہ ان آنکھوں کا رس جائیگا

دیکھ کر مجھ کو بناوٹ سے نہ لو ٹھنڈی سانس
بادل اُمڈا ہوا آیا ہے برس جائیگا

آرزو آنکھ نہیں اُس کے سمانے کی جگہ
دیکھنا دھیان جی آتے ہی وہ بس جائیگا

بناوٹ کو چاہت کے سانچے میں ڈھالا
بڑی چوٹ کھائی ارے مار ڈالا

کیا کیا ہوا کیا بنی بات بگڑی
جب آنسو کو روکا اٹھا ایک چھالا

دکھیں کیا پڑی ہے جو تلوار ڈھوئیں
لہو لال تھا اور دھبا ہے کالا

انھی کے نہ ملنے سے جی پر بنی ہے
یہ کاہے کو سمجھے مرا بھولا بھالا

لگاوٹ کی باتیں بناوٹ کی گھاتیں
اندھیرے نے پھانسا دکھا کر اجالا

جو رو دو تو ہنس دے جو چپ ہو تو چھیڑے
پڑا ہوگا کاہے کو ایسے سے پالا

آئینہ جو دیتے ہیں پہلے کہاں تھے
کسی نے نہ گرتے ہوئے کو سنبھالا

چھپ کی پھیرنے کو رُکے ہی گلے پر
مچلتی ہے یہ کہنا کہ جا اور بہلا لا

کبھی آتے ہی کس نے چپکے سے سسکی
بدلنے لگا کروٹیں مرنے والا

ہر اک بات ہے آرزو کیا انوکھی
کہے جا کہے جا ترا بول بالا

نہ سوچا نہ سمجھا نہ دیکھا نہ بھالا
جیو تم کہ چاہا جسے مار ڈالا

اب ایسے نہ بیٹھے ہم کو چھیڑ کے تو ر دو دیں
بہا ہے کوئی کلیجے کا چھالا

یہ آنکھ اپنا ساون ہے وہ آنکھ بھادوں
نیا ڈھب ہے آنسو کی پانی کا جالا

جو کہتا وہ سنتے جو سنتے وہ کہتے
مرے بانکپن نے مجھے مار ڈالا

نہیں اور نہ بولیں وہیں اور نہ ہیکڑ
ذرا سی جھجک نے بڑا بوجھ ڈالا

نہ جھوٹ اس کو جانو کہ مرنا ہے ہم کو
بدل لی جو کروٹ لیا ہے سنبھالا

ملاؤں نہ رو آنسوؤں کی لڑی سے
ادھر لا ادھر لا یہ موتی کی مالا

اس اندھیر نگری میں ہیں تو نہ ڈھونڈو
جو کچھ ہے سو اپنی سمجھ کا اجالا

جسے آرزو کوئی تاک نہ چھوٹے
تجھے راج گدی ہے وہ مرگ چھالا

باتوں میں الجھا لینا اور سہج بھی نہ دکھلانا
ان سے ملکر دل جاتا ہے دیکھے ہی بہلانا

ہونٹوں پہ ہنسی جب ہے آنکھوں میں ہیں کیوں آنسو
بہلانے کو بیٹھے ہو آتا نہیں بہلانا

اور بدلی ہوئی چتون بھولا ہے نہ بھولیگا
ہنستے ہوئے وہ آنا روٹھے ہوئے وہ جانا

کام اپنا چھری اپنی ہاتھ اپنا گلا اپنا
آنکھوں کا پھیر لینا اور میرا سمجھ جانا

ان بھولوں میں ایل ہیں کس کو ندی نکلی ہے
تھرا کے یہ دھمکانا دھمکا کے یہ تھرانا

سر کھپ رہا پرسیر سے آتی ہے ہنسی انکو
اک چوٹ تو کھا بیٹھا آتا نہیں جتلانا

بیڑا ہو پار کیا بھلا با ناؤ تھا اس اسرار
کھول کے تلوے چلے دھار پہ آگے جو دلانا

اے آرزو اتنا بھی کہنے نہیں بن پڑتا
آئے ہو تو تھم جاؤ، میں جالوں تو پھر جانا

برج نرائن چکبست

تعارف :- کشمیری پنڈت برہمن تھے اور چکبست ہی تخلص تھا لکھنؤ کے قدیمی باشندے تھے ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں چوالیس برس کے سن میں انتقال ہوا۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا

ادب کیا ہے تمنائے وفا میں مرنا
دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

اگر درد محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

درد الفت آدمی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں ہو گئے

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی نظروں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

ابھرنے ہی نہیں دیتی ہمیں بے مائیگی دل کی
نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

محبت ہے مجھے کوئل کے درد انگیز نالوں سے
چمن میں جا کے میں پھولوں کا شیدا ہو نہیں سکتا

نئی تہذیب کے صدقے تھے رشتے نباہے دل لگی
رہے منطق کے پردے میں ستم بے حیائی کے

ہوس جینے کی ہے یوں عمر کے بیکار کٹنے پر
جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہو نہ سکا ہوتا

اہل ہمت منزل مقصود تک بھی آ گئے
بندۂ تقدیر قسمت سے گلا کرتے رہے

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انساں سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آساں اس جینے سے مر جانا

جہاں میں ہوش کے یوں قائم ہوا اپنی پریشانی پر
کہ جیسے عکس گل رہتا ہے آب جوئے گلشن پر

کشاکش ہے امید و یاس کی یہ زندگی
اپنی ایسی ہستی سے تو اچھا تھا عدم میرا

چلتی ہے اس چمن میں ہوا انقلاب کی
شبنم کو آئے دامن گل میں قرار کیا

رنگ گل جہاں میں پردہ خاک چمن میں ہے
تازہ کرے گی ان کو ہوائے بہار کیا

بلائے جاں ہیں یہ تسبیح اور زنار کے پھندے
دل حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں

اذاں دیتے ہیں بت خانہ میں جا کر شان مومن سے
حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بیکار ہے
رنگ ہندو دیکھ کر طرز مسلماں دیکھ کر

دل میں اس طرح سے ارمان آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

میرے احباب پیش آتے ہیں مجھ سے بے وفائی سے
وفاداری میں شاید کر رہے ہیں امتحاں میرا

دوست مرنے پہ مرے داد وفا دیتے ہیں
ہائے کس وقت محبت کا صلہ دیتے ہیں

دشمنوں سے بھی مجھے ترک وفا مشکل ہے
دوست بن کر مجھے محبت و دغا دیتے ہیں

جس نے دل پیدا کیا اس سے شکایت ہے یہ
دل سے جو پیدا ہوئی وہ آرزو بیتاب ہے

ہمارے اور واعظ کے مذہب میں فرق اگر ہے
کہیں گے ہم جس کو پاس انساں وہ کہتے ہیں خوف خدا

خود پرستی مٹ گئی قدر محبت بڑھ گئی
ماتم احباب ہے تعلیم روحانی مجھے

ہائے اس دنیا کی پابندی عجب تدبیر ہے
خود بنتا ہے جسے انساں یہ وہ زنجیر ہے

دیکھا سرور بادۂ ہستی کا خاتمہ
اب دیکھیں رنگ لائے اجل کا خمار کیا

رنج و درد کا سبب دنیا میں کچھ پایا نہیں
حشر میں ہم صاف کہدیں گے خدا کے سامنے

مزا شباب میں ہے سر سے خوں بہانے کا
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

اعمال کا طلسم ہے نیرنگ زندگی
تقدیر کیا ہے گردش لیل و نہار کیا

دفتر حسن پہ مہر ید قدرت سمجھو
پھول کا خاک کے تودے پہ نمایاں ہونا

عروس جاں نیا پیراہن ہستی کا پہنتی ہے
فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گزر جانا

اپنا ہی دم ہوا ہے گلو گیر وقت نزع
غیر دل کا زندگی میں ہو پھر اعتبار کیا

جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح
اس کے لیے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

محفل میں خاک بادہ پرستوں کا جی لگے
وقتے نظر میں صحبت پیر مغاں نہیں

اپنا مقام شاخ بریدہ ہے باغ میں
گل ہیں مگر ستائے ہوئے باد فنا کے ہیں

اک سلسلہ ہوس کا ہے انساں کی زندگی
اس ایک مشت خاک کو غم دو جہاں کے ہیں

لکھنؤ کی شاعری کا آخری دور

تعارف:- مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنؤ کے معزز اطباء کے خاندان سے شرافت تہذیب کا معیار اور حسن اخلاق کا پتلا تھے عزیز لکھنوی کے شاگرد اور خود لکھنؤ کے بڑے اساتذہ میں تھے۔

جن خیالات سے ہو جاتی ہے وحشت دونی　　کچھ انھیں سے دل دیوانہ بہلتے دیکھا
کیا حسرت دیدار ہے ہر بار یہ سمجھا　　گویا کبھی دیدار میسر ہوا تھا
پوچھا اثر سے کسی نے جو دل کا معاملہ　　اک آہ سرد کھینچ کے خاموش ہو گیا
جو سانس سے رکی ہے تو آنکھوں سے آ گئی ہے　　چھیڑا یہ آج کس نے افسانہ بے خودی کا
وہ گزرا ادھر سے جو بیگانہ وار　　جیسے چراغ سحر جھلملانے لگا
انہیں وفا نہ انہیں جفاؤں کا ہوش تھا　　کیا دن تھے جبکہ دل میں محبت کا جوش تھا
لے لیا دل مڑ کے نہ دیکھا ادھر　　جاؤ تمہارا ہی بھلا ہو گیا
صیاد نے چھوڑا وہیں آشیانہ گلشن　　جب قصد اسیروں نے کیا ترک قفس کا
کوئی موسم ہو سماں ہو کہ تغیر ہو کوئی　　تم کو جب دیکھ لیا وقت زیارت ہوا
تم نے پوچھا اس طرح حال دل شاعر زار　　یاد اب کچھ بھی نہیں اب تک جو کہنا یاد تھا
کبھی نصیب مائل پرسش ہوا جب ہو سکے　　جو میرا مدعا تھا مجھی پر عیاں نہ تھا
یہ اتفاق تو دیکھو بہار جب آئی　　بہار سے جوش جنوں کا دیوانہ تھا
ہنسا میں کچھ ڈھال ایسے کہ خود پھیل جاتا ہے　　قفس میں یاد جب آتا ہے میرا آشیانہ تو
میں اب سمجھنے کو دل کو سمجھاؤں یا نہ　　نظر آتا ہے کیسوں سے کسی کا آستاں ہو کر
ہم نے رو رو کے بات کہی　　آنسوؤں پہ یہ رنگ تب آیا
فریاد کا شکوہ کوئی نہیں مجھے کیا سہارا کوئی نہیں　　کچھ دیکھ لیا اس دنیا میں کچھ حشر میں دیکھا جائے گا

ہمیں نے کہا کچھ نہیں لے لے قسم ہم نہیں　　آپ ہی کچھ زیر لب کہہ کے خفا ہو گیا
چمن سے ہم شاخ گل ہے آشیاں ہے پھر ہو کچھ بھی　　غضب ہے طائر آزاد کا بے بال و پر ہونا
کبھی رشک نے اب مجھے نہ دیا کہ بے وفا کہوں　　وہ کسی سے وعدہ کرتا مجھے اعتبار ہوتا
اب یہ سودا ہے کہ حاصل ہوش میں آئے کیا　　کہہ دیا اُن مدبھری آنکھوں نے دیوانے کیا
چہرے کا رنگ دیکھیے آئینے میں اثر　　کہنے چلے ہیں درد دل اس بے وفا سے آپ
بھولے سے ڈالے سے کوئی پوچھتا　　میں کیسے دل سے بھلا دوں کس طرح
آہ کس سے کہیں کہ ہم کیا ہیں　　سب یہی دیکھتے ہیں کیا ہیں ہم
حسرت کہیں فرصت ہی نہیں ہے ورنہ کیا کیا تھی　　حال ہمارا کچھ سن لیتے کچھ حال اپنا کہتے
ورنہ کیا کیا شے ہے آخر دل کو اثر سمجھانا تھا　　در سے کسی کے اک بار اٹھ کے کاش نہ جانا تھا
اس سے کچھ نہ مطلب پوچھا گر آخر کیسے ہو　　بے خودی کا ہو برا کہہ آیا کچھ یاد نہیں
محبت اور اظہار محبت　　یہی تو بات ہے دیوانے پن کی
وہ آئے ہوا تھا اٹھ گئے کہ کیسے خفا ہو　　میں اب تک یہ سمجھا ہوں کہ بیمار سے بیٹھے ہیں
کبھی تھا پاس محبت اب یہ حسرت ہے　　کسی کو راز داں کر لیں کسی کو محرم آزار
مجھے ہیں حال اثر نہیں سمجھا جاتا　　کوئی حیلہ یہ کہ یا ستم ہو کہ نہ ہو
نظر ہے زمیں پہ گرفتہ دامن ہاتھوں میں　　معاذ اللہ کوئی کیا کہے ایسے حیا والے کو
دل وہی دل ہے کہ جس کا زندگی ہو حاصل　　تم وہی غم ہے کہ تم سے ہی مسیحائی نہ ہو
ایسی شورش کوئی لے دیدہ تر ہو جائے　　دل یہ جو گر گئے دیکھیے اس کی خبر ہو جائے
آستاں تو نہ اداس ہیں قسمت ہیں　　اک اک سجدہ میں سر ہو کر رہ جائے
کچھ کلام ہی سہی رشک سے مر جاتے ہیں　　کیوں کہیں بات بات پر کچھ بھلا نام
پھر تمہیں فرصت ہو میری آپ میں نہ رہا　　یہ بتاتے جاؤ میرے حق میں کیا تقدیر ہے
دیکھو نہ آنکھ بھر کے کسی کی طرف کبھی　　تم کو خبر نہیں جو تمہاری نظر میں ہے

جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں ٹانکے پھول ترے بستر کے
تم ابھی کچھ تھے ابھی ہو کچھ اور دیکھ لینے دو ذرا جی بھر کے

ہنگامۂ ہستی کی بس اتنی حقیقت ہے اک موج اٹھی ہے اٹھ کر پھر مل گئی دریا سے

بسمل گہِ نیاز میں وہ بھی گناہ ہے اک جنبش لب شوخ تمنا کہیں جسے

سخن ناآشنا رکھا کسی کی بزم میں مجھ کو کبھی تہذیب مجلس نے کبھی ترتیب محفل نے

وہ میں نہیں رہا ہوں وہ دل ہی رہا ہے کیوں چھیڑئے گا دو نالے اختیار آئے

شکوے تھے صرف لذت گفتار کے لیے مت جاؤ روٹھتے نہیں بیمار کے لیے
آنا ہے ایک رنگ تو جانا ہے ایک رنگ تو آئے تھے وہ پرسش بیمار کے لیے

وہ ہیں نادم کہ ہم بے وفا خدا جانے خیال ستم ہے اور ان کی آمد آمد ہے

ایک سجدے سے زیادہ عشق میں جائز نہیں ورنہ آلودہ جبیں بندگی ہو جائے گی

اس قدر بے اعتباری پر ہے اتنا اعتماد ہو نہ ہو تیرے دعا سے میں عجب تاثیر ہے

اک روز دل میں تیری محبت تھی جاگزیں اب تو ہی تو ہے تیری محبت نہیں سہی
میں کیا سناؤں درد محبت کا ماجرا حد ہو گئی کہ تم سے شکایت نہیں رہی

وہ بدگماں ہیں میری خموشی سے اور میں مرتا ہوں حرف شوق مکرر لیے ہوئے

اچھا ہوا غش کھا کے گرے حضرت موسیٰ اب ہوش میں رہنے کا تو الزام نہیں ہے

ہوش رہتا ہے نہ تنا دم تحریک جنوں جیسے چھینے لیے جاتا ہے گریباں کوئی

خاکستر پروانہ میں بھی آگ دبی ہے اے باد صبا دیکھ کے دامن کو ہوا دے

کچھ ہوش میں آنے کی مرے شکل نہ ناصح یہ میں بھی سمجھتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے

آیا تھا کچھ خیال کہ دنیا بدل گئی کیا سترہ سے شیاطین دنیا کر سکے کوئی

یہ حال ہے کہ کچھ نہیں آتا نظر مجھے اے منتظر دید اب نہ پھیر ادھر بلا مجھے

قاصد پیام ان کا نہ کچھ دیر بھی سنا رہنے دے محو لذت ذوق خبر مجھے

کلب احمد مانی جائسی

مولانا کلب جعفر صاحب کے فرزند اکبر خان بہادر کلب عباس صاحب کے برادر حقیقی تھے، بیاسی برس کی عمر ہوئی اور لکھنؤ میں زیادہ قیام رہا۔ اپنے زمانے کے صاحب طرز شاعر تھے، زمانے نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ۱۸۸۰ء ولادت اور ۱۹۶۲ء میں وفات ہوئی۔

جھکے مایوس کسی کو پکارے کوئی خود ترے پاس آ گیا امید میں سمجھا کوئی
مل تو جاتی ہے مرے نالۂ خاموش کی داد دل تک آواز تو جاتی ہے بتاتا ہے کوئی
التفات نگہ دوست میسر نہ ہوا زندگی یوں ہی رہی بے کیف گزارے کوئی
متصل یاد کیا حسن میں ہر عرض نیاز سمجھے اس ناز سے مسلسل کیا شکایت کوئی
آج ہے قہر کا طوفان لب ساحل آئی شاید آ لگے کو ہو ناؤ کنارے کوئی

ہر ادا آپ کی بھی پیام کرم یہ قصور نظر نہ سمجھے ہم!
موت تھی نامرادی پیہم جی رہا ہوں بہ اعتقاد کرم
کون محفوظ ہے لغزش سے نہ یہ عالم نہ دوسرا عالم
سہنے تو آئے ہو سنہ ہزار احساں دیکھنا شان احتیاط کرم
رنج و راحت سب اعتباری ہیں ہم جہاں خوش ہیں تم وہاں پر غم
دل ہے تفصیل کے لیے بے تاب تو نے کیسی نگاہ کی مبہم
دور پریشانی میں سہارا گر نہ تھا کوئی بیم یار اس سے امید کرم

امیدیں جو جہاں کا سیہ آگے دلوں میں پلتی ہیں دیکھتی ہیں پامال ہونے کو مچلتی ہیں
محبت ہو کہ حسن اک کوزہ گیاں کا زرنما ہے نہیں معلوم پھر پروانے سے شمعیں کیوں جلتی ہیں
وفا تو اندیشہ ہے دوستی یا دشمنی کیسی جہاں جا کر نگاہیں نامرادی پا ہی لیتی ہیں
نگاہ منتظر آخر نگاہ واپسیں ٹھہری محبت میں تمنائیں بھی کیا شکلیں بدلتی ہیں
وہ تربت آ گیا ناکامی پیہم سے اٹھائی مرادیں خندہ زن ہیں دل پہ گویا تیر چلتی ہیں

دنیا میں کشمکش کی کوئی انتہا بھی ہے
جبر مقدرات بھی قید وفا بھی ہے

کیسا ہر اک شورش طوفاں ہے ناخدا
تو ہی نہیں محافظ کشتی خدا بھی ہے

چھوڑا رہ طلب میں جو امید نے تو کیا
میرا رفیق اک دل بے مدعا بھی ہے

ساقی ادھر نگاہ تو کر جام دے نہ دے
اس تیری بزم عیش میں اک بے نوا بھی ہے

کچھ تو ازل سے درد محبت میں لطف تھا
کچھ کارسازی دل درد آشنا بھی ہے

کیا شان کردگار ہے ضدیں ہیں جمع بھی
عشق ایک درد زیست بھی اور دوا بھی ہے

تسکین یاس میں ہے کہ یاس ہی کہاں
ماتی ابھی تو حشر کا اک آسرا بھی ہے

دعوائے عاشقی بھی ہے لب پہ گلا بھی ہے
حالانکہ شرط عشق و محبت وفا بھی ہے

تقدیر نارسا کہ دل مبتلا بھی ہے
شکر خدا لب گلہ نا آشنا بھی ہے

آسانیاں کہاں رہ پرخار عشق میں
رہرو کا یار دوش اگر مدعا بھی ہے

پاؤں گا داد غم یہ فقط آس ہی نہیں
دل کو یقین وعدہ صبر آزما بھی ہے

اک میرا آشیاں نہیں باغ ہے وہی
گل بھی ہیں بوئے گل بھی روش بھی صبا بھی ہے

تفریح کے لیے کہوں کیا داستان غم
کچھ تم کو درد دل سے ذرا اعتنا بھی ہے

چاہے یہ بے یقین حد منزل ہوں گا مگر
لیکن کہ مدعا بھی نہیں ہے دعا بھی ہے

دشوار ہے کہ سہل یہی ایک راہ ہے
دنیا میں زندگی کے سوا راستا بھی ہے

ڈر اور امتحاں ترا ماتی یہ وہم کیوں
بزم وفا میں کوئی تجھے پوچھتا بھی ہے

مے سے تو یہ حرام ہے اب تک
دست ساقی میں جام ہے اب تک

موت کیا ختم کر سکی قصہ غم
داستاں ناتمام ہے اب تک

کس کا اک حرف تھا وہ صبح ازل
وہی زور کلام ہے اب تک

واعظا چپ بھی رہ کے دیکھ مرے
پھر ترا احترام ہے اب تک

پہلے سا حسن کی روش پہ عشق
شور محشر حرام ہے اب تک

جلوہ یونہی رہے گا نا محدود !
جس طرح ناتمام ہے اب تک

ابھی کافر نہ کہیے ماتی کو !
قصد بیت الحرام ہے اب تک

جنوں نصیب تو کوئی دوا ہوش کی نہ ملی
وہ بے خودی بھی گئی اور آگہی نہ ملی

کجا وہ خلوت راز انتہائے راہ نیاز
سرے سے ہم کو تو راہ نیاز ہی نہ ملی

تو کیا ہوا جو کبھی زیست وقت غم نہ کٹی
جوان کار غم ہے وہ فسردگی نہ ملی

ہزار سادہ کھولے ہیں بے نوائی نے
وفا کے رنگ میں تعبیر آدمی نہ ملی

سوائے عظمت آفاق کیا ہے اس کے لیے
جسے تمہاری تمنا سے روشنی نہ ملی

کچھ اپنے بس میں ہے قید وجود سے چھٹنا
ہمیں تو سعی سے راہ فرار بھی نہ ملی

رہ حیات میں کافی سمجھ رفاقت غم
خوشی کا ذکر ہی کیا ہے ملی ملی نہ ملی

کبھی ادا نہ ہوئے ہم سے آستاں کے حقوق
جبیں ملی بھی تو شایان بندگی نہ ملی

بدامان حقیقی یہ خم ہے سر ماتی
جہاں میں اور کہیں جائے عاجزی نہ ملی

حاصل نہیں یاس وہ تجھے ہیں ان دنوں
ہر اوج ماسوا سے دل دیکھا ہوں ان دنوں

منزل کے پاس عشق جو لایا ہے ان دنوں
دل میں بھی عزم ترک تمنا ہے ان دنوں

تکلیف ضبط راز گئی ساتھ ہوش کے
الفت جنوں کی شکل میں رسوا ہے ان دنوں

دیوانہ ہوں خزاں میں بھی آ دیکھ او بہار
یعنی ترا جنوں تماشا ہے ان دنوں

یہ غم ہے جس جہاں میں وہیں عشق بھی تو ہے
دام فریب یہ نظر آیا ہے ان دنوں

امید اب تو ہے کہ بھر آئے گا زخم دل
توفیق شکر صرف مداوا ہے ان دنوں

ماتی جو وقت بیت گیا اس کو بھول جا
یہ بھی تو وقت ہے جو گزرتا ہے ان دنوں

محویت یہ ہو کہ پھر ہوش میں آ ہی نہ سکوں
سر ترے در پہ جھکا دوں تو اٹھا ہی نہ سکوں

غم کو انداز تبسم میں دکھا ہی نہ سکوں
یہ تو شکوہ نہیں لب تک جسے لا ہی نہ سکوں

سجدے کرتے ہیں مجھے ورنہ ترا نقش قدم
نقش تقدیر نہیں ہے کہ مٹا ہی نہ سکوں

لکھنؤ کی غزل کا ایک اور طرز

(سلام)

لکھنؤ میں غزل کی ایک قسم سلام بھی ہے میر انیس نے اپنے نواسے رشید صاحب سے کہا تھا کہ ہماری غزل ہمارا سلام ہے۔

محمد جعفر صاحب اُمید نے غزل میں جو اصلاح تجویز کی تھی یعنی رندی و شاہد پرستی کے مضامین واعظ ناصح کی تضحیک، آب حیات حضرت خضر کی عمر حضرت عیسیٰ کا معجزہ، حضرت یوسف کے حسن کی تخفیف سے اجتناب، معشوق کو حالت ہلاکت میں دکھانا اسی کو حالی نے اپنے نام سے مقدمہ شعر و شاعری میں اصلاح غزل کے عنوان سے پیش کیا تھا مگر وہ دونوں اس رنگ میں اچھے شعر نہ کہہ سکے اور یہ اصلاح مردود و متروک ہوگئی مرثیہ گویوں نے اسے معراج کمال تک پہنچایا انھوں نے سلام کو غزل بنالیا۔ ابتدا میں سلام کی وضع یہ تھی کہ مطلع میں لفظ سلام یا السلام سے شروع ہوتا اور مقطع تک فضائل و مصائب کی فضا قائم رہتی تھی مرثیہ کی ترقی کے ساتھ سلام کو بھی ترقی ہوئی مطلع میں سلامی یا سلام شاذ رہ گیا اور غزل کے مضامین سوائے رندی و اوباشی کے داخل کر دیئے دو ایک شعر واقعہ کربلا کے متعلق ضرور ہوتے تھے اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ ہر شاعر غزل سے اپنی شاعری کی ابتدا کرتا ہے۔

جو شاعر غزل اور مرثیہ دونوں کہتے رہے انھیں چھوڑ کر جن شعراء نے غزل ترک کر دی انھوں نے اپنی غزلوں کو سلام بنالیا۔ غزل کے سنجیدہ شعر سلام میں آگئے جس طرح امید اور حالی چاہتے تھے مثال میں میر انیس کو دیکھیے ان کی غزل ہے:۔

اشارے کیا نگہ ناز دلربا کے چلے
جب ان کے تیر چلے نیمچے قضا کے چلے

پکارے کہتی تھی حسرت سے نعش عاشق کی
صنم کہاں ہمیں تم خاک میں ملا کے چلے

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

تمام عمر جو کی سب نے بے رخی ہم سے
کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے

مثال ماہی بے آب موج تڑپا کی
حباب پھوٹ کے روئے جو وہ نہا کے چلے

مقام یوں ہوا اس کارگاہ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرائے میں آ کے چلے

رہی عروج سے لغزش سدا کا دل کو
قلم کی طرح چلے جب تو سر جھکا کے چلے

ملا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا
انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

انیس نے اس غزل کو یوں سلام بنایا۔

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے

مقام یوں ہوا اس کارگاہ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے

خیال آگیا دنیا کی بے ثباتی کا
چلے جہاں سے جو اصغر تو مسکرا کے چلے

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

خرام اسپ شہ دیں جو دیکھتے ہم تشبیہ
کہاں ہے کبک دری چال جو خرام کے چلے

ملا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا
انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے

حسین کہتے تھے وا حسرتا علی اکبر
بہار باغ جوانی ہمیں دکھا کے چلے

ملک پکارے کہ اللہ زمیں کا طبقہ
حسین فوج پہ جب آستیں چڑھا کے چلے

اس میں تین عشقیہ شعر حذف کر کے بقیہ تین شعر بڑھائے ہیں۔

اس غزل کو سلام بنانے کے لئے انیس بقیہ اشعار زیادہ لکھے ہیں لیکن

بعض میں ایک آدھ شعر حقیقیہ ہے جیسے ؎

نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں / وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں
کبھی برا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا / ہر ایک ذرہ کو ہم آفتاب سمجھے ہیں
کریم مجھ کو عطا کر وہ فقر دنیا میں / کہ فخر سلطنت آپ سمجھے ہیں
بگولے کھاتے ہیں پیچ و تاب یہ جنگل کے وہ / اسی آبرو کو جو موتی کی آب سمجھے ہیں
ابوترابیہ کے در کا ہے ذرہ سفید / ہم آسماں پہ جسے آفتاب سمجھے ہیں
یہ شک تاک ہے کہتے ہیں جس کو اہل شراب / یہ عرق گل ہے جسے ہم گلاب سمجھے ہیں
شباب مجھ کو بھی غفلت میں دیکھ کر تھیں / سحر کی نیند کو بھی شب کا خواب سمجھے ہیں
جھکا کے سر کو نہ کیونکر عراق کے سمجھا / سوال شاہ کو سب لاجواب سمجھے ہیں
خدا کی راہ میں ایذا دے حق کو راحت / زمین گرم کو وہ فرش خواب سمجھے ہیں

انیس مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو
اسی زمین کو ہم فرش خواب سمجھے ہیں

انیس کے سلام میں ایسے شعر تو ایسے بھی ہیں جیسے غزلوں میں بھی ہوتے ہیں صرف آٹھواں شعر ایسا ہے جو غزل کا نہیں ہے۔

ان کے سلام میں بہت سے شعر ایسے ہیں جن میں غزل کا رنگ پوری طرح موجود ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل کا شعر ہے جیسے ؎

بلبلیں دم بھر جدا ہوتی نہیں / کس گل تر کے گلے کا ہار ہوں
کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر / کہ ٹوٹتے ہیں یہ شیشے صدا نہیں دیتے
خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم / انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو
پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو / خیال صنعت صانع ہے پاک بینوں کو

نمود و بود بشر کیا نبیط عالم میں / ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا
نہ جانے برق کی چمک تھی کہ شرر کی چمک / ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا
کور ہو گئیں اسکا جلوہ دیکھ کر / شکر ہے آنکھوں کا پردا رہ گیا
کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دیدے / فقیر ہوں پر نہیں عادت سوال مجھے

قناعت نہ گھر آبرو جو دب / ہم اپنے کیسہ خالی میں کیا جیب رکھتے
ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیر منت خلق / وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے

نہ پھیلا ہو یہ ہاتھ ہرگز انیس / فقیری میں بھی یوں ہی گزر ہے

کنج عزلت میں مثال آسیا ہوں گوشہ گیر / رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لئے
قطع امید انک سے گر ہو بھیم غم نہیں / الٰہ کچھ ساماں کرد نگا خدا میرے لئے

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے / سر جہاں رکھتے ہیں واں ہم قدم رکھتے نہیں
جو مقدر ہے وہ ملتا ہے تریں گرم کار سے / ہم ہیں شاکر کچھ خیال بیش و کم رکھتے نہیں

لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو / قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکینوں کو
زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا / اسی کو اہل جہاں انقلاب کہتے ہیں

فقیروں کی کیا موت کیا زندگی / جگہ جس جگہ مل گئی مر رہے
نشست و شو سے گو ہوا اجلا ازل / جامہ اصلی میں دھبا رہ گیا
اسی کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا / اسی کی شان نظر آگئی جدھر دیکھا
ہر نفس آئینہ دل سے یہ آتی ہے صدا / خاک ہو جائے تو حاصل ہو جلا سینے کو
بھیجے جنت میں یا دوزخ میں الٰہی تیرا / تو ہے عادل جو مناسب ہو سزا دے
فقیر دوست جو ہے مجھ کو سرفراز کرے / کچھ اور فرش بجز بوریا نہیں رکھتے
انیس مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو / اسی زمین کو ہم فرش خواب سمجھے ہیں
خاک ساری نے دکھائیں رفعتوں پہ رفعتیں / اس میں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

نوبت جمشید و دارا و سکندر اب کہاں
خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پائے ہو

رات اندھیری ہے کشتی اعمال اپنے فنا
قبر میں بھی چین سے انساں سو سکتا نہیں

کار ذاتی سے میں عاجز ہوں کیا ازجہاں
گرد اپنے منہ کی پانی آپ دھو سکتا نہیں

سوؤ گے کب تک بس اب اٹھو انیس
دن بہت غفلت میں سو کر کاٹ دئے، گیا

جو سخی ہیں مال دنیا سے خالی ان کے ہاتھ
اہل دولت جو ہیں وہ دست کرم رکھتے نہیں

دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے ان کے سر
آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں

نشہ جاہ تک ڈرے کہ ہم سب ہیں جہاز
عاقبت جمشید و جم کی یاد ہم رکھتے نہیں

عالم فانی میں کیا تم کو ملا
اور کچھ اپنی گرہ سے کھو گئے

عالم پیری میں یہ غفلت انیس
رات بھر جاگے سحر کو سو گئے

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری سے
چنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو

نکالتا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

غلط یہ لفظ یہ بندش یہ ترکیب یہ مضمون
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

قریب ہم آئے کہاں کمال کو بڑھ کے
تمام عمر ہوئی جب تو اپنا گھر دیکھا

کسی کی ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیس
عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

کچھ انیس پر ہی یہ موقوف نہیں تمام مرثیہ گویوں کے سلام ایسے ہی ہیں اگر ہر ایک کے سلام غزل کی طرح گنے جائیں تو ایک دفتر ہو جائے گا۔ اس لئے ہم صرف انیس کا کلام پیش کرتے ہیں یہ ایک بہت اعلیٰ اور سنجیدہ غزل کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔

رُباعی

رباعی کی مخصوص بحریں ہیں اس کے مضامین بھی بہت حد تک محدود ہیں لکھنؤ میں مرثیہ گویوں نے اسے بام عروج تک پہنچایا اور اس کا بھی اتنا ذخیرہ ہے جو غزلوں سے کم نہیں ہے چند رباعیاں سنئے۔

یارب خلاق ہر دو عالم تو ہے
بخشندۂ تاج و تخت شاہی تو ہے
بے منت و بے سوال و بے استحقاق
دیتا ہے جو سب کو یا الٰہی تو ہے

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

گر لاکھ برس جئے تو پھر مرنا ہے
پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے
غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

وہ موج ہوا دشت کا پھیرا نہ رہا
کشتی وہ ہوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا
سارے جھگڑے تھے زندگانی تک تھے
جب ہم نہ رہے تو یہ بکھیڑا نہ رہا

سایہ سے بھی وحشت ہے وہ دیوانہ ہوں
جو دام سے بھاگتا ہے وہ دانہ ہوں
دیکھا نہیں جس کو اس کا عاشق ہوں انیس
جلتا ہے جو بے شمع وہ پروانہ ہوں

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
آنکھیں جسے ڈھونڈتی ہیں وہ نور ہے تو
قربت رگ جاں اور یہ اس پہ بعد
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

قصیدہ

دورِ اوّل کے شعراء یعنی ناسخ و آتش نے کوئی قصیدہ نہیں کہا۔

دورِ دوم میں ناسخ کے شاگرد فقیر محمد خاں گویا نے پانچ چھ قصیدے کہے ہیں مگر انھیں قصیدہ کہنا مشکل ہے۔

آتش کے شاگردوں میں نواب سید محمد خاں رند نے ایک بلند پایہ قصیدہ لکھا ہے جس کی تشبیب یہ ہے :—

عمرہ ہو گئی یہ کچھ عارضِ گل سے ممنو — رنگِ خارستان سبزہ ہو جیسے حضور
فیض سے بادِ بہاری کے کریگا اسرال — آہ بلبل کے شجر سے گل تاثیر ظہور
قوتِ نامیہ کے نشو و نما کے باعث — دانۂ اشک بھی سرسبز اگر ہو گیا دور
پشتِ طاؤس بنا سے ہوا بسکہ ہو — دامنِ بادِ صبا سبزہ و رنگیں و مشہور
یہ بھی جوشِ طراوت کا زمانے میں ہے — کیا عجب زخم کا بھی سبز اگر ہو انگور
لعل نے رنگِ زمرد کا کیا ہے پیدا — سبز زنگار کے مانند ہوا ہے کافور

دورِ سوم میں منشی اسمٰعیل حسین منیر نے ایسے قصیدے بیں کہے ہیں۔ جن کا مثل نہیں خاص طور پر ایک قصیدہ تو ایسا ہے جیسا سودا، ذوق، غالب اور مومن بھی نہ کہہ سکے اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ مولوی فضلِ حق خیرآبادی اور منیر دونوں کو عبورِ دریائے شور کا حکم ہوا وہاں دونوں ایک ساتھ رہتے تھے

ایک دن مولانا نے منیر سے کہا کہ تم مصطلحاتِ عجم اور کتابیں فرس "کیوں نظم نہیں" کرتے جانتے ہو یا تو اردو اس کی متحمل نہیں یا تم میں کوئی اس پر قادر نہیں سودا نے قصیدے کہے مگر وہ بھی اس راستے پر نہ چل سکے۔

منیر نے پہلے تو کچھ دشوار پایا لیکن مگر مولانا کی ہدایت پر [illegible] اس کے [illegible] امام حسن علیہ السلام کی مدح میں کہا جس کی تشبیب [illegible]

قصیدہ امام حسنؑ کی مدح میں

اشک زلیخا ہوئے بحرِ صفت جوش زن — غرق ہوا نیل میں یوسفِ گل پیرہن
آبلہ پرور زرِ تازہ حنا بند گئے — ابر و زالِ زری تلِ کمیت کہن
سیاہ سیہ میں گرا یوسفِ زریں قبا — دیو سیہ ہو گیا شاہدِ پروین پرن
بالِ شہ نیمروز بسکہ ہوا کم بہا — زنگیوں کے بالوں سے بدلی بہری کرن
خیمۂ زرتاب میں لیلیٰ مشکیں لباس — زینت مایہ ہیں سیر شمع مرصع لگن
پنجۂ گل الخضیب شانہ گیسوئے شب — سرمۂ چشمِ نجوم مشکِ غزالِ ختن
خندۂ دنداں نما زنگی شب نے کیا — تختِ سلیماں ہوا تکیہ گہ اہرمن
گنبدِ فیروزہ میں چھوٹ گئے تابوت کے — دخترِ کاں نسیم کھل گئے خندہ زن
لالۂ داغِ پلنگ تھی شفقِ آسماں — دیکھا وہ جو رقیب کیا کیا ہوا سینہ زن
خسروِ اقلیم شب قصرِ ششم میں مکین — ہندو بالانشین صرف بت و برہمن
ترک کمانداری نے تیر کیا زیبِ دوش — زینتِ دستِ سماک نیزۂ خارا شکن
دیدۂ زمرد نگار منظرِ اختر شمار — کرنے لگا آشکار صورتِ صد دوش
صوفیٔ ازرق رداں اپنی بغل میں دبائے — اوڑھے لباس سیاہ شاہدِ بابل ذقن
نظم ز نامی ہوئی خمسۂ حیرت زدہ — فکر ہلالی بنے اختر برجِ سخن
تیر شہاب و شعاع خوب چلے دیر تک — ناوکِ ارجن ہوا مرکزِ کا ضر کرن
خوشۂ بے برداں نے پائی پہ نشو و نما — بڑھ کے ہوئے نخل طور مثلِ خیار ہن
تا جگرِ شیرِ سرخ ناوکِ دندانِ فیل — سرحدِ مشرق بیاض آگئی تا کجلی کرن
آئینۂ خاوری چشمۂ بے آب تھا — حلقۂ سیمیں ہوا سنجۂ سر انجمن
جلوہ گرِ بامِ سبز طائرِ سیماب گوں — زاغِ سیہ کا شکار مرغِ طلوعِ بدن
خضر زمرد لباس صاحبِ دستِ کلیم — زیبِ مصلّا کئے سبز بولی بابل وطن

دورِ سوم میں امیر مینائی نے دو قصیدے لکھے انہیں نظم کہنا زیادہ صحیح ہے ہاں مولانا علی حیدر نظم طباطبائی اور مرزا رسوا نے بہت زوردار قصائد کہے مرزا رسوا کا کوئی قصیدہ ہمارے پاس نہیں نظم طباطبائی کے ایک قصیدے کی تشبیب ملاحظہ ہو ۔ ؎

کیا اشارے کر رہی ہے دیکھ چشم روزگار   کیا شرارے بھر رہا ہے الوند لیل و نہار
پردہ ظلمت سے نکلا روئے سلمائے سحر   ناز گردوں کی کھنچی لیلیٰ شب نے بہار
ہے شفق یا وادی فیروزہ گوں میں لالہ زار   ہے سحر یا سبزہ زار آسماں میں انتشار
چاہ سے نکلے ہیں یوسف یا نکلا ہے تار صبح کا   یا بنا گوش زلیخا میں ہے دُرِ شاہوار
آفتاب آیا نظر زیر گریبانِ افق   ہو گئی غائب شب بلدہ ہوا صبح آشکار
آتش فروزی جو کی مشرق میں صبح سحر نے   ہو گیا مغرب میں پنہاں ساقی دار
شعبدہ گر نے یہ کی افسوں گری   ہرہ مشرق میں آگ گر
یہ سحر ہے یا کہ ہے رنگ رخ عروس چرخ   یہ شفق ہے یا کہ ہے خون رگ ابر بہار
ہو گیا فیض سحر سے چیر گرد لب جگر   بن گئی لطف ہوا سے کہکشاں پھولوں کا ہار
حور کا دست نگاریں ہے کہ ہے کف   آرسی ہے یا نظر آیا ہے یہ رنگ عذار
خوشہ گندم ہے یہ سندل کف عذرا میں ہے   گوندھنے کی ہاتھ میں لی ہے زلف
جلوہ دکھاتی ہے یہ صبح جانفزا   جس کے گھونگھٹ سے سفیدہ صبح کا ہے منہ
الشمس اس کے زیر پا ہیں شعاعیں زر کی   نکلی ہے چادر آب زر کی یہ عذار
چشمہ خورشید میں غوطہ لگا تیکھی یہ پھیر   گنبد نیلوفری پہ کوئی دم لے کر قرار
آنکھ ابھی محو تماشا تھی کہ جھک کر یہ گئی   حلوہ انجم ہو گا یا رقص شرار
صبح ہوتے خیمہ زنگار نوں آیا نظر   تھا طلسم سیمابی گنبد گوہر نگار
ہو گیا لشکر یہ غالب ایک ترک نیزہ دار

پھینکتا ہے بام گردوں پر کمند اپنی کرن !
کرتا ہے تیر شعاعی طائر نظرہ شکار

اس دور کے شعراء میں آرزو صاحب کا قصیدہ نہیں ملا۔ ایک صاحب نے عزیز، محشر کے قصائد کا مجموعہ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر کئی تقاضوں کے بعد بھی ان کا وعدہ پورا نہ ہوا بقول مولانا صفی ؎

وعدے میں حاتم ہیں جب دینا پڑے قارون ہیں

ایک صاحب کا میں شکر گذار ہوں کہ انھوں نے زحمت اٹھا کے اور پیسہ خرچ کر کے عزیز و محشر کے ایک ایک قصیدہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی عنایت فرمائی یہ انتخاب اُن کا ہے اگر مجھے وہ دیوان دیے دیتے تو میں عزیز کا وہ قصیدہ پیش کرتا جس کے مطلع کا دوسرا مصرعہ یہ تھا ؎

لہو کچھ بڑھ گیا جب فصد دیوانوں نے کھلوائی

اور محشر صاحب کا وہ قصیدہ پیش کرتا جس میں جنگ خیبر نظم ہے اور بجماعت استیلائی میں مطلع ہے ؎

رہا بیدار کس کی گرمیٔ محفل سے یہ شب بھر   نئے چشم رمد آلود نکلا خسرِ خاور

یہ ان کا شاہکار ہے اور اردو میں اس کا جواب نہیں مجبوراً آپ کرم فرما کا انتخاب پیش کرتا ہوں۔

دورِ آخر کے شعراء میں مرزا جعفر علی خاں اثر نے بھی بڑے زوردار قصیدے کہے ہیں مگر مجھے دستیاب نہیں ہوئے۔ انشاء اللہ آئندہ اڈیشن میں یہ تمام خامیاں دور ہو جائیں گی۔

مولانا صفی کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ میرے پاس ہے جو پیش کرتا ہوں۔

نشیدِ مدح امیر المومنین علی ابن ابی طالب

جلوہ پرستِ حسن ہیں شکر ہے کردگار کا
ہم جو بنے سرک گیا پردہ حریم یار کا

کیسہ بہ نے چشم شوق لی ہے سی ندگی
دورِ چلا رگوں میں خون پھر دلِ بیقرار کا

[illegible] نگاہ ناز سے مست عشق اٹھ گئی
دل پہ فریب چل گیا نرگسِ پُر خمار کا

[illegible] شمیم زلف آ کے جو عنبر بکند اٹھ گئی
کس سے کھل گیا ابھی [illegible] کا

جوشِ جنوں کی منزلیں ہو گئیں طے آ کے قدم
خار [illegible] [illegible] کا

منظر کوہ دیکھ کر بیٹھ گئے کیوں ادب سے
سلسلۂ جنونِ عشق ہے زمزمہ ابتدار کا

اہلِ نظر کی آنکھ سے خون جگر ٹپک پڑا
نقش مزار دیکھ کر کشتۂ انتظار کا

خاک نشینِ راہِ عشق گرد اٹھے تو لطف تھے
ایک تن بنا ہوا تھا یہ فلک غبار کا

چھالے اُبھر کے گر پڑے دامن گل سے بھر کے چلے
چل کے کھل گئے جنوں نالۂ سنا ہزار کا

دیر سے تا بہ میکدہ پہنچے کہاں ہیں گھیر کے
نو [illegible] پھر ہیں شوق رخ نگار کا

صحنِ حرم میں تھک گئے بیٹھے بمقصد
پھر نے لگا نگاہ میں میکدہ چشم یار کا

سو حبیب کبریا دیکھ رہا ہے کوئی
آنکھوں میں خط کھینچا ہوا سرمۂ انتظار کا

بوس لگا ہے دیکھنا کون زباں کو سی
ذوالفقار لے رہا ہے کون [illegible] کا

بمنتِ اسد اللہ الاثقم رسول کی گود میں
پھینک [illegible] ہاتھ پاؤں تن جو نہیں قرار کا

یہ جو بڑی ہے آج باندھ کے ہاتھ تیر
فتح کر چکا کل یہی معرکہ گیر و دار کا

کھلتے ہی چشمِ مراد حیدرِ عالم کا نام
پھول ہے کس چمن کا یہ [illegible] کا

گلشنِ ہاشمی کا پھول آس کے کھلے کا ہے
جانتا ہے جو رکھا ہے [illegible] کا

جتنی بھوؤں کو خم خطرے ہیں مصطفے
پیچ ہے گا [illegible] ایک دن [illegible] ذوالفقار کا

[illegible] عصائے موسوی [illegible] حیدر ارشد
بعد میں امتحاں کر یہ قوت شیر خوار کا

بازو دل پہ پھر ہوا [illegible]
بت شکنی کا ولولہ حوصلہ کار زار کا

ابرو دل کو جو دیکھے لیتے ہی بل پڑے ہوں
ناخنوں میں چبا ہوا زخم کشیدہ کار کا

انگلیوں کی ہر ایک پور زور میں ہو بھر کا ہو
در کو اکھیڑ لیں اگر در نہ کھلے حصار کا

شیر خدا کے سامنے لائے گی گھیر کر اجل
خیبریوں کو دو بخبر جلد کریں شکار کا

کر کرم وہ ہاتھ ہیں جس کی سخا کے جوش کو
روک سکا نہ سلسلہ ناقہ صد قطار کا

شانِ بتانِ آزری مائل سرکشی ہو کیوں
دیگا انہیں یہی سبق ایک دو ضرب کار کا

گھر میں خدا کے بیٹھ کر ہی خدائی اتنے دن
بت شکن آ گیا ہو تو راستہ لو فرار کا

دیکھو یہی قدم ہیں وہ جو سر دوشِ مصطفے
نقش جما میں گے کبھی سکہ اعتبار کا

جلوہ اسمی سے ستار کا آئیگا جا بجا نظر
سیر فلک کی دیگا جب چاند حرا کے غار کا

شجرہ طیبہ ہے ایک جسکی ہیں ڈالیاں
دل کی طرح ملا ہوا سلسلہ برگ و بار کا

مصلحتِ رسول جب جانتی ہے اس کو گھر
دیگا یہی تو امتحاں ہمت استوار کا

بحث نصیریوں سے کیا انمیں کسی کے شک نہیں
ذات علی ہے آئینہ قدرت کردگار کا

ماہ رجب کی تیرھویں یوم ولادت امیر
کوثریوں میں دور ہے بادۂ خوشگوار کا

ساقی ناز مست ہاں دور چلے کہ عید ہے
مطرب جاں نواز آ پردہ چھیڑ بہار کا

مست پھر ہیں گے باغ میں طینتِ حبیب یار کی
سبزے کا فرش سا بنا خیمۂ زر نگار کا

دامِ نظر وہ جا بجا گملوں میں کھلے خوشنما
تیغ ہے کہ جڑا ہوا آئینہ جوئبار کا

گل یہ تو جو گوش ہیں سنتے ہیں غنچہ و عندلیب
قصہ زبان موج سے ہے نقش سنگسار کا

دیکھے سبز دیکھ کے لیتے ہیں ہمت
آگ لگی جو ہی ہر ایک نخل نہیں چنار کا

دیکھے ہے اک نہ ہیں آتش و آب [illegible]
لوٹ نہ سکے جو باغباں بچہ ہو نظم آبدار کا

بادہ کشانِ انجمن جوش طرب سے نعرہ زن
دو نوں پھر رہے ہیں حاشیہ سبز دو در کا

آئے تھے پیشہ شیر حق مست لا الہٰ پیا ذکر
جو بھی کہا ہر ایک سر دے کے تری نثار کا

دشمن نہ ہو سکے ہر ریشہ دوانی بہار
اب جو ملے عصائے تیغ دست سے نثار کا

طرزِ عمل بدل گئے نقش نئے نئے رچے / رنگ کچھ اور ہوگیا صفحۂ روزگار کا
ذرّوں کو جلوۂ مہر کا شہرت عام نے دیا / تنگ نظر مگر وسیع دائرہ اشتہار کا
دیکھ چکے ہیں جو صفتی معجزۂ پیمبری / انکی نگہ میں کیا جچے شعبدہ اقتدار کا
کور سوادِ امتیاز ایسے بھی ہیں جہان میں / کرتے ہیں جو مقابلہ جلوۂ نور و نار کا
دوست کسے بنائیے محرمِ راز کون ہے / کس کو سماں دکھائیے سینۂ داغدار کا
آئی خزاں بہار میں سست نگہ سے چھن گیا / سر سبد چمن تھا جو گل مری شاخسار کا
اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ کیجئے کیا سخن وری / سہل نہیں سنوارنا طرۂ تابدار کا
خاک میں گو ملا دیا جوشِ سکوت نے مجھے / پھر بھی چراغِ راہ ہے نقش مرے مزار کا
خمکدۂ غدیر کا بادہ کشِ قدیم ہوں / دوش بدوش طور ہے پایہ مرے وقار کا
خامۂ گلفشاں نہیں تیشۂ کوہکن ہے یہ / پست و بلند شعر ہے سلسلہ کوہسار کا
حوصلہ ہے تو قلیوں کی بھی عرش تو چھو چلے صفی / ہوگا بلند اور ابھی کیا علم افتخار کا
چھیڑ کے داستانِ فخر طول بہت نہ دیجئے / سازِ سخن کی جان ہے زمزمہ انکسار کا
دست دعا اٹھائیے چشمِ کرم ہے منتظر / نقش اثر بٹھائیے سکۂ اعتبار کا
جب تک الٰہی ابر میں جلوہ فروش برق ہے / ابر ہے میر کارواں قافلۂ بہار کا
مخلصی سبز کار کا مزرعِ دل ہرا بھرا / خرمنِ آرزو تباہ خصم سیاہ کار کا

محشر لکھنوی

سید محمد اعجاز الحسنین علی [۱۴]

نہ پوچھ اے ہمنشیں ہنس ہنس کے اس نے کس لذت سے دی / بنا رکھا ہو جس کو دل کی بیتابی نے فریادی
شمائلِ کارِ غم سنتے ہیں ہم اچھا ہی ہوتا ہے / مگر تا چند آخر مجھ پہ حسرت کی بربادی
خدا جانے کہ ہو کب شادماں [illegible] / خدا معلوم کب ہم کو ہو قید غم سے آزادی
دکھاتا تو ہم ہیں [illegible] / ابھی یہ آسمانِ پیر سے امید زورِ جلادی
قدم جب اٹھتے ہیں راہِ وفا کی سمت اٹھتا ہے / دکھا دیتی ہے قسمت دور سے زنجیر فولادی
[illegible] / کہاں تک [illegible] دل غم پہ سر کوبی و فریادی
قدم گھر سے نکلنا چاہیے لے ہو رہی منزل / سوادِ شہر بھر ہوگا بیابانوں کی آبادی
صدا ہے الرحیل اپنے [illegible] / [illegible]
[illegible] / [illegible]
ملال انگیز ہے صبح وطن اہل محبت کو / [illegible] جو آئے شام بربادی
نقاب رخ اٹھائے جبکہ مہر آسمانی کا / [illegible] تڑپے قلب فولادی
چلوں خونابۂ قلب و جگر سے ہاتھ منہ دھو کر / [illegible] منزل
شکستہ میری ٹھوکر سے ہو سنگ راہ [illegible] / بہا دوں [illegible] اگر سدِ سکندر کو وہ بربادی
کروں ایسی سی کوشش پھر تو جذبِ دل ہے اور منزل / وہ منزل قید غم سے جس جگہ ہوتی ہے آزادی
وہ منزل نقشِ اول جو نگارستانِ عالم ہے / سراسر جس پہ ہے نقش صنعتِ قدرت کی استادی
وہ منزل خلد کہیے جس کو یا عرشِ بریں کہیے / دلِ غمگیں کی خاطر وقف جس جا عشرت و شادی
وہ منزل جس جگہ دامانِ امید کے بھر جائے / مرادیں دل کی خاطر خواہ بے لیکے فریادی
وہ منزل مرکز امن و اماں جو دورِ عالم میں / جہاں تیر ستم لوٹے [illegible] آسماں کا زورِ جلادی
وہ منزل جو زمیں سے آسماں تک نور ہی نور / جہاں انسان بدلے فرشتوں کی ہے آبادی

وہ منزل مدتوں سے آج تک جس کے تصور میں — بتانِ کعبہ پتھر بن گئے یوں کھو گیا دی
تعالی اللہ وہ منزل جس کو لَن کہئے نجف — اسیرانِ گنہ کو جس جگہ حاصل ہی آزادی
وہ منزل آستانہ جس کو بابِ علم کا کہئے — کہ جن کا گردنِ جبریل پہ ہے حقِ استادی
وہ بابِ علم یعنے شوہرِ بنتِ رسول اللہ — کیا تجویز جس کو خود خدا نے بہرِ دامادی
وہ دامادِ قوی بازو نصیرِ احمدِ مرسل — رگی زد در ملائک تھے جسکی تیغ فولادی
وہ فولادی حسامِ برق زا جسکی ضیا باری — بے اہلِ ضلالت بنگئی تھی رہبر ہادی
وہ ہادی کفر کے ظلمات سے جس نے ہزاروں کو — نکالا اور عطا کی مجلسِ دوزخ سے آزادی
وہ آزادی کہ جس سے اب ہیں انکو جنت میں مزے — تصدق انکی ہر اک آرزو پر عشرت و شادی
بنایا کل جن و انس و ملک کا آپکو ہادی — زہے توحید خوشا صنعت گرِ عالم کی استادی
وجودِ ذاتِ حضرت سے ہوا آباد سرتاسر — طلسماتِ جہاں تھا ورنہ اک تصویر بربادی
اٹھا دے آپ کا الطاف اگر رحم و کرم لانا — ہنوز لعفِ جنیناں جہاں سے کار ہمادی
شجاعت آپکی جب یاد آتی ہی غلاموں کو — تو پھرتی ہے نگہ میں خیبر و خندق کی بربادی
دمِ اظہارِ قوت بھی مراعاتِ کرم تھی — دلِ دشمن نہ توڑا توڑ ڈالا بابِ فولادی
دکھائیں آپ گر کچھ شانیہ نورِ امامت کا — تو اکھڑے قلعۂ ارض و سما کی خشتِ بنیادی
ہراذمہ ہو کوئی روکے پھر بابِ جنت پر — درِ مشکلکشا پر ہو اگر شداد فریادی
یہ پہلی آپکے قدموں کی برکت تھی زمانے میں — کہ آ جڑا گھر بتوں کا اور ہوئی کعبے کی آبادی
نجف کی خاک میں ملجائیں تو حاصل ہو جمعی — بگولوں کو اسی دشت میں ہے شوقِ بربادی
جو ادنیٰ شحنۂ عدلِ شہِ والا کا آیا ہو — نہ لے مریخ پھر صبحِ ابد تک نامِ جلادی
یداللہی دکھائی آپ نے یوں جنگِ خیبر میں — کہ توڑا کفر کے رشتے کیصورت بابِ فولادی
ہوا جب آپ سے عقد تو شور اٹھا ملائک میں — مبارکباد یا حیدر رسول اللہ کی دامادی
نکالیں دستِ ظالم سے جو مولا دل شکستہ کو — ہلادے گنبدِ دوارِ فلک کو نعرۂ شادی

محیطِ الفتِ مشکلکشا میں غرق ہوتی ہے — ملی یونس کو بطنِ حوت کے زنداں سے آزادی
پکاری شانِ اسلام انکی پیدائش پہ کعبے میں — اسی بچے کے ہاتھوں ہے بتوں کی خانہ بربادی
عدالت اس کو کہتے ہیں یہ ہے لطفِ یداللہی — کہ کاٹیں دستِ سارق اور نہو ایذا سے فریادی
طریقِ راستی کردیں جو تعلیم آپ استاد ہے — فلک سا دشمنِ نام بھلا دے اپنی کجبادی
کیا جنت کیا آزاد آپ نے اسلام پھیلاکر — وگرنہ پھیلے دنیا بھر میں تقلیدِ شدادی
شریکِ کاروانِ لطفِ حضرت ہو اگر آکر — جرس وقتِ سفر بیتاب بن کر ہو نہ فریادی
قدم فرسا کہاں تک وادیِ مدحت میں اے محشر — نہیں زیبا ہے اب تو ادب کو اتنی آزادی
بامیدِ دعا سینے میں زباں ہے نار کی صورت — مجھے اے شوق دکھلادو سخن کا طرزِ استادی
مبارک ہو کہ اٹھے پردہ ہائے نامرادی بھی — حذرلو لو کشف کا نام لیکر اب ہو فریادی
خداوندا مرے شوقِ دلی کی پھر بنا کر — زیارت ہے نجف کی پھر مجھے سو عزت و شادی
ہوا میں اڑکے داں کی خاک پھر تسکین ہو جائے — زمیں پہ پھر دکھائی دے مجھے جنت کی آبادی
پڑھوں پھر میں قصیدہ مدحِ بابِ علم میں دلسے — صدائیں غیب سے آئیں کہ یہ ہے شانِ استادی

عزیز لکھنوی

سبحۂ نور

منبعد کی جو کوششیں تھیں سب وہ رخصت ہو گئیں / اب نگاہیں منکشف تفسیرِ حجت ہو گئیں !
پھر جو دیکھی دنیائی دل وارفتہ سے / پھر نگاہیں سلسلہ جنبانِ حقیقت ہو گئیں
اک نگہ نے پردۂ دل پہ قبضہ کر لیا / یہ ادائے دل جو چیزیں تھیں امانت ہو گئیں
بے اثر جن کو سمجھتے تھے تم اپنی بزم میں / جذبۂ دل کی وہی باتیں کرامت ہو گئیں
بے حقیقت مانتے تھے ہم جو سامانِ نمود / پھر فراہم ہو کے یہ شکلیں قیامت ہو گئیں
خوبی گر مہ یہ سا طرح ہو گئی مجھ سے چارہ گر / عادتیں جو بے [illegible] سینے تک طبیعت ہو گئیں
جلوۂ بزمِ حسن میں کچھ لئے حاصل کر دیں / وہ نگاہیں جو سبق آموزِ عبرت ہو گئیں
دیدۂ انجم فشاں کیوں اسطے اب کھلا ہیں / ساری بوندیں آنکھ کی نذرِ محبت ہو گئیں
وہ نگاہیں فرخ جو تھیں کاربندِ التفات / دل کی نیرنگ گئیں [illegible] ہو گئیں
اسے جو باتیں ہو رہی تھیں تخلیہ میں بیٹھ کر / اب وہ شرحِ دفترِ رازِ محبت ہو گئیں
تو شنی میں دل کے نکلی تھیں جو آوازیں عزیز / وہ صدائیں نغمۂ سازِ حقیقت ہو گئیں
میرے دل کا اک شگاف اور کعبہ کی دیوار کا / دونوں دروازے [illegible] باب شہرِ حکمت ہو گئیں
ردی وجہ اللہ میں مخفی جو تھیں لے ذرا اول / اب وہ تنویریں فروغِ بزمِ صورت ہو گئیں
فاطمہؓ بنت اسد کو دردِ زہ عارض ہوا / آ کے حوریں خلد سے سرگرمِ خدمت ہو گئیں
شمعِ بینائی کی لو جب حد سے زائد بڑھ گئی / رخ کی تنویریں چراغِ بزمِ قدرت ہو گئیں
جس نے دیکھا آنکھ بھر کر نورِ عین اللہ کو / دونوں آنکھیں ساغرِ صہبائے وحدت ہو گئیں
دیکھ کر رخسارِ وجہ اللہ غش آیا مجھے / رخ کی تحریریں دلیلِ ردِ رویت ہو گئیں
جو لکیریں آپکی پیشانی اقدس پہ تھیں / اب وہی فرمانِ تبلیغِ رسالت ہو گئیں

خسروِ اسلام نے جب گود میں اپنی لیا / سب ادائیں چہرہ کی جانِ سنت ہو گئیں
معبدِ اسلام ہے اب مسقط الراس علیؑ / جتنی راہیں کعبہ کی تھیں سب وہ جنت ہو گئیں
کیوں علی اللہ ہو تم کیوں نہ ہو معبود وہ / رفتہ رفتہ بچپن کی باتیں تک عبادت ہو گئیں
جتنی بیداری کی تکلیفیں اٹھائیں آپ نے / اب سببِ ہجرتِ دہی شب خوابِ راحت ہو گئیں
ابتدائی عمر سے لیں جتنی سانسیں آپ نے / وہ ذخیرہ ہو کے سب نفسِ رسالت ہو گئیں
وہ غذائیں جو لعابِ مصطفیٰ سے پائی تھیں / ہو کے سب جزوِ بدن جوشِ طبیعت ہو گئیں
نفس کا پیغمبر امین اللہ نے ان کو کیا / فاطمہؓ تو حاملِ بارِ امانت ہو گئیں
شیر ہے بنتِ اسد کا کیوں نہ ہو شیرِ خدا / جتنی بوندیں حلق سے اتریں شجاعت ہو گئیں
مختصر تاریخِ حالِ مصحفِ ناطق ہے یہ / جتنی باتیں اُن سے لیں [illegible] ہو گئیں
ہے [illegible] رشتہ برانداممہرِ نیم روز / رنگِ رخ میں گردشیں عہدِ حجت ہو گئیں
کعبہ کی یہ نعمتیں اسلام کی یہ / اے علی سب تیرے قدموں کی بدولت ہو گئیں

نظم

میر دوست علی خلیل

کوئی ساٹھ برس سے ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے نظم اُردو ادب میں داخل ہوئی ہے اس کی کوئی خاص ہیئت نہیں ہے نہ کوئی مخصوص موضوع ہے۔ مثنوی، مثلث، مربع، مخمس، مسدس سب میں کہی جاتی ہے اور موضوع کے لحاظ سے ہر طرح کے خیالات و مناظر پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت میں کوئی نئی چیز نہیں ہے اُردو شاعری کے ساتھ اس کا وجود پایا جاتا ہے، قطب قلی شاہ کے دیوان میں بھی اس طرح کی نظمیں موجود ہیں اور ولی کے یہاں بھی، شمالی ہند میں میر و سودا، نظیر اکبر آبادی سب نے نظمیں کہی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اسے ایک مستقل صنف نہیں سمجھتے تھے ہیئت کا لحاظ کرتے تھے مثلاً اگر مثنوی کی طرح کے اشعار میں برسات کی کیفیت نظم کی ہے تو وہ اسے مثنوی کہتے تھے اور اس کا عنوان قائم کرتے تھے "مثنوی در موسم برشگال" اگر مسدس میں ہے تو مسدس در موسم برشگال۔ اب مثنوی یا مسدس کو حذف کر کے صرف موضوع لکھ دینا کافی سمجھا جاتا ہے۔ بہار، برسات۔ پہاڑ اور گھری وغیرہ چاہے وہ ہیئت کے لحاظ سے کسی صنف میں ہو اتنے سے تغیر سے ایک نئی صنف بن گئی۔

لکھنؤ میں ناسخ و آتش کے زمانے سے (جب سے لکھنؤ شاعری کا دور شروع ہوا) ایسی ایسی نظمیں کہی گئیں جن کا مثل اُردو میں نہیں ہے۔

دورِ اول کے شعرا میں میر دوست علی خلیل کی ایک غیر مطبوعہ نظم ایک ہم قلمی بیاض سے پیش کرتے ہیں، جس کا موضوع افیم ہے اس کا عنوان خلیل نے طلسم ہوشربا رکھا ہے اس لیے ہم نے بھی یہی سرخی رکھی ہے۔ پیش کریں گے۔

طلسمِ ہوشربا

سرمۂ چشمِ حسینانِ جہاں ہے افیون
غیرتِ خالِ رخِ حورِ جناں ہے افیون

طفل بھی مرتے ہیں جس پر وہ جواں ہے افیوں
طرفہ معجون عجب روح فزا ہے افیون

اس قدر عاشقِ شیدا ہیں جہاں میں اسکے
یہ وہ لیلیٰ ہے کہ مجنوں ہیں زن و مرد اسکے

اس پری زاد کے القاب کروں کیا میں بیاں
حاکمِ مملکتِ ہند و حبش کی سلطاں

مستی کوہ سر دار آتشِ موسیٰ کا دھواں
مرہمِ زخمِ دلِ عاشقِ بیتاب و تواں

بیشتر بادۂ سرجوش بھی کہتے ہیں اسے
لوگ معشوقِ سیہ پوش بھی کہتے ہیں اسے

کوئی ساون کی گھٹا کہتا ہے کوئی ظلمات
کوئی لیلیٰ اسے کہتا ہے کوئی وصل کی رات

اس کا تلخی میں بھی ایسا ہے مزہ قند و نبات
اس معجون کی تاثیر میں ہے موت و حیات

دل میں ہے کافر و دیندار کے الفت اسکی
سنگِ اسود سے سوا کرتے ہیں عزت اسکی

لیلۃ القدر اسے کہتا ہے کوئی انساں
کوئی کہتا ہے اسے سجدۂ عابد کا نشاں

مشک کہتا ہے کوئی کوئی دوائے خفقاں
کوئی گلدستۂ سوسن کوئی مجلس حزن

ہے عجب ہوش ربا خلق میں نیرنگ اس کا
سنگِ موسیٰ ہے بدن لال ہے پر رنگ اس کا

یہ وہ ہے قوتِ دل راحتِ جاں نورِ نظر
دیدۂ عاشقِ بیتاب میں ہے اس کا گھر

نہیں چھپتا نہیں چھپتا ہے کبھی اس کا اثر
دیکھ لو دیکھ لو پردہ جو نہ ہو آنکھوں پر

آنکھوں میں اس کی عجب جلوہ گری رہتی ہے
انھیں دو شیشوں میں یہ ایک پری رہتی ہے

ہے مجمل اس کی رسائی کہ کمند افکار … واں پہنچتی ہے جہاں وہم کا بھی ہو نہ گزر
برق کی طرح نہیں ایک جگہ اس کو قرار … خلوت خاص کی پابند نہیں یہ خیار

کون سا عضو ہے جس میں نہیں گھر کرتی ہے
روح کی طرح سے رگ رگ میں گزر کرتی ہے

ہاتھ لگ جانے سے ہوتے ہیں جو شاد اس کے مرید … جانتے ہیں اسے شاید وہ ضیائے تب عید
یا سمجھتے ہیں اسے قفل در دل کی کلید … آنکھیں کھل جاتی ہیں سمجھتے ہیں اس شوخ کی دید

جان کر آب حیات اس کو بشر پیتے ہیں
جو نہیں مرتے ہیں اس پہ وہ عبث جیتے ہیں

اس کی گولی سے پرستان سے حسینان کہ ہوا … اس کے غمزے سے تجلی طلبِ کم سن کی ادا
ہوش اڑاتی ہے ارسطو کے جو ہو وصل ذرا … … پڑھا نہیں گیا
. . . .

ایک دم قید سے اس کی جو نہیں چھوٹتے ہیں
بے خودی کے وہی دنیا میں مزے لوٹتے ہیں

کیا پری زاد ہے کیا حور ہے یہ ہوش ربا … دل زاہد میں ہے ایماں کی طرح اس کی جا
کچھ اکیلے نہیں دیندار ہی ہیں اس پہ فدا … اس شب قدر کے کافر بھی ہیں مشتاق لقا

یہ حسیں وہ ہے کہ ہے غافل و ہشیار کی جاں
اس پہ جاتی ہے ہر اک کافر و دیندار کی جاں

اس چھلاوے کے نرالے ہیں جہاں میں انداز … کہیں جادو ہے کہیں سحر کہیں شعبدہ باز
اسی مولیٰ کے حسن کے دل مجذوبانہ ساز … بے خبر رہتے ہیں اس شوخ کے سب محرم راز

نہیں کھلتا ہے کہ بند آنکھوں سے کیا دیکھتے ہیں
دیدۂ دل سے مگر شان خدا دیکھتے ہیں

جام دل اس کی محبت سے اگر ہو معمور … دائم الخمر رہے بادۂ گلگوں سے نفور

پاک طینت ہے یہ دنیا میں تو آتا ہے ہر دور … اس کے مشتاق سے ہوتا ہی نہیں فسق و فجور

اس سے کم رتبے نہیں پیر کسی مذہب میں
صورت آب رواں پاک ہے ہر مشرب میں

سانولے رنگ کا جلوہ ہے عجب پُر معنی … دم چھڑکتا ہے شب و روز ہے چشمو نکا
سحر ہے ناز و ادا قہر بلا ہے غمزہ … بدمزاجی بھی ہے اس شوخ کی خوبی ترا

مشرب ہے خوب نہ گنبد افلاک اس کا!
دل سے بہاتا ہے کہ میوں کو بھی مساک اس کا

اس کی صورت یہ جو آتا ہے نظر رنگ تخفیف … تیرگی اس کی ہے شاید کہ سواد سطر یار
تجلی اس سے ہے جبیں میں خط سوسن کی بہار … دو دماں اس کا ہے شام شب گیسوئے نگار

دل میں جا دیتے ہیں عشاق جگر ریش اسے
کا نکا جانتے ہیں کافر بد کیش اسے

یہ وہ محبوب ہے اس کا ہو اگر محو جمال … آدمی زاد میں پیدا ہوں فرشتے کے خصال
نہ ہوس کھانے کی رہتی ہے نہ پانی کا خیال … اپنی ہستی کو مٹا دیتے ہیں جو پائے وصال

اس سے صحبت جو نہ گنبد افلاک سے ہے
جرم عصیاں سے فرشتوں کی طرح پاک ہے

مختلف عشق و محبت سے ہے اس کی تاثیر … نوشدارو ہے کسی کو تو کسی کو شمشیر
ہے کہیں ابر غضب اور کہیں ابر مطیر … سپر تیغ الم تو کسی اجل کا ہیں تیر

نہیں کھلتے ہیں کسی شخص پہ نیرنگ اس کے
گردش چرخ سے ملتے ہیں بہت ڈھنگ اس کے

یہ وہ ہے پیر طریقت کہ جو ہو اس کا مرید … ما سوی اللہ سے اک دم میں وہ ہو جائے بعید
بس کہ رہتی ہے اسے نفس کشی کی تاکید … کیا عجب ہے جو خدا زیست میں دے اجر سعید

ستم پیشہ اجل قاطع لذات ہے یہ
واہ کیا صاحب اعجاز و کرامات ہے یہ

نشۂ عشق سے اس شوخ کے جو ہیں سرشار　　عابد ماہ کے مانند ہیں شب بیدار
اول شام سے تا صبح یہ ہے ان کا شعار　　خواب راحت کو نہ آنکھوں میں جگہ دیں زنہار

مثل انجم کی طرح شب کو نہیں سوتے ہیں
اس کے عشاق بھی شاہان خدا ہوتے ہیں

یہ عجب مرشد کامل ہے عجب ہے رہبر　　سرکشی کا نہیں کوچے میں کبھی اس کے گزر
اس کے پیرو جو ہیں آفاق میں وہ شام و سحر　　سجدۂ حق میں جھکائے ہوئے رکھتے ہیں سر

اپنے دورے میں نہیں سرکشی اس کو بھاتی
جام کے ساتھ صراحی نہیں آنے پاتی

پاک بازی میں یہ پہنچاتی ہے عشاق کا حال　　حور سے بھی نہ کسی پاک کا ہو دل میں خیال
قاف سے لاکھ پری تاک کے کرے غنج و دلال　　کھول کر آنکھ بھی دیکھیں نہ کبھی اس کا جمال

خوب رو ناز و ادا سامنے دن رات کریں
خواب میں بھی رغبت کی نہ یہ بات کریں

اس جفا جو سے کبھی دل کو لگائے نہ بشر　　اس کے سایہ کے تصور سے کرے دل میں حذر
اس کا دشمن کے بھی گھر میں نہ الٰہی ہو گزر　　زہر دیتی ہے یہ جس شخص پہ کرتی ہے اثر

مار رکھتی ہے محبت میں یہ ناگن کی طرح
دوستوں کا یہ لہو پیتی ہے دشمن کی طرح

اس کی چاہت کی پڑے گردن دل پیچ کمند　　ایک مشرب ہو ہم بے خرد و دانش مند
اس کا جلوہ ہے غضب آنکھوں کو کر دیتا ہے بند　　ہوش اڑا لیتی ہے یہ نکہت گیسوئے دو چند

کالے پانی کے مقید بھی رہا ہوتے ہیں
قید میں اس کے گرفتار فنا ہوتے ہیں

قہر ہے سحر ہے جادو ہے محبت اسکی　　گور جھنکواتی ہے انساں کو فرقت اسکی
ملک الموت زمانے میں ہے چاہت اسکی　　داغ لالے کو لگا دیتی ہے محبت اسکی

ایسے محبوب ستمگار سے اللہ بچائے!
اس ستمگار دل آزار سے اللہ بچائے

بد مزاجی کا کرے کیا کوئی اسکے بیاں　　زاہد خشک سے بھی بد ہے یہ بد بخت بسوا
اس سے پالا کہیں پڑ جائے تو دیکھے دریا　　خاک پانی میں ملا دے جو بندھے اسکی ہوا

اثر اس کا جو عیاں گردش افلاک سے ہو
سر کرۂ آب منتقل کرۂ خاک سے ہو

گرم جوشی جو کرے خواب میں بھی بیباک　　پیئے مثل لب عاشق یہ جسم غمناک
وعدۂ وصل جو مل جائے تو عاشق ہو ہلاک　　جان ایکر بھی نہ چھوڑے جو بڑھ جائے عتاب

اپنا جو دکھاتی ہے خورشید انداز کو
پھول گیسو کا بنا دیتی ہے گل نامی کو

اے جمیل اس کی جفا کی شکایت بیجا　　کیسے نادان ہو کیا کہتے ہو سوچو تو ذرا
کوئی معشوق ہے دشمن جو نہیں عاشق کا　　چمن حسن میں اگتی ہی نہیں بوٹے وفا

پھول ظاہر میں ہیں باطن میں مگر خار ہیں یہ
جتنے معشوق ہیں دنیا میں دل آزار ہیں یہ

اسی دور کے شعراء میں قاضی محمد صادق اختر کی نظم ہے ؎

قاضی محمد صادق خان اختر

کل رن کے شیخ مجتہد عصر ساقیا　　دکھلا کے سبز باغ ثواب و عتاب کا
کہنے لگا ز راہ تحیر مجھے بتنسر　　معلوم ہوگا حشر میں بیدنا شراب کا

میں نے کہا کہ میں بھی ہوں یہ خوب جانتا — پھر کیا کروں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں — لیکن نہ کیجئے مجھے مورد عتاب کا
تقویٰ ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست — اور ہو یقیں آپ کے اس اجتناب کا
مے اور کنج باغ ہو ساقی ہو در آغوش — کوئی وہاں مخل نہ ہو باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ کھینچ — یہ ریش جیسے جلوہ سپہر خضاب کا
کھینچے ہنسی ہنسی میں وہ منھ کو ملا کے منھ — دے ذائقہ زبان کو دہن کے لعاب کا
منت سے یہ کہے کہ ہمارا لہو پیجئے — گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا
اس وقت میں سلام کروں قبلہ آپ کو — گر کچھ بھی خوف کیجئے روز حساب کا
اور امتحان بغیر تو یہ آپ کا غلام — قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

دور دوم کے شعراء میں دلوی علی میاں کامل نے کئی نظمیں کہیں جن میں مرزا دوست کی بہت مقبول ہوئی۔

مزار دوست

شب کو جا نکلا تھا میں کامل مزار دوست پر — اسی جگہ مثل ابر آنکھیں مری خونبار ہیں
قبر پر الحمد پڑھ کر دوست سے میں نے کہا — ہم گریباں چاک ماتم میں ترے اے یار ہیں
ڈھونڈھتی ہیں تجھ کو آنکھیں جا بجا شام و سحر — شاہد اس دعوے کے رخ پر آنسوؤں کے تار ہیں
شاد ہے کچھ تو بھی زیر خاک اے نازک بدن — شمع روشن ہے گلوں کے قبر پہ انبار ہیں
کیا ہوا تیرے بعد نے راہی ملک عدم — لوگ کیسے ہیں وہاں کے اور کیا اطوار ہیں
منزلیں نزدیک ہیں یا دور ہیں کیا حال ہے — راہ میں کچھ بستیاں ہیں شہر میں بازار ہیں
جس محل میں جا کے تو اترا ہے اے رنگیں ادا — کس طرح کا قصر ہے کیسے در و دیوار ہیں
چھت ہے منقش ہے کہ سادی فرش رنگیں یا سفید — تخت کیسے ہیں منبت یا مرصع کار ہیں
سبز جلتے ہیں کنول یا سرخ روشن ہیں کنول — باغ ہے سبزہ ہے کچھ اشجار ہیں اثمار ہیں

پھول ہیں کس رنگ کے ہنستے ہیں کس انداز کے — مرغ زریں بال ہیں یا عنبریں منقار ہیں
اہل صحبت کون ہیں کیا گفتگو کا ہے طریق — خوش بیاں خوش طبع یا کج فہم و بد گفتار ہیں
لوگ ہمسایہ ہیں کیسے کس قسم کے کس وضع کے — کچھ مروت آنکھ میں ہے خلق کے آثار ہیں
دعوتیں بھیجیں فقط یا آپ بھی آئے کبھی — اپنے اپنے شغل میں سب ہیں یا بیکار ہیں
بات کرنے کی صدا اصلاً نہیں آتی کبھی — کس طرح کے لوگ ہیں سوتے ہیں یا بیدار ہیں
ملک کیسا ہے ہوائیں سرد چلتی ہیں کہ گرم — نہریں جاری ہیں چمن میں باغ ہیں گلزار ہیں
قافلے چلتے ہیں لٹنے کا تو اندیشہ نہیں — گرد کم اڑتی ہے راہیں صاف ہیں ہموار ہیں
کچھ صفت ان پری پیکر کی بتلائے کبھی — ان کے قد کیسے ہیں کیسے گیسوئے خم دار ہیں
شکلیں گوری گوری ہیں یا سانولی ہیں صورتیں — ابروئے خم کعبہ کی محراب یا تلوار ہیں
کس ڈھنگ کی ہیں ادائیں یا بنارس کے ہیں ناز — ہیکلیں سینوں پہ یا طوق کمر زنار ہیں
قبر سے آئی ندا اے دوست خاموش رہ — ہم اکیلے ہیں نہ یاں احباب نے اغیار ہیں
باغ کیسا پھول کیسے عقل ہے تیری کہاں — کنج تنہائی ہے اور افعی گلے کا ہار ہیں
وہ ہمارا پیکر نازک جو تجھ کو یاد ہو — آج خوراک قبر ہے اس پر موذی مار ہیں
دو فرشتے آتے ہیں مدفن میں ہیبت سے جب — اور ان کے ہاتھوں میں نکلے گرز آتش بار ہیں
شق ہوا اس کا کلیجہ وہ صدائیں قبر کی — جو لگے چوڑے سینہ و پہلو میں کہسار ہیں
تہ بہ تہ ہم کو بٹھایا ہے اٹھا کر قبر میں — رغبت سے ان کے ہمارے دست و پا بیکار ہیں
لوٹتے ہیں لاکھ ہم لیکن نہیں کھلتی زباں — جسم میں عشرہ ہے تیر غم جگر کے پار ہیں

اب زیادہ بات کر سکتے نہیں لے گھر کو جا
دل میں آزردہ نہ ہونا کیا کریں لاچار ہیں

دور سوم کے شعراء میں، مولانا علی حیدر نظم طباطبائی نے بڑی کامیاب نظمیں کہی ہیں اور وہ بہت مشہور ہیں انگریزی نظم کا ترجمہ بھی

انہوں نے کیا ہے اور خشتوں میں نظمیں بھی بہت کہی ہیں جن کا ذکر طوالت سے خالی نہیں اس لئے ہم اس کو ترک کرتے ہیں۔

دور چہارم کے شعرا میں سب ہی نے نظمیں کہی ہیں پہلے چکبست کی نظم سنئے۔

سیر دیرہ دون

نہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگون
عجیب خطہ دلکش ہے سیر دیرہ دون

نگاہ شوق نے کیا کہئے کیا سماں دیکھا
نئی زمیں نیا رنگ آسماں دیکھا

سنا جو کرتے تھے وہ باغ پر فضا ہے یہی
اگر بہشت میں جنت تو راستہ ہے یہی

ازل میں بھی جو تصور اس کا یادگار ہے یہ
نشیب کوہ میں گہوارۂ بہار ہے یہ

کیا نہیں اسے غارت بشر کی صنعت نے
یہ سبزہ زار سجایا ہے دست قدرت نے

سپرد ابر کے ہے انتظام پانی کا
ہوائے سرد کو ہے حکم باغبانی کا

تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف ہے ہریالی

لباس پہنے ہیں کل خشت و سنگ سبزہ کا
بجائے خاک کے اڑتا ہے رنگ سبزہ کا

اثر خزاں کا ہو کیا تازگی کے مسکن میں
پہاڑ اس کو چھپائے ہیں اپنے دامن میں

گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب
لطیف و سرد ہوا پاک و صاف چشمۂ آب

کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں
ٹھہر گئی ہے بہار آکے اس گلستاں میں

طلسم حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ
کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ

یہاں جو آکے مسافر قیام کرتے ہیں
یہ سنتری انہیں پہلے سلام کرتے ہیں

جو دور جائیے بستی سے اور ہی ہے سماں
یہ سوچتا ہے پہاڑوں کو دیکھ کر انساں

بشر پہ رعب یہ قدرت کا چھا گیا کیسا
یہ بل زمیں کی تیوری پہ آگیا کیسا !

بلندیوں سے جو ہو مائل نشیب نظر
فریب دیتا ہے ندی کا پیچ و خم اکثر

نگہ کو دور سے پانی جو ہے نظر آتا !
سفید ناگ چلا آ رہا ہے بل کھاتا

قریب بیٹھا ہے آخر یہ دور کا عالم
نگاہ دیکھتی ہے پھر سرور کا عالم

فضائے کوہ میں ایسی ہو سمائی ہے
بشر کی روح کو راحت کی نیند آئی ہے

بس ایک عالم ہو چار سمت طاری ہے
نہ شور و شر ہے نہ دنیا کی آہ و زاری ہے

اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمہ دلگیر
شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر

یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اثر نہیں
یہ صرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں

وہی سنے گا اسے دل گداز ہے جس کا
ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہے اس کا

یہ راگ مجھ میں سمایا سرور سے ہو کر
ہوس یہی تھی روح کو مل جائے اسمیں سے ہو کر

حریم خاص میں قدرت کی باریابی تھی
نگاہ شوق میں اک شان بے حجابی تھی

نشست سنگ پہ تھی سایہ شجر کے تلے
رواں تھا چشمہ آب خنک نظر کے تلے

شریک حال تھی وضع قدیم قدرت کی
عیاں تھی سنگ و شجر سے کشش محبت کی

شراب حسن حقیقی سے تھا ہر اک سرشار
شجر تھا کوہ تھا چشمہ تھا یا یہ مشت غبار

درخت و کوہ ہیں کیا ذات پاک انساں کیا
ظہور کیا انہیں ہوا کیا ہے ابر و باراں کیا

یہ دل کے ٹکڑے ہیں قدرت کے آئینے ہیں
سب ایک گود کے پالے ہیں کوئی غیر نہیں

انھیں سے نغمہ قدرت ہے روح دوستی میں
سب ایک ساز کے پردے ہیں بزم ہستی میں

جدا کسی سے بھی ہستی کا اپنی راز نہیں
کچھ آبشار میں اور ہم میں امتیاز نہیں

ہے جسم خاک نہاں اس کا جسم پانی ہے
جو روح ہم میں ہے ان میں وہی روانی ہے

اسی خیال میں طبع لطیف تھی سرشار
کچھ ایسی بے خبری تھی کہ ہوش اس پہ نثار

دل اپنے رنگ میں بیتاب تھا اس ارماں سے
کہ اس فضا میں ہو آزاد روح انساں سے

اجل جو آئے تو اس کوہسار کے نیچے
بنے مزار کسی آبشار کے نیچے

مولانا صفی

دریائے گنگا کے کنارے شیعہ کانفرنس کا اجلاس

صبح بنارس

ہے لب دریائے گنگا کی بہار آئی ہوئی — کوثر اشارہ کی ہر سو چھاؤنی چھائی ہوئی
ہر طبیعت حسن منظر پہ گھبرائی ہوئی — لب پہ اک موج تبسم آنکھ شرمائی ہوئی
ڈوب کر کیونکر نکلتے ہیں ستارے دیکھ لو
یہ تماشا آؤ گنگا کے کنارے دیکھ لو

روئے گنگا جبیں شستی دوش کا جو تعبیر ہے — خط قوسی میں سر جدول تھا تحریر ہے
پل ہلال عید گنگا صاف ہے جوئے شیر ہے — یا بتوں کے ابروئے پیوستہ کی تصویر ہے
آسماں تھا فتنہ بازی میں جو مشہور جہاں
سر زمین حسن نے کھینچی ہے غمزہ کی کماں

ہے حصار عافیت کی پشتیاں اس پل کی نیو — سینہ تانے یا ہے بیتاب آرزو کوئی دیو
پیکر کاشی پہ ہے کیا خوشنما ازبینو — ہے کہیں سر پر لب گنگا کہیں
سنیاسی سانڈ راندین گھاٹ پر کی چوکیاں
آفت جاں دشمن جاں دین میں سب الا

ہے ہلال خط میں آبادی بنارس کی تمام — گھاٹ مندر سب لب دریا کس انتظام
ناؤ پہ چڑھ کر انہیں دیکھو جو نامی ہیں مقام — ماہرولوں کا ملے گا ہر جگہ پہ اژدہام
صدقے اپنی گل زمیں پر ہو گلستاں کی بہار
آگ پانی میں لگاتی ہے چراغاں کی بہار

چشم بد دور رات بنارس کیا ہی بانکا شہر ہے — ہر ادا بیہوشی حسینوں کی یہاں کی قہر ہے
عزت کشمیر ہے یہ انتخاب دہر ہے — ہر گلی کوچے میں جاری حسن کی اک نہر ہے

صاف ہیں شفاف ہیں کیسے یہاں بتکدے
رہتے ہیں ہر دم دلہن کی طرح پھولوں سے لدے

وہ دھندلکا صبح کا وہ دور تک گنگا کا پاٹ — وہ گنگنانا ہے رونمایاں جابجا پانی کی کاٹ
وہ پریزادوں کے جھمگھٹ سے رستاراج گھاٹ — دل بدل جائے جوان کی طبیعت ہو اچاٹ
اتریں پانی میں جو ہر دم صبح کا معمول ہے
ہر حسین نازک بدن گویا کنول کا پھول ہے

دیکھ لو آب رواں میں حسن دلکش کی بہار — صاف سینوں سے جوانی کی امنگیں آشکار
جال پھیلائے ہوئے پانی پہ زلف تابدار — بال کا باندھا چلا آتا ہے جسمیں خود شکار
جھوم کے اٹھی جہاں گھنگھور متوالی گھٹا !
دیکھنا برسائے گی موتی سی یہ کالی گھٹا

حسن کا شیوہ ہے اسی پردہ میں کھنڈی گرمیاں — کوندتی ہیں ابر کے اندر ہی اندر بجلیاں
ضو فشاں سورج ہے لیکن ہٹ گیا بازو جہاں — خود کہے گی طاقت نظارہ ہو کیا امتحاں
جامہ زیبی ہے دوبالا شان محبوبی ہوئی
سارا پاتوس قزح کے رنگ میں ڈوبی ہوئی

زعفرانی ہر کسی ماتھے پہ ٹیکا صندلی — دل سی نازک تر لئے ہاتھوں میں اک گنگا جلی
لب ہلوں موج تبسم جیسے کھلتی ہو کلی — دل جہاں پھسلا تو بہ سے نکلا یا علی
جب لڑیں باہم نگاہیں کافر و دیندار کی
کان میں آئی صدا یا قوس استغفار کی

ہے غدیر خم کے متوالوں کا گنگا پر جماؤ — محتسب کا زور چلتا ہے نہ قاضی کا دباؤ
دھن یہی ہو تم سے کاٹو نہر گنگا میں گراؤ — حشر تک اے نہ ہوش اتنی سوا اتنی پلاؤ
جھومتے نکلو بنارس میں جدھر بھی سیر کو
چھیڑ کر کلمہ پڑھاؤ ان بتاں دل کو

لکھنو کی ایک برسات

گھر کی رہنے والیوں کو زندگانی تھی عذاب
گھر سے جب نکلیں ردائیں اوڑھ کر مثلِ حباب

سر پہ بارش گود میں بچے کمر تک جوئے آب
پاؤں بالائے زمیں ورد زباں یا بو تراب!

کس قدر پانی کہاں ہے کچھ پتا چلتا نہیں
قسمتوں کا پھیر دیکھو راستہ ملتا نہیں

مولانا صفی نے ایک قومی ترانہ بھی کہا ہے جو بڑا زوردار ہے اس کے بعض اشعار دوسروں کے نام سے مشہور ہیں اس لئے ہم اس نظم کو پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اسلامی ترانہ

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دیں گے
مشرق کا سرا اٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے

دھارے میں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہیں
بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے

ہم سینۂ ہستی میں انگارہ ہیں انگارہ
شعلے بھڑک اٹھیں گے جو ہم کو ہوا دیں گے

ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں لیکن
وقت آنے دو وقت آنے پھر تم کو بتا دیں گے

دنیا کے سمندر میں ہم جزر بھی ہیں مد بھی
دیکھو جو ہمیں روکا طوفان اٹھا دیں گے

ایران ہو یا ٹرکی دونوں کو مٹا دیکھیں
کیا صفحۂ ہستی سے اسلام مٹا دیں گے

اس دین کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں
یہ صور جہاں پھونکا مردوں کو جلا دیں گے

آئے جذبۂ اسلامی جس دل میں نہ ہو گا
یہ نظم صفی پڑھ کر ہم اس کو سنا دیں گے

برسات کی شام!

شوق قدوائی

دن ہے کم دیکھو بڑھا مغرب سے وہ ابر سیاہ!
کھل گئی دنیا میں آنے کیلئے کرنوں کی راہ

بن گیا خورشید ہلکے رنگ کے سونے کا طشت
دھوپ کچھ کچھ سنہری ہو گئے اشجار و دشت

وہ شفق کی سرخ رنگت اور فلک کا مرغزار
سادگی پھولی ہوئی گویا دکھاتی ہے بہار

کوہ کے دامن میں یا لالے کا تختہ ہے عیاں
یا جسے کہتے ہیں آج اک کوہ آتش فشاں

جلوہ گر ہے چرخ پر سورج کے پرتو سے دھنک
یا اُدھر ہے وہ کھلی محراب ایوانِ فلک

یا کسی کے واسطے کھولے ہے آغوش آسماں
یا لئے ہے دوش پر ترکِ فلک اپنی کماں

دستکاری اپنی کی معمارِ قدرت نے عیاں
سات رنگوں سے رنگا ہے طاقِ قصرِ آسماں

فوارہ

عزیز لکھنوی

میرے فوارے عجب دلچسپ ہے تیرا سماں
یہ تری لہریں رواں اور یہ ترا جوشِ نہاں

رات دن سانچے میں وہ موتی پرو کر ڈھالنا
پھر نشانِ باغِ رضواں پر وہ ڈورے ڈالنا

گوہر افشانی تری اور ہلکی ہلکی وہ پھوار
وہ شباب بلبل و گل اور وہ تیرا نکھار

وہ اکڑ کر دیکھنا اپنی جوانی کی بہار
وہ ترا انگڑائیاں لینا چمن میں بار بار

مضطرب موج ہوا ہے تو بہت بیتاب ہے
تیری دھاریں جھومتی ہیں یا کہ نخلِ آب ہے

تو چمن کی روح ہے اور ہے فضا میں تیرا دور
اک بہار شادمانی ہے ہوا میں تیرا دور

شاعر آتے ہیں ترے دامن میں پر پھیلائے ہو
عاشقِ شوریدہ سر بیٹھے ہیں کھولے ہوئے

تیرے دستِ گوہر افشاں کی یہ حالت دیکھ کر
جھولیاں گلشن نے پھیلا دیں سخاوت دیکھ کر

گوندھنا موج ہوا پر موتیوں کے ہار کا
تیرے سر سہرا رہا ہے رونقِ گلزار کا

تیز ہو ہاں تیرے فوارے ذرا پھر تیز ہو ۔ پھر جواہر خیز و گوہر بیز و گوہر ریز ہو
آتشِ گل کا جہاں کچھ بھی اشارا ہو گیا ۔ اُڑ گیا موجِ ہوا پر یوں کہ پارا ہو گیا
تیرا جو قطرہ گیا گردوں پہ تارا ہو گیا ۔ جب گرا آ کر زمیں پر دل ہمارا ہو گیا
سب غبارِ خاطرِ ناشاد تجھ سے دُھل گیا ۔ تیرا منظر اک طلسمِ دلفریبی ہو گیا

مرزا جعفر علی خاں اثر کی ایک نظم کشمیر پر ہے جس کا یہ ایک شعر مجھے یاد ہے۔ پوری نظم مل نہ سکی اس لئے ایک ہی شعر پر اکتفا کیجیے ؎

اُڑتا ہوا غول تتلیوں کا ۔ یا قوسِ قزح سے رنگ برسا

آخر میں جوش صاحب کی نظم برکھا رُت ملاحظہ کیجیے دنیا کی کسی زبان میں اس کا جواب نہیں جن ملکوں میں بارش نہیں ہوتی ان سے تو اس کی توقع ہی بیکار ہے ہاں برصغیر برسات کی جولانگاہ خاص طور پر ہے یہاں بحرِ عرب اور خلیج بنگال دونوں اُڑا اُڑا کے برستے ہیں اور یہاں کی زمین ہری ہو جاتی ہے وہیں برسات پر نظموں کی اُمید کی جا سکتی ہے اور وہی سرزمین علم و فضل اور شعر و سخن کی سرزمین ہے مگر تعجب ہے کہ ہندی اور سنسکرت میں بھی ایسی کوئی نظم نہیں معلوم ہوتی جس کو جوش صاحب کی نظم کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا۔

فارسی کے شعراء جو ہندوستان آئے انھوں نے برسات پر نظمیں کہی ہیں مگر جوش کا سا خروش کہاں اُردو میں آزاد و حالی کی برکھا رُت نے تو شاعری کا منہ چڑھایا ہے بعض بے عقل اور شعر ناشناس جوش صاحب کو الفاظ کا بازی گر کہتے ہیں جی تو یہی چاہتا ہے کہ پہلے اس پر بحث کی جائے کہ الفاظ بازی گر کے کیا معنی ہیں اور جوش کی شاعری پر یہ قول منطبق ہوتا ہے یا نہیں بہر حال اب جوش صاحب کی نظم سنیے افسوس کہ اس نظم پر جوش صاحب نے نظرِ ثانی کر کے کچھ کا کچھ کر دیا میں نے کئی دفعہ وہ نظم مانگی مگر وہ تو شاہی مزاج رکھتے ہیں۔ مختصر یہ وہ نظرِ ثانی شدہ نظم نہ بھیج سکے اس لئے وہ نظم پیش کرتا ہوں۔

آہا آہا برکھا آئی

بدلی آئی بدلی آئی !! ۔ بدلی آئی بدلی چھائی
بدلی چھائی اور لہرائی ۔ جھر جھر برسی گھڑ گھڑ گائی

آہا آہا برکھا آئی

میلے ریلے تال کنارے ۔ بوڑھے بچے لت پت سارے
دھوم دھڑکا ندیا نالے ۔ چڑھتے دریا بڑھتے دھارے

گرتی بوندیں چھٹی کائی

بادل کالے نیلے دھانی ۔ ساری دھرتی ہے جل دانی
پانی پانی پانی پانی ! ۔ گلیاں کوچے کھیت اور نگری

آہا آہا برکھا آئی

پانی آیا چھم چھم چھم چھم ! ۔ کالے جھنڈے نیلے پرچم
پریاں اُتریں چھم چھم چھم چھم ۔ چھم چھم بولی بالم بالم

پانی اشا بھر گدرائی

اُڑتے مڑتے بوجھل گالے ۔ اودے اودے کالے کالے
ہا ہا کرتے ندی نالے ۔ تڑ تڑ تڑ تڑ سب نالے

سن سن سن سن سن پروائی

بیچ چھومے بن لہرائے ۔ پر بت بولے پنچھی گائے

مچلے بادل ناچے سائے   راتیں ڈوبیں دن گھبرائے
نالے بھر کے ندی گائی

کریں لچکیں شوخی دمکی   مدرا چھلکی بوتل چھنکی
طبلہ ٹھمکا چھاتی کمکی   ادھو ادھو بجلی چمکی
جیسے جنگل کی انگڑائی

دل میں کچھ ٹیلے کی کوئل   ندی نالے سارے جل تھل
مکھڑے جیسے جھل جھل   تان اڑاتی جنگل جنگل
کانٹے بھونرے کی بدنامی

بھرنے نکلی گھر سے چھوری   گال اچھوتے باہیں گوری
آنکھیں اٹھتیں چوسی چوری   آگے آگے الھڑ گوری
پیچھے پیچھے چپا تم دائی

بیٹھا کیوں ہے سر کھجلاتا !   اٹھ اور سر پہ لیکر جھاتا
تان اڑاتا بین بجاتا   ہنستا گاتا شور مچاتا
مدرا پیئے چل دے بھائی

سینہ ابھارے ندی ندی   بازو کھوئے نیچی نیچی
دور تلک ہے پانی پانی   در در آئی جمنا دلوی
گھر گھر پہنچی گنگا مائی

پانی مرتا دیواروں میں   گھٹنوں گھٹنوں بازاروں میں
گھمتا چکراتا غاروں میں   اور منہ کے اڑتے تاروں میں
لیا ڈگی پاتا پائی

جوبن ابھرا ہر جیوتن میں   ساون گونجا سب کے تن میں

رادھا ناچیں الھڑ پن میں !   مدرا چھیلی کوکل بن میں !!
شیام نے کیسی بین بجائی

طبلہ سارنگی اکتارا   نوبت بین نقارا !
ڈھولک ڈفلی جھانجھ مجیرا   کوئل دادر مور پپیہا
دائرہ پر نبطا نے شنائی

سن کر اپنے پی کی آون   بولی بدھی لاڈے آون
مہندی بیسی زن زن زن   چوڑیاں بولیں کھن کھن
اسی کا پی کو گرمائی

سر کی لہریں لے کے دھالے   گوری دھری لاج کے مارے
توڑا جیسے ٹوٹیں تارے   سارے گاما گاما سارے
پائل جھنکی مستی چھائی

مدرا پی کر گانا گایا   من میں کالا بادل چھایا
ہلکا ہلکا مرجھایا   سایہ دیپک دیپک آیا
تالو دھمکا دھن چکرائی

جلدی سکھیو لاؤ جھومر   ہلکی چھاگل بھاری چادر
دوڑو آیا پانی سر پہ   لے دیکھو وہ ڈولی تیر
بیت نگر سے آیا نائی

اچھلیں من میں لے کی ڈھالیں   اڑتی ترچھی آئیں بوچھاڑیں
ناچیں چھم چھم گوری ناریں   تاریکا سے اتریں ابریں
دھرتی چھبیلی رت بولائی

شر شر پانی ہوں ہوں جھکڑ   چھپر ٹپ ٹپ نالے دھڑ دھڑ
بدلی گھم گھم بجلی کڑ کڑ   جھم جھم سر در تر در
دھرتی بولی رام دہائی

ہجو

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ ناسخ نے ہجو کی جڑ کاٹ دی اور ان کے تمام مصنفین نے اپنی کتابوں میں یہی لکھا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔

مولانا آزاد سے یہ غلطی اس وجہ سے ہوئی کہ ان کی نظر میں ضاحک و سودا کی ہجویں تھیں جن میں بھڑوے اور دھی۔کے۔۔۔ ۔۔۔۔ تک موجود ہے۔

اسی طرح کی مصحفی و انشا کی ہجویں ہیں لکھنؤ کی تہذیب اس کو برداشت نہیں کر سکتی وہاں کی ہجو میں شاعرانہ لطافت کے ساتھ تہذیب و شائستگی ہے۔

لکھنؤ میں ہجو میر ضمیر سے شروع ہوئی وہ توین بیع الاول عمر و سودا کی ہجو پڑھتے اور اس کا نام انھوں نے ہرثیہ رکھا۔ افسوس ہے کہ وہ ہجویں مجھے نہیں ملیں۔

ناسخ و آتش کے زمانہ میں بھی ہجو کی گئی امام بخش ناسخ نے اپنے نام کی مناسبت ایک غزل میں یہ مقطع کہا ؎

جو خاص ہیں وہ شریک گروہ عام نہیں !

شمار دانہ تسبیح میں امام نہیں !!

آتش نے وہیں اس کا جواب کہا ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں !
ہمارے گنجفہ میں بازی غلام نہیں !

ناسخ کے شاگرد و خواجہ وزیر نے اس کے جواب میں کہا ؎

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

یہ ایک سلسلہ ہے جو اب تک چلا آرہا ہے ہمارے زمانہ میں خوب خوب ہجو بن گئیں ان کا لطف زیادہ ہو جاتا اگر اُن اشخاص کے نام لکھ دیئے جاتے جن کی ہجو کی گئی مگر یہ بات بہت سے افراد کو ناگوار ہوتی اس لیے بغیر کسی کا نام بتائے ہوئے ہجو پڑھیے اور خود ان اشخاص پر منطبق کیجئے یہ نظمیں شیعہ کانفرنس سے ارکان سے متعلق ہیں۔

مقبول حسین ظریف

دفتر قومی پریشاں ہو تو اسکی قدر کیا ۔۔۔ ہے جو فاضل الیبن نتھی افراد قوم
اس جگہ ہر مداوا جمع ہیں قومی طبیب ۔۔۔ جو فقط لیمو لگا کر مس بھگا دے داد قوم
قوم کا ہر روپیا بھی ہے نمائش گاہ میں ۔۔۔ باٹ اس کا ہر تفریح دل ناشاد قوم
سر پہ دستار فضیلت پاؤں میں ڈاسن کا بوٹ ۔۔۔ نیچے جنٹلمین اوپر صورت زہاد قوم

دین کا دلال آدھا اہلِ دُنیا کا ایجنٹ
مولوی بھی ماسٹر بھی واہ اے استاد قوم

کعبہ کالج کی جانب توڑ کر اپنی نکیل
بلبلاتا آ رہا ہے اشترِ بغداد قوم

ایک قومی تیند وا بھی اس کے گھر میں ہیں بند
جس کا رمنہ ترانی مربع آباد قوم

قومی اک بھالو علی بابا جسے کہتے ہیں لوگ
وہ گرو چالیس قزاقوں کا اور استاد قوم

قومی اک بندر بھی اس کا ندہ تاج گھر میں ہے
جو کہ ناداں دوست ہے کرتا ہے گر امداد قوم

ہے اسی جلسہ میں قومی ایک خرگوش سفید
گھونس بن کر کھودتا رہتا ہے جو بنیاد قوم

ابنائے وطن

سپوتو! مادرِ ہندوستان کے واہ کیا کہنا
نہ وضع خاندانی ہے نہ مذہب ہے نہ ملت ہے
سیہ چہرے پہ ہلٹ یا کہ گوبر پر گگرمتّا
فقط اغیار کی تقلید میں اب تو یہ صورت ہے
تمازت سے سیاہی اور چہرے کی نہ بڑھ جائے
کہیں کالے نہ کہلائیں فقط اس کی حفاظت ہے
یہاں تک رفتہ رفتہ بڑھ گیا ہے خبط فیشن کا
نہ ڈاڑھی کی بزرگی ہے نہ کچھ مونچھوں کی عظمت ہے
جو اِک ٹیکا لگائے مونچھ کا ہیں ناک کے نیچے
مرید حضرت ہیوٹ ہیں فیشن سے عقیدت ہے

البعیر

ناقۂ لیلیٰ کے بچے اے بعیرِ ذی وقار
تیرے چہرے سے نمایاں اک شرارت کی شبیہ
تیری آنکھیں بحرِ عیاری کے گویا دو حباب
اہلِ حیا سے زیادہ تیرے ہونٹوں کی گرفت
دانت تیرے پیچ موذی ہے بڑھ کر ستمگر
گیا دوستی جھاڑتا ہے مظلوموں کو لاد کر
اپنی گردن پیٹھ پر لادے ہوئے قومی حقوق
زینت گردن تری کل قوم کی لعنت کا طوق
دیکھنے میں کس قدر سیدھا ہے تو اے زرداد
قوم کو باہم لڑا میں تیری ذات فرد
بیٹھ تیرا قوم کی گاڑھی کمائی کے لئے
تو جو امرود کا کانٹا بے تکلف چر گیا
بلبلاتا ہے شتر خانہ میں بیٹھا کیسا تھ
کوئی آیا ہے سہارنپور سے لیکر دوا
اور کوئی خاک شفا تجھ کو چٹانے کے لئے
کوئی حاجی نیم کی ٹہنی ہلا کر دور سے
اور کوئی کھینچا ہے آیا ہے گھبرا یا ہوا
کوئی کہتا ہے کہ اس کو بحر کر جنتا پلئے

قوم تیرے استبداد کی دم پہ نثار
خود بنائی جس کا شکوہ سرکشی جس کا شعار
کان جس میں کلمۂ حق کی صدائیں ناگوار
پنجۂ دست قضا کے مثل وقت گیر و دار
ناک میں تیری نکیل ہے کو شریعت کی مہار
قطر تا سر کش ہے تو لیکن بظاہر بردبار
کتنے اطمینان سے چلتا ہے تو مستانہ وار
اس سے ظاہر ہے کہ تو نے کھو دیا سب اعتبار
کج روی سیکھا ہے تجھ سے اونٹ لیل و نہار
میرے قومی اونٹ اے جنگِ جمل کی یادگار
وقف ہے کھا کر نہیں لیتا کبھی تو اک ڈکار
قومی معدہ میں چھپا تیرے وہی انجام کار
گرد تیرے جمع بیسوں ساربان غمگسار
تیل ریڈی کا پلانے منہ کے اندر دے کے ہار
چیکے چیکے پڑھ رہا ہے کچھ دعائیں لیلیٰ
کہہ رہا ہے کھا بھی جا نہ کر اے بد شعار
مال و زر اپنا مدد آئیں کرنے نثار
عید قرباں کو جیسن آباد میں بیچا کے یار